خواتین ڈائجسٹ
جنوری 2021
www.pklibrary.com

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — نادرہ خاتون

مدیر — آذر ریاض

نائب مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی — امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات — عدنان

اشتہارات — خالدہ جیلانی

قانونی مشیر — نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

واٹس اپ
0317 2266944

بیادِ انشاء جی

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملئے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

افسانے

نظمیں غزلیں

جنوری 2021

جلد 48 شمارہ 9

قیمت 70 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... 840/- روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ .... 18,000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ـ 20,500 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ جنوری سنہ 2021ء کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
نئے سال کا پہلا شمارہ۔

وقت 2021ء کے طلوع ہونے کی نوید دے رہا ہے۔ لاکھ کہیں کہ نئے سال میں نیا پن کیا ہے۔ وہی روز و شب وہی بارہ مہینے۔ پھر بھی ہر نئے سال کی آمد پر کچھ خوش کن توقعات اس سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ دل میں امید کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور ہم سوچتے ہیں کہ شاید یہ سال ہمارے لیے سحر کا پیغام لے کر آئے۔ ظلم اور جبر کا یہ موسم بدلے اور برسوں سے مسلط اس تاریکی کا اختتام ہو۔

نئے سال کے آغاز اور پچھلے سال کو الوداع کہتے ہوئے گزرے سال کے لمحات، واقعات، یادوں کے منظر پر جھلملاتے ہیں۔

نئے سال کے لیے ارادے باندھے جاتے ہیں۔
کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ماضی اور مستقبل پر نظر تو رکھیں لیکن پوری توجہ حال پر رکھیں کیونکہ ہمارے ہاتھ میں جو لمحہ ہے اسی پر ماضی اور مستقبل کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔
سال گزشتہ دنیا سے جو کچھ لے گیا، اس نقصان کی تلافی تو شاید آنے والے کئی سالوں میں نہ ہو سکے۔ ہمارے ہاں تو مہنگائی اور بے روزگاری پہلے ہی کم نہ تھی۔ کورونا نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ بہرکیف خوشی کی کچھ کرنیں اور دکھ کے سائے دے کر جیسے بھی بیتا—— سال بیت گیا۔
بہت ساری دعاؤں اور روشن امیدوں کے ساتھ نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔
قارئین کو نیا سال مبارک۔
دعا ہے کہ اس سال آپ سب کو اپنے حصے کی خوشیاں حاصل ہوں۔ آپ کو آپ کے نیک ارادوں اور مقاصد میں کامیابی ہو۔ وطنِ عزیز میں امن، خوشی اور خوش حالی کا راج ہو۔ آمین۔

انشاجی:

انشاجی کو دنیا سے رخصت ہوئے چار عشروں سے زائد وقت گزر چکا ہے۔ ان کے کالم پڑھیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے انشاجی نے آج ہی لکھے ہیں۔ وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔
زندگی سے بھرپور ہنسنے ہنسانے والے انشاجی کی زندگی بھی عجیب دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے۔ ان کے مزاج میں جو شگفتگی، برجستگی تھی، وہ ان کے کالموں میں نظر آتی ہے۔ جو نرمی، محبت اور گداز ان کی طبیعت میں تھا، وہ ان کے گیتوں اور شاعری میں جھلکتا ہے۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ منفرد مزاح نگار تھے، بہت پیارے شاعر تھے، بہترین سفرنامہ نگار تھے، بہت اچھے مترجم تھے، یا بہت پیارے انسان تھے۔ خوشیاں بانٹنے والے، محبت کرنے والے زندگی اور زندہ دلی سے چھلکتے ہوئے۔
احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے۔
"انشاجی کی جب بھی برسی منائی جاتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود زندگی کی برسی منا رہے ہوں۔"

11 جنوری انشاجی کا یومِ وفات ہے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- میں تم سے نہ پوچھوں ۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول، ، اک خواب تھا کوئی ۔ نازیہ رزاق کا مکمل ناول،
- رقصِ شرر ۔ فائزہ ثمرین کا ناول، ، راحت جبیں، عفت سحر طاہر اور نمرہ احمد کے ناول،
- حمیرا شفیع، ریحانہ چوہدری، مومنہ ریاض اور نصرت یوسف کے افسانے،
- باصلاحیت اینکر عصمہ زہرا سے ملاقات، ، معروف فنکار رشید عالم سے باتیں،
- روشن لمحے ۔ خوف کے سائے ۔ قارئین سے سروے، ، کرن کرن روشنی ۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔
قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

اخلاص اور حسن نیت

امیر المومنین ابو حفص عمر بن خطاب سے روایت ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔
"عملوں کا دارومدار نیتوں ہی پر ہے۔ ہر شخص کو اس کی (اچھی یا بری) نیت کے مطابق (اچھا یا برا) بدلہ ملے گا۔ چنانچہ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی، اس کی ہجرت ان ہی کی طرف سمجھی جائے گی اور جس نے دنیا حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کی غرض سے ہجرت کی تو اس کی ہجرت ان ہی مقاصد کے لیے ہوگی۔" اس روایت کی صحت متفقہ ہے۔ (صحیح بخاری)

فوائد مسائل:

1۔ بعض روایات میں اس حدیث کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے ام قیس نامی عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ اس نے اس وقت تک نکاح کرنے سے انکار کر دیا جب تک وہ ہجرت نہ کرے۔ چنانچہ اس نے اس کی اس شرط کی وجہ سے ہجرت کر لی اور وہاں جا کر دونوں کا باہم نکاح ہو گیا۔ اس وجہ سے صحابہ میں اس کا نام ہی مہاجر ام قیس مشہور ہو گیا۔

2۔ اس حدیث کی بنیاد پر علماء کا اتفاق ہے کہ اعمال میں نیت ضروری ہے اور نیت کے مطابق ہی اجر ملے گا، تاہم نیت کا محل دل ہے، یعنی دل میں نیت کرنا ضروری ہے۔ زبان سے اس کا اظہار ضروری نہیں۔ زبان کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔

جیسے نماز پڑھتے وقت پاک و ہند میں زبان سے نیت کے اظہار کا عام رواج ہے جو کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے اور دین میں اضافہ ہے تاہم حج کا تلبیہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

3۔ ہر کام کے لیے اخلاص ضروری ہے، یعنی ہر نیک عمل میں صرف اللہ کی رضا پیش نظر ہو۔ اگر کسی نیک عمل میں اخلاص کے بجائے کسی اور جذبے کی آمیزش ہو جائے گی تو عنداللہ وہ عمل مقبول نہیں ہو گا۔ اسی طرح قبولیت عمل کے لیے اخلاص کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہو۔

نیت کے مطابق اجر

ام المومنین ام عبداللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ایک لشکر خانہ کعبہ پر چڑھائی کرنے کی نیت سے نکلے گا، جب وہ بیداء (کسی چٹیل میدان) میں پہنچے گا تو اس کے اول و آخر (سب کے سب) زمین میں دھنسا دیے جائیں گے۔"
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔"میں نے پوچھا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ان کے اول و آخر، یعنی سب کو کیسے دھنسا دیا جائے گا جب کہ ان میں بازاری لوگ ہوں گے (یعنی حکام کے علاوہ تمام افراد، یا منڈی کے لوگ اور مطلب ہے کہ وہ جنگجو نہیں ہوں گے) اور وہ بھی ہوں گے جو ان میں سے نہیں ہوں گے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ان کے اول آخر سب دھنسا دیے جائیں گے پھر وہ اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے (یعنی قیامت والے دن ان سے معاملہ ان کی نیتوں کے مطابق کیا جائے گا)۔"
(بخاری و مسلم۔ الفاظ بخاری کے ہیں)

فوائد و مسائل:

1۔ انسان کے ساتھ روز قیامت اچھا یا برا معاملہ اس کے قصد و ارادے کے مطابق کیا جائے گا۔

2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ظلم و فجور کے مرتکبین کی ہم نشینی نہایت خطرناک ہے۔

3۔ یہ کون سا لشکر ہے اور اس کا وقوع کب ہوگا؟ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ پیش گوئیاں امور غیب سے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہیں، جن کے وقوع اور صداقت پر ایمان رکھنا ضروری ہے، اس لیے کہ اس قسم کی پیش گوئیاں وحی الٰہی پر مبنی ہیں۔

4۔ اس سے بیت اللہ کی عزت و حرمت کا بھی پتا چلتا ہے کہ وہاں فساد برپا کرنا کس قدر شدید جرم ہے۔

جہاد اور نیت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"فتح کے بعد ہجرت نہیں، البتہ جہاد اور نیت باقی ہیں۔ جب تمہیں جہاد پر نکلنے کے لیے طلب کیا جائے تو (بلا تامل) نکل پڑو۔" (بخاری و مسلم)
اس کا مطلب ہے "مکہ فتح ہو جانے کے بعد (جو 8 ہجری میں ہوا) مکے سے ہجرت کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ وہ دارالاسلام بن گیا ہے۔

فوائد و مسائل:

1۔ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد کچھ لوگوں نے مکہ سے ثواب کی غرض سے ہجرت کرنے کی اجازت طلب کی اور ہجرت کا ثواب یہ ہے کہ اس سے سابقہ تمام گناہ مٹ جاتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب یہاں سے ہجرت کی ضرورت نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے ثواب کا سلسلہ منقطع نہیں کیا۔ اگر کوئی شخص یہی ثواب لینا چاہتا ہے تو وہ حسن نیت سے یعنی اگر ضرورت پڑی تو ہجرت کروں گا، اور جہاد کر کے یہ ثواب حاصل کر سکتا ہے۔

2۔ جب کوئی ملک یا علاقہ دارالسلام قرار پا جائے تو وہاں سے کسی اور علاقے کی طرف ہجرت کرنا ضروری نہیں، البتہ وہ علاقے جو دارالکفر ہیں وہاں دین پر عمل کرنا یا اس پر قائم رہنا مشکل ہے تو ایسے علاقوں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔

3۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی اسلامی ملک سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں ہجرت کر کے جانا ضروری نہیں ہے تو پھر ایک اسلامی ملک کو چھوڑ کر بلاد کفر میں جا کر اس لیے مستقل رہائش اختیار کرنا کہ وہاں دولت کی ریل پیل اور تمدنی سہولتوں کی فراوانی ہے، شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے، جس میں بدقسمتی سے اس زمانے کے مسلمان مبتلا ہیں۔ بالخصوص ان کے سرمائے کا انتقال اور مفکرین کی ہجرت بہت ہی تشویش ناک ہے جس سے بلاد کفر کی معیشت کو بھی سہارا مل رہا ہے اور ان کی حیا باختہ تہذیب کو فروغ

دعروج بھی۔ علاوہ ازیں ایک مسلمان کے دل میں جہاد کا جذبہ اور ارادہ موجود رہنا چاہیے اور اس کے لیے ہر ممکن تیاری بھی۔ تاکہ جب بھی اسے جہاد کے لیے بلایا جائے تو فوراً اس پر لبیک کہہ سکے۔ یاد رہے جس شخص نے نہ جہاد کیا اور نہ کبھی اس کے دل میں جہاد کی تڑپ اور ارادہ پیدا ہوا اور وہ اسی طرح مر گیا تو وہ نفاق کے شعبے پر مرا۔

نیت کا اجر

حضرت ابوعبداللہ جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک غزوے (جہاد) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یقیناً مدینے میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے جتنا بھی سفر کیا ہے اور جو بھی وادی طے کی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ رہے ہیں۔ انہیں (مدینے میں) بیماری نے روکے رکھا۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

"وہ تمہارے ساتھ اجر میں شریک رہے ہیں۔" (مسلم)

اور بخاری کی روایت، جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس طرح ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ تبوک سے واپس لوٹے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہمارے پیچھے کچھ لوگ مدینے میں رہے۔ ہم جس گھاٹی یا وادی میں چلے، وہ (اجر و ثواب میں) ہمارے ساتھ تھے (کیونکہ) عذر نے انہیں وہاں روکے رکھا۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کے دل میں جہاد کی نیت اور جذبہ صادق موجود ہو لیکن کسی عذر شرعی کی بنا پر شرکت سے معذور رہا تو اللہ تعالیٰ اسے گھر بیٹھے ہی جہاد کا اجر و ثواب عطا فرما دے گا۔

2۔ اسی طرح نیکی کے تمام امور جنہیں انسان سرانجام دینے کا پختہ عزم رکھتا ہو لیکن انجام نہ دے سکے تو حسن نیت کی وجہ سے ثواب حاصل کر لے گا۔ اس طرح اگر کوئی شخص برائی کا پختہ عزم رکھتا ہے لیکن اپنے برے ارادے میں کامیاب نہیں ہوتا تو اسے بھی اس کا گناہ ہوگا اس ارادے سے مراد وہ ارادہ نہیں جو صرف زبان سے ہوتا ہے اور دل میں یہ ہوتا ہے کہ میں نے کون سا یہ کام کرنا ہے۔

صدقہ

حضرت ابویزید معن بن یزید بن اخنس رضی اللہ عنہ اور یہ معن خود ان کے باپ یزید اور دادا، اخنس تینوں صحابی ہیں، نے بیان کیا۔

میرے باپ یزید نے کچھ دینار صدقے کے لیے نکالے اور وہ انہیں مسجد (نبوی) میں ایک آدمی کے پاس رکھ آئے (تاکہ وہ کسی ضرورت مند کو دے دے) میں مسجد میں آیا تو میں نے وہ دینار اس سے لے لیے (کیونکہ میں ضرورت مند تھا) اور وہ گھر لے آیا۔ (جب والد کو معلوم ہوا) تو انہوں نے فرمایا۔

"واللہ! تجھ کو دینے کا تو میں نے ارادہ ہی نہیں کیا تھا۔"

چنانچہ میں اپنے والد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا اور یہ جھگڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے یزید! تیرے لیے تیری نیت کا ثواب ہے اور اے معن! تو نے جو لیا ہے۔ وہ تیرے لیے (جائز) ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر صدقہ غیر ارادی طور پر محتاج بیٹے کے ہاتھ میں آگیا تو اسے واپس لینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ باپ نے تو کسی مستحق کو دینے کی نیت کی تھی، اسے اس کی نیت کے مطابق صدقے کا اجر مل گیا۔ تاہم یہ بات بعض علماء کے

نزدیک نفلی صدقے پر محمول ہوگی کیونکہ صدقہ واجبہ (زکوٰۃ) کی رقم انہیں نہیں دی جاسکتی جن کا خرچ انسان کے ذمے واجب ہے۔

2۔صدقہ کے لیے کسی کو وکیل بنانا جائز ہے۔

3۔شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے باپ کو حاکم مجاز یا عالم دین کے پاس لے جانا، باپ کی نافرمانی نہیں ہے۔ جیسے شرعی مسائل میں باہم وبحث وتکرار گستاخی نہیں ہے۔(فتح الباری 292/3)

وصیت

ابو اسحاق سعد بن ابی وقاص مالک بن جوان دس صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک ہیں جنہیں جنت کی خوش خبری دنیا ہی میں دے دی گئی تھی۔ فرماتے ہیں۔

"میری بیمار پڑی کے لیے حجتہ الوداع کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے مجھے اس وقت شدید درد تھا۔ میں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرا درد کیسی شدت اختیار کرگیا ہے، میں صاحب مال ہوں لیکن میری وارث صرف میری ایک ہی بیٹی ہے۔ کیا میں اپنے مال کا دو تہائی حصہ خیرات کردوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں۔"

میں نے کہا۔ "آدھا مال؟"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں۔"

میں نے کہا "پھر اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ایک تہائی مال صدقہ کردوں؟"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تیسرا حصہ (تم خیرات کرسکتے ہو) اور تیسرا حصہ بھی زیادہ یا بڑا ہے۔ اس لیے کہ تم اپنے وارثوں کو صاحب حیثیت چھوڑ کر جاؤ۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں کنگال کرکے جاؤ اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھیریں۔ (یاد رکھو!) تم جو بھی اللہ کی رضا کے لیے خرچ کروگے تو اس پر تمہیں اجر ملے گا، حتیٰ کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے (اس پر بھی ثواب ہوگا۔"

میں نے کہا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں اپنے ساتھیوں کے بعد پیچھے چھوڑ دیا جاؤں گا؟ یعنی کیا میرے ساتھی مجھ سے پہلے فوت ہوجائیں گے اور میں دنیا میں اکیلا رہ جاؤں گا؟)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اگر ایسا ہوا بھی تو کیا، یہ تمہارے "حق میں اچھا ہی ہے) بلاشبہ ساتھیوں کے بعد جب تم ان کے پیچھے رہ جاؤ گے تو جو بھی عمل اللہ کی رضا کے لیے کرو گے اس سے تمہارے درجے میں زیادتی اور بلندی ہوگی نیز شاید تمہیں مزید زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے، حتیٰ کہ کچھ لوگ (اہل ایمان) تم سے فائدہ اٹھائیں اور کچھ دوسرے لوگوں (کافروں) کو تم سے نقصان پہنچے۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، اے اللہ! میرے صحابہ کی ہجرت کو جاری (پورا) فرمادے اور انہیں ان کی ایڑیوں پر نہ لوٹا۔ لیکن قابل رحم سعد بن خولہ ہیں۔"

ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت کی دعا فرماتے تھے۔ اس لیے کہ وہ مکے میں فوت ہوئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس شہر میں اقامت پذیر ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ جس سے انہوں نے اس کی محبت کے باوجود محض اللہ کی رضا کے لیے ہجرت کی تھی، اس لیے حضرت سعد رضی اللہ عنہ ڈرتے تھے کہ کہیں ان کی موت مکے میں نہ آئے۔ چنانچہ ان کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے اتمام کی دعا فرمائی اور سعد بن خولہ حالت زار پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھ کا اظہار فرمایا کیونکہ ان کی وفات مکے میں ہوئی جس کی وجہ سے وہ ہجرت کے پورے ثواب سے محروم رہے۔

2۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مرض الموت میں انسان ایک تہائی مال (1/3) سے زیادہ صدقہ یا وصیت نہیں کرسکتا۔ لیکن اس سے یہ بھی معلوم

ہوتا ہے کہ فوت ہونے سے پہلے صدقہ کرنا مستحسن امر ہے۔ سلف صالحین میں سے اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، اس لیے دور حاضر میں اصحاب ثروت کو اپنی جائیداد کا کچھ نہ کچھ اللہ کے لیے ضرور وقف کرنا چاہیے کیونکہ دینی مدارس اور مساجد کی حکومتی سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے شدید مسائل پیدا ہو رہے ہیں

3۔ انسان کی اگر نیت صحیح ہو تو بیوی بچوں پر جو کچھ خرچ کرتا ہے، اس پر بھی اسے اجر ملتا ہے۔

4۔ کسی صحیح غرض کی خاطر انسان اپنی بیماری یا تکلیف کا اظہار کر سکتا ہے، تاکہ اس کا علاج یا دعا کی جا سکے، یہ اللہ کے خلاف شکوہ نہیں ہے۔

5۔ انفاق و صدقات میں اپنے قریب ترین رشتے داروں کو اولیت اور فوقیت دی جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے تعیشات کے لیے زکوٰۃ خرچ کی جائے جبکہ عام غربا زیادہ ضرورت مند ہوں جیسا کہ بعض فی زمانہ اس طرح کرتے ہیں۔

راوی حدیث: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سعد بن مالک بن اہیب قرشی، زہری، ان کی کنیت ابو اسحاق ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں پانچواں یا ساتواں نمبر ہے۔ جب اسلام قبول کیا تو ان کی والدہ نے کھانا پینا ترک کر دیا اور کہا "جب تک تو دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منحرف نہیں ہوتا اس وقت تک میں کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور نہ سائے ہی میں ہوں گی۔ یہ اپنی والدہ کے بہت تابع فرمان تھے لیکن ماں سے کہا کہ میں دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ان دس صحابہ کرام میں سے ہیں جنہیں جنت کی بشارت دی گئی...... یہ وہ خوش نصیب ہیں جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے سعد! تیر چلاؤ، میرے ماں باپ تم پر قربان۔" اور یہ دعا بھی کی۔ "اے اللہ! ان کا نشانہ سیدھا رکھنا۔"

انہیں ایک بار آتا دیکھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ میرا ماموں ہے، اس جیسا کوئی دکھائے تو سہی۔"

"تمام غزوات میں شرکت کی۔ فاتح عراق ہیں اور فتح ایران بھی ان ہی کا عظیم کارنامہ ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص نے مدینہ سے دس میل دور مقام عقیق میں 55 ہجری میں وفات پائی۔ وہاں سے ان کی میت کندھوں پر لائی گئی اور انہیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ کتب احادیث میں ان سے 270 احادیث مروی ہیں۔

شہید کون ہے؟

حضرت ابو موسیٰ عبداللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

"ایک آدمی بہادری کے جوہر دکھانے کے لیے دوسرا (خاندانی، قبائلی) حمیت کے لیے اور ایک تیسرا ریاکاری کے لیے لڑتا ہے۔ ان میں سے اللہ کی راہ میں لڑنے والا کون ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص صرف اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ (دین) بلند ہو، وہ اللہ کی راہ میں لڑنے والا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ کے ہاں اعمال کا اعتبار چونکہ نیات صالحہ کے مطابق ہوگا، اس لیے عنداللہ مجاہد فی سبیل اللہ بھی صرف وہی ہوگا جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے لڑے گا۔ تاہم اس کا تعلق چونکہ دل سے ہے، جس کو انسان دیکھنے پر قادر نہیں ہے، اس لیے میدان جہاد میں ہر مسلمان مقتول کے ساتھ شہید والا معاملہ کیا جائے گا۔ اور اس کی نیت اور ارادے کا مسئلہ اللہ کے سپرد ہوگا کیونکہ دلوں کے بھید صرف وہی جانتا ہے۔

2۔ انسان کو چاہیے کہ حلال، حرام اور اپنے دین کی اصلاح کے لیے گاہے گاہے علماء سے استفسار کرتا رہے۔

☆

انشاجی کے خطوط

رضیہ فصیح احمد

ایک مرتبہ ہم نے کسی صاحب عقل و فراست سے پوچھا کہ اخبار کے پہلے صفحے پر کن لوگوں کی تصویریں چھپتی ہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ جو کچھ کرتے ہیں یا کچھ بناتے ہیں۔ مثلاً جہاز ہائی جیک کرتے ہیں یا سنچریاں بناتے ہیں۔ ہم نے پوچھا۔ "اور لکھنے والے۔"

تو انہوں نے کہا۔ "جو وزیر یا سفیر ہو جائیں، یا مرجائیں۔"

انشا جی اخبار کے پہلے صفحے پر آنے کے لیے اور تو کچھ نہ کر سکے، بس چپکے سے مرگئے اور تابوت کے شیشے کے پیچھے سے ان کی شبیہ اخبار کے پہلے صفحہ پر نظر آئی۔ اس بات پر وہ نہایت عمدہ کالم لکھتے کہ جو لوگ ہوائی جہاز ہائی جیک کرتے ہیں، وہ ایک کروڑ ڈالر نقد مانگتے ہیں ہم بے چارے عمر کی نقدی مانگتے رہے۔ وہ بھی ادھار اور سو پچاس برس نہیں بلکہ پانچ دس برس۔ سچ ہے! فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ لیکھک تھے۔ ہمارے تخیل کی اڑان بس اتنی ہی تھی۔

انشاجی میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ اوروں کے ساتھ اپنا بھی مذاق اڑا لیتے تھے۔ بلکہ اوروں کا کم اپنا زیادہ۔

میرے نام انشاجی کے خطوط میں بھی ان کے انشائیوں کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔

یہ خط دوسرے بہت سے خطوط کے ساتھ ایک بڑے سے لفافے میں ہمارے گھر کی دو چھتی پر ایک سوٹ کیس میں پڑے تھے۔ وہ دو چھتی اتنی اونچی تھی کہ ایک مرتبہ جو چیز اوپر چلی جائے وہ نیچے نہیں آسکتی تھی۔ اور جو نیچے رہ جائے وہ اوپر نہیں جاسکتی تھی۔ گویا زمین آسمان کا فاصلہ تھا۔

اس کے علاوہ اس گھر میں اور بھی کئی خوبیاں تھیں۔ مثلاً پانی نایاب تھا۔ دیمک اور مالکہ مکان بافراط نظر آتی تھیں۔ چھت ناپختہ اور فرش زمین سے بہت دور تھا۔ گھر کے بارے میں ہر شکایت کو وہ اپنے مرحوم شوہر کے کھاتے میں ڈالتی تھیں۔ یعنی "میں کیا کروں، بیوہ ہوں۔" یہ جملہ وہ ہمیشہ بہ زبان انگریزی ادا کرتی تھیں۔ ہوسکتا ہے ان کے نزدیک لفظ "وڈو"

سے زیادہ بو گی ٹپکتی ہو۔

بہر حال اس مکان کی خستہ دو چھتی پر سے ایک مرتبہ جب سامان اتارا گیا تو سوٹ کیس کے سارے سوٹ بھی گل چکے تھے اور کیس بھی، صندوق میں لحاف اور رضائیاں پھوئی پھوئی ہو چکی تھیں۔ اور ایک سوٹ کیس میں سے جو خطوط نکلے، وہ بس آخری سانس لے رہے تھے۔ اگر چند دن اور نہ نکالا جاتا تو پتا بھی نہ چلتا کہ "زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔"

آکسیجن تو میسر نہ تھی بہر حال خطوط کو ہوا اور دھوپ دی گئی، جو زندہ بچے انہیں دوبارہ داخل صندوق کر دیا گیا۔ انشاء جی کے خطوط چوں کہ نہایت دل چسپ ہیں، اس لیے جی چاہا کہ چھپ جائیں تو اچھا ہے کہ روشنائی روز بروز دھندلا رہی ہے۔ مرحوم ایسے خوش خط بھی نہ تھے کہ ان کی تحریر سرد و گرم زمانہ زیادہ عرصہ تک جھیل سکے۔ ظالم وقت نے جس طرح صاحب قلم کو نہ چھوڑا، ان کے خطوط کو بھی ایک نہ ایک دن کھا لے گا۔

1960ء میں ہم نے "ہم قلم" کے لیے ایک افسانہ اور ایک مضمون بھیجا۔ انشاجی نے رسید بھیجی اور کچھ تعریف کی۔ اس طرح ہماری خط و کتابت "فیڈ ان" ہوئی جو اشفاق احمد کے ڈراموں کی طرح سہج سہج چلتی 1965ء میں "فیڈ آؤٹ" ہو گئی۔

اس زمانے میں انشاجی خود کچھ نہیں لکھ رہے تھے۔ اس لیے ان کو خاصی پریشانی تھی۔ وہ اکثر خطوط میں میری زود نویسی پر رشک کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر بعد میں پتا چلا کہ کچھ لوگ چھپے رستم ہوتے ہیں، کچھ چھپے انشا ہوتے ہیں۔ جیسے انشاجی تھے کہ جب ان پر کالم نگاری کا دوسرا دور آیا تو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ان کے کالموں کی کئی کتابیں ترتیب پا گئیں جو کسی بھی باذوق شخص کے گھٹتے دل کو بڑھاوے کا کام دے سکتی ہیں یا مالیخولیا کے مریض کو مالی پریشانیوں سے تو نہیں البتہ "خولیا" یعنی خالی خولی پریشانی سے نجات دلا سکتی ہیں۔۔

میرا خیال ہے اگر ہم (ہم میں آپ بھی شامل ہیں) میں چکنے گھڑے ہونے کی بے پناہ صلاحیت نہ ہوتی تو انشاجی کے کالم ہر شخص کے لیے تازیانہ تھے۔ مگر ہم ان کی ہر بات مذاق میں ٹال جاتے تھے۔ انشاجی مر گئے مگر ہمارے کان پر جوں نہ رینگی۔ ہم نے اپنی خو نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ انشاجی نے اپنی وضع بدل دی اور وہ جو ہمیں چلو بھر پانی میں ڈوبنے کا اشارہ دیا کرتے تھے خود منوں مٹی کے نیچے جا چھپے۔

انشاجی سے خط و کتابت کے ذریعے ہماری نصف ملاقات کو جب ایک عرصہ گزر گیا تو آمنے سامنے کی دو ایک ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ ایک مرتبہ ان کے دفتر میں جو ان دنوں نیشنل بک سینٹر کہلاتا تھا، عالی جی بھی موجود تھے۔ کسی صاحبہ سے ہماری ملاقات کروانا چاہتے تھے۔ دونوں صلاح کرتے رہے کہ بھئی وہ صاحبہ "میجر" کی بیوی سے ملنا پسند نہیں کریں گی۔ کم از کم "میجر جنرل" تو کہو۔ بہر حال فون ہوا۔ شاید انہوں نے میجر جنرل کی بیوی سے ملنا بھی پسند نہ کیا۔ چناں چہ ان صاحبہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ خط میں بائر انگر گروپ اور فصیح کو میجر جنرل لکھنے کا سبب، یہ واقعہ ہے۔

نیاز کیش ابن انشا

(کراچی) 10-4-63

رضیہ بیگم! آداب!

میں تو ڈھاکے میں پھنس گیا تھا۔ حاجی لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہم گناہ گاروں کو سیٹ ہی نہیں مل رہی تھی۔ بہ ہزار خرابی اس اتوار کو جیٹ کے بجائے سپر کانسٹلیشن میں آیا۔ جو ڈھائی تین گھنٹے کی جگہ چھ ساڑھے چھ گھنٹے لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے حد کوفت ہوئی۔ ہاں ڈھاکے میں مزے رہے۔ آپ اونچے اکنامک گروپ کا لطیفہ بھول جائیں تو عرض کروں کہ شاہ باغ میں پڑا اینڈتا تھا۔ شہاب صاحب بھی وہیں تھے۔ صبح پانچ بجے اٹھا کے مجھے رمنا کے ریس کورس کی سیر کو لے جاتے تھے۔ میں نے بارہا عذر کیا کہ اس سیر اور صبح کی ورزش اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے خاکسار کی صحت خراب ہو جائے گی جو مدت العمر شہر کی دھواں دھار

فضا میں رہنے اور ساڑھے سات آٹھ بجے اٹھنے کا
عادی ہے۔ لیکن نہیں ...... پھر شاہ باغ والے ہمیشہ
سے کھانے میں ٹھوسم ٹھانس کے عادی ہیں اور کراچی
اور لاہور کی اونچی دکانوں کے برخلاف سچی بات یہ
ہے کہ سستے بھی ہیں اور اچھے بھی ہیں۔ حتیٰ کہ بااخلاق
بھی۔ اگر وہ بعد میں بل لینا بھی چھوڑ دیں تو ساری
دنیا ان کی گرویدہ ہوجائے۔

آپ کا ناول میری غیر موجودگی میں آیا تھا۔
ریاض میری ڈاک اس اثناء میں لے گئے تھے۔ ناول
اور خط ان کا آدمی آج دے کر گیا ہے۔ ناول تو اب
میں ذرا فرصت سے ڈھاکہ کی لنگی اور کنگھی پہن کر
دیکھوں گا۔

ہاں خط کا جواب دینا واجب ہے۔ آپ سے
ملاقات مختصر رہی لیکن جی خوش ہوا۔ آپ ہمارے
ڈھب کی آدمی ہیں۔ سادگی اور تکلف اور تملق سے
عاری۔ اللہ فصیح احمد صاحب کو جلد سچ مچ کا میجر جنرل
بنائے۔ امید ہے اس کے بعد بھی آپ یہی رہیں گی۔
البتہ ایک بات ہے۔ آپ کی تحریروں میں جو شرارت
بلکہ "فتنہ پردازی" پائی جاتی ہے اس کا گفتگو میں
مظاہرہ نہیں ہونے پایا۔ گہرے دریا ہمیشہ دھیما بہتے
ہیں۔ لیکن پھر اپنی برائی کرنی ضروری ہوجائے گی کہ
اپنی شخصیت کو ہتھیلی پر رکھ دیتے ہیں۔ خیر اس وقت
خاکساری اور خود مذمتی کا موڈ بھی نہیں۔ ہم بھی اچھے،
آپ بھی اچھے۔ میں نے جو گفتنی تھا، ابیات میں کہہ
دیا۔ سچ ہے کہ وہی اصل زندگی ہے۔ بس اس زندگی
میں کہ کہنے کو سوز ہی سوز ہے۔ کامران اور بامراد
ہونے کی دعا دیجیے۔

دیکھا آپ نے، قلم کو ذرا سی ڈھیل دی اور
رقت طاری ہونے لگی۔ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے
افسانے کہنے کو جی چاہنے لگا۔ آپ کیا جانیں اس بستی
کے اک کوچے میں کیا کیا نیرنگ ہیں لیکن اب اے قلم
حد ادب۔

آپ کا ایک ایک سنگ میل گنتے جانا اچھے
خاصے سفرنامے کو تحریک دے سکتا ہے۔ اور اس میں
الحاقی کلام شامل کرنے کی بہت کم ضرورت ہوگی۔
"درد کے فاصلے" آپ نے ناول کا بہت اچھا نام
سوچا ہے۔ باقی باتیں ناول اور افسانوں کے متعلق
آپ کو ریاض خود لکھ دے گا۔ آپ کے شعر بھی
دیکھے۔ اگر یہ اشعار بے اختیاری میں سرزد ہوئے ہیں
تو۔

کیا جانیں کیا کرے جو خدا اختیار دے

کہیں بھیجنے سے پہلے ایک نظر ضرور دیکھ لیجیے۔
میں ذاتی طور پر عروضی آزادیوں کے بجائے، صوتی
خوب صورتی کو ترجیح دیتا ہوں۔ جاں ہی سے جھٹکا لگتا
ہے۔ آپ جان پڑھیے مطلب وہی رہے گا۔ "ناوکِ
دشنام" ایک مرکب لفظ، ساری غزل کے مزاج سے
بے آہنگ ہوگیا ہے۔ میں تو غم دوراں کا مضمون کم
باندھتا ہوں۔ آپ نے باندھا ہے تو ذرا کس کر
باندھیے۔ آپ کی میں نے بہت اچھی اچھی غزلیں
پڑھی ہیں۔ یہ ان سے نکلتی ہوئی نہیں۔ آپ میجر جنرل
صاحب کو ایک اوسط قاری فرض کر کے ان کو اپنی
غزلیں پڑھایا کیجیے۔ اور ذرا ان کو آزادیٔ اظہار کا حق
بھی دیجیے۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن کبھی کسی موقع
پر آپ کے گھریلو تعلقات میں کوئی بدمزگی آئی تو میں
ذمہ دار نہ ہوں گا۔ بہت لکھ گیا۔ اس وقت سات بج
رہے ہیں۔ ظاہر ہے شام کے۔ صبح کو تو میں سورہا ہوتا
ہوں۔

چل خسرو گھر اپنے، سانجھ بھئی چودیس

نیاز کیش ابن انشاء

باصلاحیت اینکر پرسن

آصفہ زہرا سے ملاقات

شاہین رشید

آج میڈیا میں خواتین بھی اپنا کردار نبھاہ رہی ہیں۔ یہ خواتین ورکنگ وومن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کی ذمہ داریوں کو بھی احسن طریقے سے ادا کررہی ہیں۔ آصفہ زہرہ بھی ان ہی میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنے سفر کا آغاز ریڈیو پاکستان سے کیا اور آج ایک باصلاحیت نیوز کاسٹر، نیوز اینکر اور آر جے مانی جاتی ہیں۔

آئیے آصفہ زہرہ سے ملاقات کرتے ہیں۔

''کیسے مزاج ہیں اور اپنا فیملی بیک گراونڈ بتایئے؟''

''کرم ہے اللہ کا...... میرے والد ''جیولوجسٹ'' تھے۔ جبکہ والدہ ہاؤس وائف...... والدہ امروہہ سے تعلق رکھتی تھیں اور والد صاحب کا تعلق ''جے پور'' سے تھا...... میں نے ماسٹرز کیا ''آئی آر'' میں اور ہم چار بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ 2 جنوری کو میں نے دنیا میں آنکھ کھولی۔ اور ماشاء اللہ سے میں شادی شدہ ہوں اور میرا ایک بیٹا ہے۔''

''بچپن کے بارے میں بتائیں؟''

''بچپن میں ہم اپنی امی کی آنکھ کے اشارے پر چلتے تھے۔ مگر پھر بھی شرارتی تھی...... اور گڑیوں سے میں نے کبھی نہیں کھیلا...... البتہ لڑکوں والے سارے گیم کھیلے...... چھتوں پر چڑھنا۔ کودنا، بھاگنا...... ادھر ادھر چڑھنا، چھت پر جا کر پتنگیں اڑانا سائیکلنگ

کرنا وغیرہ میرا مشغلہ تھا۔ پڑھاکو بالکل نہیں تھی۔ امتحان سے پہلے پڑھ پڑھا کر کسی طرح پاس ہو جاتی تھی ...... ہاں غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ ذہین بچوں میں شمار نہیں ہوتا تھا مگر کلاس کی فرسٹ بینچ پر بیٹھا کرتی تھی کہ بیٹھوں گی تو سب سے آگے۔"

"ریڈیو ٹی وی سے وابستہ ہوئے کتنا ٹائم ہو گیا اور کس طرح آئیں اور ویب پیج کے بارے میں بھی بتائیں؟"

"اپنے کیریئر کی شروعات تو ریڈیو سے کی،

کالج لائف میں بزم طلبہ میں حصہ لیا کرتی تھی، اور یہ بات ہے 2003ء...... 2004ء کی، اور ریڈیو سے یہ ناتا ابھی تک برقرار ہے اور ٹی وی انڈسٹری کو جوائن کیا تھا 2007ء میں اور اس وقت میں یونیورسٹی کی طالبہ تھی...... "سچ" ٹی وی سے شروعات کی پھر پتا چلا کہ ایک چینل "اب تک" لانچ ہو رہا ہے...... تو آٹھ سال پہلے "اب تک" کو جوائن کیا اور ابھی تک یہیں پر ہوں اور فی الحال کہیں اور کسی چینل میں جانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی، کیونکہ میں اپنی جاب سے بہت خوش ہوں۔ مجھے یہاں کسی قسم کا کوئی پرابلم نہیں ہے۔ فیوچر کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔

ریڈیو میں شروع شروع میں تو جب ریڈیو والے بلاتے تھے تو ریڈیو کے ڈراموں میں صداکاری کر لیتی تھی۔ لیکن گزشتہ تین سال سے میں نے ایف ایم۔ 105 کو جوائن کیا ہوا ہے۔ پہلے وہاں "پریس کلب" کیا کرتی تھی۔ اب مارننگ شو کرتی ہوں اور ہفتے میں تین چار دن ریڈیو پہ ہی گزرتے ہیں اور ویب سے یہ تعلق ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں اخبارات میں کچھ نہ کچھ لکھ لیا کرتی تھی اور یہ بات ہے 2007ء، 2008ء اور 2009ء کی، پھر مصروفیت کی وجہ سے اخبارات سے تعلق کچھ کم ہو گیا۔ اب وقت ملتا ہے تو لکھ لیتی ہوں، ورنہ نہیں...... دو مختلف ادارے ہیں جن کے ویب پیج کے لیے لکھ رہی ہوں اور "اب تک" کے ویب پیج کے لیے بھی لکھ رہی ہوں تو لکھنے کا تعلق برقرار ہے۔"

"میڈیا کی طرف رجحان کیسے ہوا؟"

"رجحان کا تو نہیں معلوم لیکن میڈیا میں دلچسپی بہت تھی...... تو ریڈیو کرتی تھی اور پھر ریڈیو سے ہی راستہ بنتا چلا گیا۔ ہاں مجھے بنیادی طور پر فارن سروس جوائن کرنے کا شوق تھا اور اس لیے میں نے آئی آر میں ماسٹرز کیا...... لیکن چونکہ میں کالج لائف سے ہی ریڈیو پہ پروگرام کر رہی تھی اور کسی نہ کسی طور پر ٹی وی پہ بھی نوکری کر رہی تھی تو بس پھر یہیں آ کر رک گئی۔

ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس فیلڈ میں آ کر مجھے بہت کچھ کرنے کے مواقع ملے...... لیکن میں نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا کیونکہ مجھے جرنلزم میں آنا تھا اور نیوز میں آ کر مجھے بہت اچھا لگا۔

جہاں تک رپورٹنگ کی بات ہے تو میں نے ریڈیو کے لیے رپورٹنگ کی ہے...... اور اب نیوز میں آ کر مجھے بہت سکون ہے اور اسی میں میری دلچسپی بھی ہے......

اور آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ جب میں غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھی تو میری دادی نے مجھے ریڈیو جوائن کرنے کے لیے کہا اور یہ بھی کہا کہ ہم تمہیں لے کر جاتے ہیں ریڈیو پہ...... اور سچ تو یہ ہے کہ ریڈیو کا راستہ دکھانے والی میری دادی ہی تھیں...... اور بس پھر جو ریڈیو پہ آ جائے اس کے لیے راستے بنتے چلے جاتے ہیں اور میں نے بھی آفرز کا فائدہ اٹھایا اور ریڈیو کے ساتھ ساتھ ٹی وی بھی جوائن کر لیا۔"

"دیگر چینلز سے خواہ وہ ریڈیو ہو یا ٹی وی آپ کو آفرز تو آتی ہی ہوں گی؟"

"جی جی...... آفرز آتی ہیں، لیکن چونکہ میں یہاں بہت مطمئن ہوں تو اس لیے کسی کی آفر کو قبول نہیں کرتی...... یہاں کی مینجمنٹ بہت اچھی ہے اور میری جو روٹین ہے، وہ بہت اچھی ہے...... بہت

عزت ہے تو کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن سے انسان بہت مطمئن ہوتا ہے تو وہ سب کچھ یہاں ہے۔
ہاں میرا یہ خواب ہے کہ میں "بی بی سی" کا حصہ بنوں یا کسی بھی اچھے انٹرنیشنل ادارے کو جوائن کروں......
پاکستان میں تو مجھے سب چینل ایک جیسے ہی لگتے ہیں اور اب تو سیکھنے یا سکھانے کا عمل بھی بہت کم ہو گیا ہے اور اسٹینڈرڈ کمپرومائز ہو گیا ہے۔"

"اب تک" ایک چینل ہے...... آپ بتائیں کہ اس کو دیکھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟"

"ہمارے اس چینل نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے...... میں دیکھتی ہوں کہ کئی چینلز ایسے ہیں جو اب تک سے بہت پہلے منظر عام پر آئے مگر وہ ایسی مقبولیت حاصل نہیں کر سکے جیسی مقبولیت "اب تک" نے تھوڑے عرصے میں حاصل کی...... اب تو "اب تک" کا شمار "ٹاپ ٹین" میں ہوتا ہے۔"

"غلطیاں اور حماقتیں کبھی سرزد ہوئیں؟"

"ظاہر ہے...... ہم سب انسان ہیں اور انسانوں سے ہی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں...... اور ہم دن میں پانچ چھ گھنٹے آن اسکرین بیٹھتے ہیں۔ اور کبھی اس سے بھی زیادہ تو...... نزلہ زکام، بخار، چھینک یہ سب فطری عمل ہیں۔ تو اکثر ہی ہوتی ہیں اور سیزنل تو بہت ہی زیادہ ہوتی ہیں اور سب کے ساتھ ہوتی ہیں...... اور سیزن یعنی جب موسم بدلتا ہے تو سب کو ہی کھانسی اور دیگر سب کچھ ہوتا ہے...... اور جو کیمرہ مین ہوتے ہیں، وہ ہمارے اشارے کو سمجھتے ہیں اور مائیک بند کروا کے پھر ہم اپنی طبیعت کو سیٹ کرتے ہیں۔

کبھی کبھی اچانک چھینک آجائے یا کھانسی آجائے تو برا تو لگتا ہے مگر کیا کریں...... یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا...... تو کبھی کبھی اچانک کوئی بات ہو جائے تو ہنسی آجاتی ہے اور ہم...... بریک پہ جا رہے ہیں کہہ کر کیمرہ آف کروا دیتے ہیں۔ تو یہ چیزیں عجیب لگتی ہیں مگر کیا کریں۔"

"آپ نیوز کاسٹر ہیں، نیوز اینکر کے فرائض کیوں نہیں انجام دے رہیں؟"

"جب میں "سچ" ٹی وی میں تھی تو نیوز اینکرنگ بھی کرتی تھی اور جب یہاں آئی تو کہا گیا کہ نیوز کے ساتھ ساتھ اینکرنگ بھی کریں گی۔ مگر چونکہ ہر جگہ کے اپنے اصول و ضوابط ہوتے ہیں تو کہا گیا کہ پروگرام اینکر پروگرام کرے گا اور نیوز کاسٹر پروگرام نہیں کرے گا۔ لیکن اگر مجھے بہتر اور اچھی جگہ سے پیشکش ہوئی تو میں لازمی طور پر کرنٹ افیئرز کو جوائن کرنا چاہوں گی اور پروگرام کرنا چاہوں گی اور کوئی ایڈیٹوریل پوزیشن پہ کام کرنے کی آفر ہوئی تو ضرور کام کروں گی۔"

"اب ہر نیوز، بریکنگ نیوز بن جاتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ایسا ہونا چاہیے اور اردو بھی بہت خراب ہو گئی ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟"

"میں آپ کی بات سے متفق ہوں۔ ہر نیوز، بریکنگ نیوز نہیں ہوتی...... اور اس کو درست ہونے کی ضرورت ہے، دراصل بہت زیادہ چینلز آنے سے

لوگوں کی ٹریننگ ختم ہوگئی ہے......اردو خراب ہوگئی ہے......لوگوں کا "املا" انتہائی خراب ہوگیا ہے...... اور میں اپنی بات بھی کروں گی کہ میں بھی لفظوں لفظوں کہہ کر غلط لفظ استعمال کرتی ہوں مگر کیا کریں کہ لوگ بھی انڈر اسٹینڈ نہیں کرتے...... پہلے ان باتوں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا مگر اب نہیں......اب تو زبان انتہائی زبوں حالی کا شکار ہے۔ اب تو نہ سیکھنے کا عمل بچا ہے نہ سکھانے کا......ان باتوں نے پوری انڈسٹری کو تباہ کردیا ہے......

اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ کسی معاملے میں بحث نہیں کرسکتے......اگر کوئی گائے پھنس گئی ہے، اتر نہیں رہی تو بریکنگ نیوز ہوجاتی ہے......کتا مین ہول میں گر گیا ہے تو بریکنگ نیوز ہوجاتی ہے۔ کوئی لڑکی بھاگ گئی بریکنگ نیوز ہوجاتی ہے۔ یہ بہت نارمل سی خبریں ہیں، اور اس کا تعلق کسی سے نہیں ہے......مگر ہم اس پر بحث نہیں کرسکتے۔ بس ہمیں پڑھنے کو کہا گیا ہے تو ہمیں پڑھنا ہے۔ ہمیں اپنے ادارے کی پالیسی پر چلنا ہوتا ہے اس لیے میں کہتی ہوں کہ فیوچر میں یا تو میں کرنٹ افیئرز میں ہوں گی یا پھر ایڈیٹوریل کا حصہ ہوں گی تاکہ میں کچھ اچھا سکھا سکوں اور سیکھ بھی سکوں۔"

"کبھی کسی سیاست دان یا کسی مشہور شخصیت کا انٹرویو کرنے کا موقع ملا...... نیوز کے دوران؟"

"جب میں ریڈیو پہ تھی اور رپورٹنگ کرتی تھی تو ہماری ہیڈ "سیما رضا" تھیں اور ہم اپنے پروگرام کے دوران بہت سی شخصیات سے ملاقات بھی کرتے تھے اور انٹرویو بھی کرتے تھے لیکن چونکہ میں ابھی نیوز اینکر ہوں۔ اسٹوڈیو کے اندر ہوتی ہوں تو ایسا اتفاق نہیں ہوتا انٹرویو کرنے کا......تو جب میں ریڈیو پاکستان میں تھی اور رپورٹنگ کر رہی تھی تو "میر واعظ عمر فاروق" پاکستان آئے ہوئے تھے اور ہماری ٹیم نے جا کر ان کا انٹرویو کیا تھا...... وہ ہمارے لیے بہت یادگار دن تھا۔

انہوں نے کسی اور میڈیا گروپ کو انٹرویو دینا تھا مگر انہوں نے ہمیں ٹائم دیا......تو یہ بڑی بات تھی ہمارے لیے......اور ایسی کافی شخصیات تھیں کہ جن کے ہم نے انٹرویوز کیے اور کچھ سال پہلے تک عمران خان، عارف علوی اور دیگر سیاست دان بہت اچھے سے بات کرتے تھے اور آسانی سے ہاتھ بھی آجاتے تھے......مگر اب ایسا نہیں ہے۔ بے شمار انٹرویوز میں میر واعظ عمر فاروق کے انٹرویو کو ہی یادگار کہوں گی۔"

"کس فیلڈ میں زیادہ دلچسپی ہے۔ ریڈیو یا ٹی وی؟"

"دونوں ہی فیلڈز مجھے بہت پسند ہیں اور دلچسپی کا معاملہ تو یہ ہے کہ ریڈیو کے اپنے تقاضے ہیں اور ٹی وی کے اپنے......البتہ چونکہ شروعات ریڈیو سے کی تھی تو ریڈیو سے پروگرام کرنا اچھا لگتا ہے......اور ریڈیو سے جو قلبی وابستگی ہے، وہ اسے چھوڑنے نہیں دیتی، دونوں میڈیم علیحدہ علیحدہ ہیں اور دونوں کے ٹیسٹ الگ الگ ہیں......تو مجھے دونوں میڈیم میں ہی مزہ آتا ہے۔"

"چلیں جی......اب کچھ نجی سوال......فرصت کے اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

"فرصت کے اوقات بہت ہی کم میسر آتے ہیں۔ مگر جب فرصت ملتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو زیادہ ٹائم دوں......مجھ پر میرے وقت پر......میرے پیاروں کا حق زیادہ ہے۔"

"امور خانہ داری کی کیا صورت حال ہے؟"

"الحمدللہ امور خانہ داری میں طاق ہوں...... کوکنگ ضرورتاً کرتی ہوں مگر دل سے کرتی ہوں۔ اپنا کام اور بیٹے کا کوئی بھی کام میڈ پر نہیں چھوڑتی بلکہ خود کرتی ہوں......میرے نزدیک جس سے آپ پیار کرتے ہیں، اس کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنا پیار کا ثبوت دینا ہے......ورنہ زبانی اظہار آج کے دور میں بے حد عام اور مقبول ہے مگر محبت محسوس نہیں ہوتی۔"

"ہوٹلنگ کرنا......گھومنا پھرنا......فیملی کے ساتھ وقت گزارنا کتنا پسند ہے؟"

"کراچی میں تفریحی مقامات کم ہیں......
اور کچھ وقت نے بھی ہاتھ باندھ رکھے ہیں اس لیے جب گھر والوں کے ساتھ وقت گزارنا ہو تو ہوٹلنگ کرتی ہوں۔ دفتری اوقات کے بعد کا سارا وقت گھر پر گزارتی ہوں اور میری سوشل لائف تقریباً صفر ہے۔ وقت ہی نہیں ملتا......سوشل لائف کے لیے۔"

"شاپنگ کا شوق ہے؟"

"شاپنگ کی رسیا نہیں ہوں۔ ضرورتاً شاپنگ کرتی ہوں اور گھنٹوں بازاروں میں گھومنا مجھے پسند نہیں۔ اس لیے ضرورتاً جاتی ہوں۔"

"فیشن سے لگاؤ ہے؟"

"جیولری شوق سے پہنتی ہوں اور مجھے گلے کی چین اور بریسلٹ کا شوق ہے......میک اپ کا اب کوئی شوق نہیں رہا، کیونکہ میک اپ اب روزانہ کا معمول ہے اور میک اپ کرنا ہماری مجبوری ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ مجھے فیشن سے لگاؤ نہیں ہے بلکہ بالکل لگاؤ نہیں ہے۔"

"اپنے ملک کے ڈراموں سے مطمئن ہیں۔ کبھی اداکاری کی؟"

"میں اپنے پاکستانی ڈراموں سے بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں......معیار پر سمجھوتہ ہو گیا ہے...... کہانی کمزور اور ایک خاص گراوٹ کا شکار ہوئی ہے۔ ہمارے ڈرامے "زبان" اور لوگوں کا معیار زندگی بہتر کرنے، ان کی بہتر زندگی کی عکاسی کر سکتے ہیں......
اور ہاں ...... میں نے اسکول اور کالج لائف میں اداکاری کی ہے......لیکن اب میں اسے پروفیشنلی طور پر اپنانا نہیں چاہتی...... مجھے فلم دیکھنا پسند ہے۔ کیونکہ ایک ہی نشست میں مکمل ہو جاتی ہے۔"

"کون سے ممالک جانے کو بار بار دل چاہتا ہے؟"

"میں دو سالوں سے یو ایس انسٹیٹیوٹ آف پیس کی فیلو ممبر ہوں ......اور اس کی وجہ سے کافی جگہیں میں نے دیکھی ہیں۔ کام کے سلسلے میں آنا جانا لگا رہتا ہے میں اگر کہیں دوبارہ جانا چاہتی ہوں تو وہ "سینٹ پیٹربرگ" ہے اور مجھے "پراگ" یروشلم اور فلسطین دیکھنا ہے...... پاکستان کا لینڈ اسکیپ بہترین ہے۔ اللہ نے پاکستان کو بہت خوب صورت بنایا ہے اور پاکستان کو پورا دیکھنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے آصفہ زہرہ سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

نیا سورج اٹھالائیں گے مشرق کے دفینے سے
نہ گھبرا اے شبِ ہجراں، اجالا ہم بھی دیکھیں گے

زندگی نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ یہاں غم ہے تو خوشی بھی ہے۔ مشکل ہے تو اس کے ساتھ آسانی بھی ہے۔ دکھ سکھ، محبتیں، نفرتیں، شب و روز کی گردش سے کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ وقت کے ساتھ حالات بھی بدل جاتے ہیں۔ بہت سے زخم بھر جاتے ہیں۔ شرط یہ ہے استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا جائے۔ ہر سیاہ رات کے بعد سویرا ہے، خواہ رات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو۔

بھاگتی دوڑتی زندگی نے ایک اور سال کی مسافت طے کرلی ہے۔ ایک اور سال کا آغاز ہورہا ہے۔

سال گزشتہ کئی حوالوں سے ایک ہمیشہ یاد رہنے والا سال تھا۔ اس سال دنیا ایک نئے تجربے سے گزری۔ روز و شب کے معمولات بدل گئے۔ دن بوجھل تھے تو راتیں بے چین۔ ہماری قارئین کا یہ سال کیسا گزرا، اس بار سروے میں ہم نے اسی حوالے سے سوال کیے ہیں۔

(1) کہتے ہیں 2020ء مشکل سال تھا۔ آپ کا یہ سال کیسا گزرا؟

(2) لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا۔ اس دوران کوئی اچھا یا مثبت کام کیا؟

(3) نیا سال شروع ہورہا ہے۔ نئے سال میں آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟ آپ کے ذہن میں کوئی پلان ہے تو لکھیے؟

آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جواب دیے ہیں۔

روشنی کے خوف سائے

ادارہ

فہمیدہ جاوید...... ملتان

میں بہت خوش ہوں کہ کافی وقت سے منتظر تھی کہ کب سروے ہو اور اپنے خیالات کا اظہار کروں۔

(1) میرے لیے یہ سال معمول سے ہٹ کر ہی گزرا۔ کورونا کی وجہ سے ہمارے رشتہ داروں میں کوئی دوری نہ آئی بلکہ کورونا کی چھٹیوں کی وجہ سے میری نندیں میکے رہنے آئیں اور ہم لوگوں نے گھر میں بڑے مزے بھی کیے۔ بچوں نے کھایا پیا اور دل کھول کر کھیلے اور مزے سے ڈرائنگ کی۔ آپ لوگ حیران ہورہے ہوں گے مگر یہ سب سچ ہے۔

اس کے ساتھ گھر میں خرچ کے معاملات بھی متاثر رہے اور ہمیں ڈر بھی لگا کہ ہمیں وائرس نہ ہو جائے۔ کسی نے کہا کہ ایک منٹ تک سانس روک کر رکھو، اگر کھانسی آئے تو تمہیں کورونا وائرس پیار کرچکا ہے اور دستک دے دی ہے اور میں نے یہ عمل اپنے اوپر وقتے وقتے سے کیا، شکر ہے میں نہ کھانسی۔ ہاہاہا۔

(2) لاک ڈاؤن میں اچھا وقت گزرا کہ میں نے بہت سارے پرانے شمارے دکان سے تین سال کے ترتیب کے حساب سے لیے اور پڑھے جب کہ نماز و قرآن بھی پڑھا۔ میں نے احتیاط بھی کی اور کروائی بھی۔ ان دنوں میں شکر ادا کرنا اور کم میں بھی گزارا کرنا سیکھا۔ بڑے سائز کی صابن کی ٹکیہ جو پہلے دو دن میں ختم ہوتی تھی، وہ ایک دن میں ہی ختم ہوتی تھی کہ ہاتھوں کو بار بار ہی دھونا تھا، ہاہاہا۔ بچوں اور شوہر سے کہا کہ بہت کرلیا تم لوگوں نے آرام، اب تم کرو گے کام اور میں کروں گی آرام، تو بہنوں! یہ ہیں یہ ہیں میری پیارے کورونا وائرس کے ساتھ گھٹی

میٹھی اور کڑوی یادیں۔

(3) میرے ذہن میں یہ پلان ہے کہ ہر ماہ رسالوں میں شرکت کروں گی۔ اپنے بچوں کے ساتھ اور اپنے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ اچھا رہنے اور اپنے فرائض پورے کرنے کی کوشش کروں گی۔ کمیٹی بھی ڈالوں گی تاکہ گھر کی چیزیں مزید اچھی ہوں۔ نماز و قرآن و نوافل پر بھی توجہ دینی ہے، بھئی۔

ریحانہ چوہدری......مدو کے رندھیر باگڑیاں

(1) سال شروع ہوا تو وہ حساب تھا کہ "سر منڈاتے ہی اولے پڑے" یہ سال اپنے ساتھ ایک ایسی وبا کو لے کے آیا جس نے آناً فاناً پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کرۂ ارض پر پہلی بار ایسا ہوا کہ مسجد، مکتب، کاروباری مراکز سب کچھ بند، ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ اپنے پسندیدہ رسالہ جات سے پہلی مرتبہ اتنے طویل عرصے کی جدائی برداشت کرنا پڑی۔ آخر طویل انتظار کے بعد تین ماہ کا ڈائجسٹ اکٹھا ملا تو ساتھ ہی ہمیں اسی تاریخ ساز شمارے سے بحیثیت مصنفہ کے اسٹارٹ تھرو ملا۔ جس کی بہت ہی خوشی ہوئی۔ ارسلان اور ارجمند کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ڈگریز مکمل کرنے کا موقع دیا۔ سارہ نے قرآن پاک ناظرہ مکمل کیا اور ماہ نور کی عملی کاوشوں نے اللہ کے کرم سے ہمیں اس سخت دور سے آسانی سے نکلنے میں مدد کی۔ آپا جی کے اکلوتے بیٹے سکندر مظفر کی شادی خانہ آبادی ہوئی۔

سو دھوپ چھاؤں جیسا یہ سال اپنے سارے عکس وقت کے آئینے میں دکھاتا ہوا بالآخر اختتام پذیر ہوا کہ شکر ہے وقت جیسا بھی ہو، آخر گزر ہی جاتا ہے مگر جن جن پہ گزرتا ہے، یہ وہی جانتے ہیں۔

(2) وقت گزرا تو ضرور مگر اس کے اثرات بہت تلخ تھے۔ ہم جو نفسا نفسی کے عالم میں اللہ کو تقریباً فراموش کیے ہوئے تھے تو اللہ نے بتا دیا کہ اب بھی سارا اختیار تو میرے پاس ہی ہے۔" صفائی نصف

ایمان" ہے اس کا اعتراف بھی پوری دنیا نے کیا۔ وضو کی برکت کا اندازہ ہوا۔ آنا جانا بہت کم کیا تو بہت سے اپنے اس بات سے خفا بھی ہوئے۔

الفاظ ہی اوڑھنا بچھونا ہیں، ان ہی سے کھیلتے رہے۔ ان ہی سے دکھ سکھ کہتے رہے۔ اپنے باغیچے میں موسمی سبزیوں کی کاشت کی، ان کی نگہداشت، بچوں کے ملبوسات سیے۔ ان کے لیے ہاتھوں سے سویاں بنائیں۔ بچوں کے ساتھ پہلی مرتبہ اتنا وقت گزارنے کا موقع ملا۔ اب آج کل بھی ارسلان اور عرفان صاحب باہر جاتے ہیں اور ہم ماں بیٹیاں گھر میں ہوتی ہیں کہ ایک مرتبہ پھر تعلیمی اداروں میں تعلیمی سرگرمیاں اسمارٹ لیول پر معطل ہیں۔

لاک ڈاؤن میں اللہ اور بچوں سے بہت قریب ہونے کا موقع ملا ہے۔

(3) نئے سال کے شروع ہونے پر اس دعا سے آغاز کریں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس نادیدہ بلا کے پنجے سے آزاد فرمائے۔

بھئی ہم کوئی تالیہ مراد تو ہیں نہیں کہ ہمارے پاس پلان اے، بی، سی کا ڈھیر ہو ہم تو راضی بہ رضا رہنے والے لوگ ہیں۔ صابر، شاکر، چاہتوں کی سرزمین پر خواہشوں کے بیج بونے والے۔ وہی کریں گے جو ہمارے بس میں ہے بقول شاعر "وفا کریں گے، نبھائیں گے، بات مانیں گے۔"

نئے سال میں کوشش یہ کروں گی کہ میری کسی بات سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ ایک چھوٹی دعا ہے۔

بارے دنیا میں رہو غم زدہ کہ شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

شائستہ جاوید...... عائشہ منزل کراچی

(1) جی ہاں جناب 2020 واقعی مشکل ترین سال تھا۔ جس کو بھی دیکھو ہر شخص پریشان تھا۔ ہر ایک کی زبان پر بس کرونا...... کرونا...... کرونا تھا۔ کسی سے ملتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ ہر کوئی دیسی نسخے، ترکیبیں بتاتا رہتا۔ شادیوں اور اموات میں جانا بھی کم کم ہو گیا۔ اب کرونا کی دوسری لہر آ گئی پھر سے وہی خوف و ہراس، خطرات، نسخے اف۔

(2) لاک ڈاؤن میں وقت تو جیسے تھم سا گیا تھا۔ اسکول بند، آفس بند، شاپنگ مال۔ محلے کی دکانیں بھی بند۔ ہر چیز پر گویا سکوت طاری تھا۔ بچے اور میاں جی گھر پر۔ تین ٹائم کی جگہ پانچ ٹائم کھانا، جوس، ملک شیک، چائے وہ الگ نئی نئی ڈشیں بن رہی ہیں کبھی بچوں کی فرمائش کبھی ہزبینڈ کی اف...... رمضان میں اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو چودہ قسم کے پکوڑے بنائے ہوں گے۔ سحری میں نت نئی چیزیں وہ الگ کہانی ہے۔ ہاں مگر ایک چیز سے بہت دکھ ہوا جب تراویح اور جمعے کی نمازیں بھی گھر میں پڑھیں۔ یہ لمحہ سخت اذیت ناک تھا۔ عید تو بھلائے نہیں بھولتی جب نہ کوئی آیا نہ کوئی گیا عجیب سونا سونا دن تھا۔

رہی اچھے کی بات تو ہاں بہت سے کام کیے ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کی۔ فون پر دوستوں سے لمبی لمبی گپ شپ بھی کی۔ ہاں لاک ڈاؤن سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ لوگوں نے سادگی سے شادیاں کیں۔ جس سے سفید پوش لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔

(3) سب سے پہلے تو نئے سال کی آمد پر اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ پاک سب کے لیے خیر و عافیت، سکون صحت، خوشی امن و امان کا پیغام لے کر آئے (آمین) رئیس امروہی (شاعر) کیا خوب کہہ گئے ہیں کہ......

جیون ایسا نہ ہو کہ جی نہ سکوں
زخم اتنے نہ ہوں کہ سی نہ سکوں
ساقی وقت سال نو کی شراب
اتنی کڑوی نہ ہو کہ پی نہ سکوں

لاک ڈاؤن نے تو ہمیں شیف ہی بنا ڈالا، یوٹیوب سے نئی نئی ریسیپی سیکھیں، ہم تو سچ مچ کے شیف بن گئے۔ مزے کے کھانے بنائے (ہماری نظر میں گھر والوں کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں ہاہاہا)

پلان تو بہت بڑے بڑے ہیں فی الحال تو یہ ہے کہ آن لائن لڑکیوں کو گوٹا جیولری پینٹنگ (وغیرہ وغیرہ سکھا کر ان کو ہنر مند بنایا جائے تا کہ وہ گھر بیٹھے آمدنی میں اضافہ کر سکیں اور گھر والوں کی ہیلپ کریں اس کے علاوہ گزشتہ بیس سال سے میچ میکنگ کر رہی ہوں (الحمد للہ)

مریم انصاری...... بھاول پور

(1) زندگی نے انوکھا رنگ دکھایا۔ ماسک کا استعمال ناگزیر، ایک دوسرے کو خوف کی نگاہ سے دیکھنا۔ گویا نفسیاتی مریض بن جانے میں ہی بقا ہے۔ ہر فرد ایک دائرے میں مقید ہو کر رہ گیا مضطرب، بے قرار۔

بہت قیمتی جانیں ہم کھو بیٹھے...... میرا اپنا بھانجا "عمر" اس وبا کی نذر ہو گیا۔ نوجوان، جس کی شادی کو محض ایک سال ہوا تھا۔ بے حد مشکل، بہت مشکل سال۔ یکسانیت، فراغت، وحشت، بے یقینی، اللہ کی پناہ!!

(2) لاک ڈاؤن نے بے روزگاری کے در وا کر دیے۔ پہیہ جام ہوا۔ ادارے بند ہوئے۔ گلیاں سونی ہو گئیں۔ چولہے ٹھنڈے پڑ گئے۔ دل درد سے لبریز ہو گیا۔ ایسے میں اللہ کے دیے ہوئے مال کو، اللہ ہی کی راہ میں تقسیم کیا۔

دعا ہے اس معتبر، پیاری ہستی، میرے ابا جان کے لیے جن کے سائے سے میں بچپن ہی سے محروم ہوئی، ان ہی کے دیے ہوئے علم، شعور، احساس کی بدولت میں نے کار خیر میں حصہ ڈالا۔ سمندر میں قطرے کی مانند یا صحرا میں ایک ذرہ!!!

(3) میں کیا؟ میری اوقات کیا؟؟ بہر حال آنکھوں میں خواب سجے ہیں۔ خوابوں کی تعبیر و تکمیل کا

انحصار ہے زندگی پر، جسمانی صحت پر، سوشل ہیلتھ، مینٹل ہیلتھ پر، مطالعہ میری عادت، گھومنا میری آرزو اور لکھنا میرا خواب۔

شاہین سلمیٰ ...... نارتھ کراچی

(1) میرے لیے یہ سال کرونا کی خاطر مدارت کرتے گزرا۔ ماسی کی دو ماہ کی چھٹی کرنی پڑی کرونا کی وجہ سے...... تنخواہ ماسی کو دی، ماسی کا کام خود کیا۔ جھاڑو پونچھا، برتنوں کی صفائی۔

(2) لاک ڈاؤن میں زندگی بہت شاندار گزری۔ اسی طرح کہ دنیا سے رغبت ختم ہوگئی۔ مالک حقیقی کے زیادہ قریب ہوگئے۔ یہ سچائی سامنے آگئی کہ زندگی اللہ کی دی ہوئی بہت بڑی نعمت ہے۔

(3) مثبت کام یہ کیا کہ عید کی شاپنگ نہیں کی۔ جو گھر میں کپڑا رکھا ہوا تھا اسی کو سلوا کر عید منالی سادگی کے ساتھ۔ عید کی شاپنگ کی رقم غریبوں میں تقسیم کردی۔

مریم خان ...... پھلروان سرگودھا

(1) اس سال جو بات سب سے زیادہ مثبت رہی، وہ یہ کہ لوگ دین کے نزدیک آگئے۔ پردہ جو خواتین پر فرض ہے۔ ماسک کی صورت میں میڈیکلی طور پر ضرورت بن گیا۔

بہت زیادہ لوگوں کو مشکل حالات سے گزرنا پڑا کسی کا روزگار متاثر ہوا۔ کوئی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ کوئی تو جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا۔ بچوں کی اسٹڈیز بہت زیادہ متاثر ہوئیں۔ ملک و بیرون ملک ٹڈیوں کی یلغار بھی ان مشکلات میں اضافہ کی وجہ بنی فصلیں متاثر ہوئیں، ساتھ ساتھ کسانوں کو جو نقصان کا سامنا ہوا وہ الگ۔

مہنگائی اپنی تمام حدود و قیود توڑ کر آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ حکمران اپنی ضد اور انا کے بے حس بتوں کی پوجا میں مصروف۔ عوام کی تمام کشتیاں ڈوبتی نظر آئیں۔ کہ غریب کو ادرک ہرا دھنیا جیسی بے مول چیز بھی مہنگے داموں پر ملی۔

گھریلو طور پر اللہ پاک کا شکر ہے ہمیں مشکلات نہیں ہوئیں کیونکہ ہماری کریانہ کی ماشاءاللہ بڑی سی دکان ہے۔ کریانہ کی دکانیں لاک ڈاؤن میں بند نہیں ہوئیں، سب تقریبات تقریباً ہمارے شہر میں اسی طرح چلتی رہیں جس طرح عام دنوں میں۔ بس ہم نے بچوں کو گھر تک محدود رکھا گھر سے باہر نہیں جانے دیا۔

(2) لاک ڈاؤن میں وقت ایسے گزرا کہ رات دیر تک جاگے اور دیر تک سوئے کیونکہ بچوں نے اسکول جانا نہیں اور رات کو کہتے کہتے بھی سونا نہیں۔ ”ماما! ابھی تو کھیلا ہے ابھی نیند نہیں آرہی۔“ یا پھر ”ماما! کون سا اسکول جانا ہے۔ سو بھی جائیں گے۔“

تو میں بتا رہی تھی کہ ہمارے شہر میں لاک ڈاؤن کا کوئی خاص پتا نہیں چلا ڈھونڈے سے بھی کیونکہ بچے شہر کے بیچوں بیچ بنے تین بڑے بڑے چوک (جن کو مختلف سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے) کھیلتے اور بڑے سب اپنی دکانوں کے شٹر بند کیے (بھئی پولیس کے ڈر سے) دکانوں کے باہر اور اندر جی ہاں اندر گاہک اپنی شاپنگ کرتے وہ ایسے کہ باہر سے تالا لگایا اور اندر سے گاہک کو فارغ کرکے باہر نگرانی کرنے والے کو اشارہ دیا اور تالا کھول کر گاہک اور دکاندار دونوں باہر، دوبارہ تالا لگالیا اور بیٹھ گئے انتظار میں، بھئی کسی دوبارہ سے آنے والے گاہک کے۔

تو یہ تھی ہمارے شہر کی لاک ڈاؤن میں صورتحال جبکہ یہاں کے تمام لوگ ایک دوسرے کو ناموں سے اس طرح جانتے ہیں جیسے گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کو۔ اور کرونا کا تو یہاں سے گزر بھی نہیں ہوا۔ (الحمدللہ)

مثبت کام تو یہی کیا کہ خواتین اور کرن میں خطوط لکھے، کوئی شائع ہوا، کوئی نہیں۔ سروے کے جوابات دیے، جون 2020 میں۔ اس کے علاوہ بہت سی کتابیں پڑھیں، اکتوبر میں لاہور کی سیر کی،

جنوری 2021
کے شمارے کی ایک جھلک

جنوری 2021
کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

- ”عمر یسرا“ حسنہ حسین کا مکمل ناول،
- ”شب آرزو“ نوشین فیاض کا مکمل ناول،
- ”میری راہیں تیرے تک“ عائشہ نصیر احمد کا مکمل ناول،
- ”احساس“ حمیرا شفیع کا ناولٹ،
- تنزیلہ ریاض اور رخسانہ نگار عدنان کے ناول،
- سلویٰ علی بٹ، افشین نعیم، نورین زہرا، فرح انیس، قرۃ العین خرم ہاشمی اور مریم شہزاد کے افسانے،
- مقبول مصنفات العزیز ”ہند من“ کے خواست باتیں،
- ”دستک“ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ قارئین کے تجربات،
- نئے سال کے موقع پر قارئین سے سروے،
- ”پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں“ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، آپ کے دلچسپ تبصرے، ہمارے جواب، تاریخ کے جھروکوں سے،
- باتوں سے خوشبو آئے، آئینہ خانے میں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع جنوری 2021 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

اس کا احوال دوبارہ بھی شامل رسالہ کریں گے۔

(3) یہی پلان ہیں کہ اس آنے والے سال میں ان شاء اللہ ایک اچھی مصنفہ کے طور پر ابھرنا ہے۔ اللہ پاک اس سال کو ہمارے لیے خوشیوں، آسانیوں اور راحتوں کا سال بنائے (آمین)

عفت اقبال......حیدر آباد

(1) آہ 2020 حزن ملال کا سال۔ خوف وہراس کا سال۔ بے یقینی بے اعتباری کا سال۔ اللہ نے بتادیا کہ اے میرے بندوں تم کتنی بھی ترقی کرلو میرے سامنے عاجز ہو۔

گزرا سال اپنے ساتھ کتنی معتبر ہستیاں بڑے بڑے علماء اور نہ جانے کتنے پیاروں کو لے گیا۔ پورا سال ہمارا بھی اس احساس کے ساتھ گزرا کہ اللہ نے لگامیں کھینچ رکھی ہیں۔ مسجدوں میں نمازی محدود ہوئے، جماعت سے نماز پر پابندی ہوئی۔ دل خون کے آنسو رویا۔ یہی دعا کی کہ اللہ آزمائش کے قابل نہیں۔ رحم فرما۔

(2) لاک ڈاؤن کا وقت بھی ایک پہیلی کی طرح گزرا، کام بھی نہیں۔ فرصت بھی نہیں۔ گھر کے سب افراد ایک ساتھ ہیں۔ اچھا احساس رہا اور بے زاری بھی رہی۔ بے روزگاری ہوئی۔ کاروبار ٹھپ ہوئے۔ آمدنی کم ہوئی مگر واہ میرے مولیٰ اس دوران اپنے بندوں کو کھلایا پلایا بہت اچھا۔

اچھا کام تو رب کی توفیق سے یہ کیا اجتماعی پڑھنا پڑھانا ہوا۔ دعاؤں کا دورانیہ بڑھا۔

دوسرا اچھا کام لاک ڈاؤن کا فائدہ اٹھایا۔ سادگی سے بیٹے کے فرض سے فارغ ہوئے۔ بقرعید پر رشتہ طے کیا اور دو ماہ بعد رخصتی بھی۔ اللہ کا شکر بہت سارے مسئلے مسائل سے اللہ نے بچالیا۔

(3) کوشش ہے کہ آنے والے وقت میں کچھ اچھا کر جائیں، بیٹوں کی اچھی تعلیم و تربیت ہو جائے۔ بچیاں قرآن پڑھنے آتی ہیں دعا ہے کہ اللہ ان کی بھی تعلیم و تربیت کرادے، معاشرے کی بہتری میں کچھ ہمارا بھی حصہ ہوجائے۔

ہمارے پلان......نہیں نہیں، گزرے سال نے سمجھادیا کوئی پلان نہیں۔ بس اچھی امید دعاؤں کے ساتھ۔

صفیہ مہر......خان پور

(1) 2020 میں مہنگائی عروج پر رہی۔ ہم زمین دار لوگ ہیں۔ پھر بھی مہنگائی کے سمندر میں ڈوبے لیکن بچ گئے۔ ہاں موت سی اذیت ضرور ملی۔

زمینیں ہونے کی وجہ سے اپنی سبزیاں اگاتے ہیں۔ گاؤں میں رہن سہن سادہ ہوتا ہے۔ کم قیمت سوٹ میں گزارا ہوجاتا ہے یہاں مقابلہ کم ہوتا ہے یا شاید کہ ہم ہی سادہ ہیں۔ سادہ پہنتے رہے۔ سادہ کھاتے رہے تو مشکل ترین سال بھی گزر گیا۔ مہنگائی تو آسمان سے ملنے کو ہے۔

لاک ڈاؤن میں کام بہت بڑھ گئے۔ بہن، بھائی کالجوں سے، ہوسٹل سے گھر آگئے۔ ہر طرف بکھراوا، ترتیب سے چیزیں رکھتے رکھتے میں ہلاک ہوگئی۔ لیکن اچھا کام یا مثبت یہ کہ پہلے چیخ چلا کر کام نبٹاتی تھی لیکن اب خاموشی سے کام کرجاتی تھی۔ کام ختم کر کے چائے بنا کر بہن بھائیوں میں تقسیم کردیتی، لاک ڈاؤن ہم بہن بھائیوں میں دوستی گہری کر گیا۔

پھر دوسرا یہ کہ میں نے سلائی سیکھی۔ فراغت ہوتی تو مشین لے کر بیٹھ جاتی۔ ہنر بھی آگیا۔ پیسوں کی بھی بچت کرلیتی، اماں، بہنوں اور اپنے سوٹ سلائی کیے پورا سال، ہاتھ میں پختگی آتی گئی۔ اتنی مہنگائی میں سلائی بچالی۔ دوسروں سے سوٹ سلوانے سے بچ گئے۔ کیسا۔ مثبت کام ہے نا جو میں نے کیا، اب آپ کہیں گی سلائی کرنا بھی مثبت کام ہے کیا؟ (بالکل)

(2) نیا سال سب کو ایکسائیٹڈ کرتا ہے لیکن میں زندگی کا اک سال کم ہونے پر مایوس ہوجاتی ہوں۔ ویسے بھی مجھے آنے والے سے بیتے سال

زیادہ آسودہ لگتے ہیں۔ لیکن پھر بھی نئے سال کے کچھ پلان تو ہوتے ہی ہیں۔

میں نئے سال میں آپ کے تینوں رسالوں میں لکھنا چاہتی ہوں کچھ افسانے، کچھ ناولٹ، ناول، اس کے علاوہ اپنے والدین کی بہترین اور فرماں بردار بیٹی بننے کے پورے سو نمبر لینا چاہوں گی اس سال، اس کے علاوہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس سال پورا پاکستان دیکھوں وزٹ کروں ہر پکنک پوائنٹ کا۔

صفیہ منیر......پشاور

(1) صرف کہتے ہیں نہیں بلکہ سچ میں یہ سال بہت مشکل تھا صرف مشکل نہیں مشکل ترین تھا۔ بہت آزمائشوں سے گزرنا پڑا، اللہ نے سب آسان کیں مگر ابھی بھی سوچ کر جھرجھری سی آجاتی ہے۔

(2) لاک ڈاؤن سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا بس گھر کے مردوں کے لیے دل کڑھتا تھا کیونکہ کاروبار بند ہونے سے گھر کے خرچ تو نہیں رکتے، سامان زندگی تو ہمیشہ چاہیے ہوتا ہے تو مرد بے چارے تو گھر بیٹھے گھروں کو چلا رہے تھے تو ان کے لیے دکھ ہوتا تھا اور ہم تو ویسے بھی زیادہ تر گھر میں رہتے تھے تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہاں لاک ڈاؤن کی وجہ سے ڈائجسٹ ناغہ (جو پہلے کبھی نہیں ہوا) ہوا اس سے تھوڑی مشکل تھی لیکن وہ بھی گزر گیا اور مثبت کام بس پرانی روٹین تھی۔

(3) 27 دسمبر کو بھائی کی شادی ہے تو فی الحال اس کی پلاننگز ہو رہی ہیں کیونکہ وہ ہم چاروں بہن بھائیوں میں لاڈلا اور چھوٹا بھائی ہے اور میرے لیے تو وہ بیٹا ہے کیونکہ امی کے انتقال کے بعد خود کم عمر ہوتے بھی اس کو سنبھالا ہے۔ بس دعا ہے اللہ ہمیشہ اسے خوش رکھے۔

شہزادی نذیر......ساہیوال

(1) جی ہاں میں شہزادی نذیر ہوں۔ غریب محنت کش گھرانے میں پیدا ہوئی۔ مگر ماں باپ نے پیار سے میرا نام شہزادی رکھ دیا۔ گزشتہ

آٹھ سال سے ایک ڈاکٹر باجی کے گھر کام کرتی ہوں۔ اسی طرح پڑھنا لکھنا باجیوں سے سیکھا اور ان جیسے گھروں سے ہی ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ابھی بھی باجی منگوا دیتی ہیں میرا شوق دیکھ کر۔ بہر حال 2020ء کے بارے میں سنا تو کافی ہے کہ مشکل سال گزرا۔ لیکن ہم جیسے محنت کش لوگوں کی زندگی میں اس سال میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ لاک ڈاؤن میں کام سے کچھ دن چھٹی ملی تو گھر میں بیٹھ کر لوگوں کے کپڑے سلائی کیے۔ پھر باجی نے دوبارہ کام پر بلا لیا۔

(2) لاک ڈاؤن کے دوران باجی کے گھر کچھ دعائیں یاد کیں۔ پیارے نبیؐ کی سیرت کی کتاب کافی حد تک پڑھی۔

(3) اگلے سال کے بارے میں سوچا ہے کہ قرآن مجید تجوید اور قرات سے سیکھنا شروع کیا ہے ڈاکٹر باجی کے گھر۔ ان شاء اللہ اس کو مکمل کرنا ہے اور سلائی کڑھائی میں مہارت حاصل کرنی ہے۔

نوال افضل گھمن ...... کراچی

(1) سال 2020ء ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ عوام بے چارے مہنگائی کے جن کے ہاتھوں ذلت و رسوائی کا شکار ہیں۔ ایک گھر فیملی کو چلانا اتنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ جن کے زیادہ مسائل اور کم وسائل ہیں۔ ان کی نیندیں حرام ہیں۔ ریاست مدینہ، مدینہ والے ہی جانیں کب قائم ہوگی۔

(2) لاک ڈاؤن کے دنوں میں لاہور میں تھے۔ فلائٹس بند، ٹرین بند، بذریعہ روڈ ٹیکسی کا کرایہ 37 ہزار دے کر کراچی پہنچے۔ پہلا روزہ ایک مہینہ پرانی سبزی بھنڈی کو پکا کر رکھا۔ (شکر اللہ کا) ان دنوں مستنصر حسین تارڑ کے کافی سفرنامے اور کتابیں پڑھیں۔

منہ دل کعبہ شریف۔ پیار کا پہلا شہر۔ قربت مرگ میں محبت۔ پاک سرائے۔ ماسکو کی سفید راتیں۔ تارڑ صاحب بہت اچھے لکھاری ہیں۔ اور

کھا کھا کر اپنا وزن بڑھایا۔ لاک ڈاؤن زندہ باد، بچے بہت خوش ہیں اسکول بند ہونے کی وجہ سے۔

(3) نئے سال میں ان شاء اللہ تعالیٰ لاہور میں بحریہ ٹاؤن میں اپنا ذاتی گھر تعمیر کروانا شروع کرنا ہے آگے اللہ جانے، کیا بنتا ہے۔

عافیہ ریاض ...... ساہیوال

(1) 2020ء باقی سالوں سے کافی مشکل رہا۔ خوف و ہراس، اپنوں سے دوری۔ تنہائی کا خوف۔ عیدین کی نمازوں میں بہت کم لوگ گئے اور حرمین شریفین کی حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا تھا حتیٰ کہ حج جیسا عظیم رکن بھی اس کی نذر ہو گیا۔

(2) کچھ دین دار لوگوں کی صحبت سے، بہت سی مفید دعائیں جو مسنون تھیں، وہ سیکھیں اور اللہ کے قریب ہونے والے اعمال کرنے کا موقع ملا۔ اللہ کی رحمت سے کچھ مستحق لوگوں کو ماہانہ بنیاد پر راشن بھی لے کر دیا۔ میں گائنا کولوجسٹ ہوں۔ کورونا سے متاثر مریض بھی دیکھے اور اپنی ذمہ داری کو نبھانے کی کوشش کی۔ لاک ڈاؤن کا فائدہ یہ ہوا کہ بلا ضرورت باہر نکلنا بند ہو گیا۔

(3) اگلے سال کو زیادہ مثبت اور تعمیری کاموں میں گزارنے کا ارادہ ہے ان شاء اللہ جس میں دینی کتابوں کا مطالعہ اور عبادات کی بہتر روٹین اور بچوں کی بہتر تربیت، ساس سسر اور میاں کی خدمت اور اپنے پروفیشن میں بھی تعمیری کام کرنا شامل ہے۔

خدیجہ اکرم ...... کراچی

(1) 2020ء بہت ہی مشکل وقت تھا اور ابھی بھی ہے۔ کیونکہ مہنگائی نے لوگوں کو بہت پریشان کیا ہوا ہے۔ ہر بندہ ہی پریشان ہے کوئی قانون ہے نہ کوئی اصول۔ حالات ہی اس طرح کے ہیں کہ نہ دن کو سکون ہے نہ رات کو۔ کاروبار پر اثر پڑتا ہے تو ظاہر ہے پورا گھر ہی پریشان ہوتا

ہے، اوپر سے بجلی کے بل، گھر کا بل ہی سات ہزار سے بھی اوپر آنے لگا ہے حالانکہ کبھی فالتو لائٹیں نہیں جلائیں۔ کبھی اضافی پنکھے نہیں چلائے۔ کارخانے کا بل 80 ہزار آ رہا ہے تو سکون کہاں سے آئے گا۔ بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔

(2) لاک ڈاؤن سے پہلے بیٹی کی شادی رکھی 11 اپریل وہ بھی ملتوی کرنا پڑی۔ کارڈ چھپوائے ہوئے۔ ہال بک کروایا ہوا تھا۔ فرنیچر بننے کے لیے دیا ہوا۔ غرض ہر طرح سے تیاری مکمل تھی سب ادھورا رہ گیا۔

پھر سارے گھر والوں کی خدمتوں میں وقت گزرا۔ یہ پکا لو یہ کھا لو، بچے لڈو لے آئے۔ سارا سارا دن بس لڈو کھیلتے رہنا۔ یا موبائل پر کچھ دیکھ لینا (لڈو کھیلنا مجبوری تھی کہ شوہر صاحب کہتے کہ ٹائم پاس نہیں ہو رہا۔ چلو ایک گیم کھیل لو۔ چھوٹی بیٹی میں اور میرے شوہر لگے رہتے)

باقی رسالوں کے بغیر سب کچھ ادھورا تھا۔ لاک ڈاؤن اللہ اللہ کر کے کھلا تو بچے کو بھگایا کہ جا ؤ رسالے کا پتا کر کے آؤ لیکن نہ ملا، کافی دن کے بعد چکر لگا لگا کر ملا تو سکون کا سانس لیا۔ ایسا لگتا ہے رسالوں کے بغیر زندگی ہی مکمل نہیں ہے۔ کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ابھی بھی پچھلے دنوں نومبر کے رسالے نہیں مل رہے تھے تو میں نے رسالے میں سے نمبر دیکھ کر رسالے بک کروائے سال بھر کے لیے۔ اب گھر آ جاتے ہیں تو سکون ہوا ہے۔

مثبت کام یہی کیا ہے کہ کسی بھی فقیر کو کبھی خالی ہاتھ نہیں بھیجا۔ حتی الامکان کچھ نہ کچھ مدد ہی کی ہے کہ لاک ڈاؤن میں پتا نہیں بے چارے کیسے گزارہ کر رہے ہوں گے۔

(3) پلان تو انسان بہت سے ترتیب دیتا ہے اصل پلانر تو اللہ تعالیٰ ہے۔ کتنی مہلت دے نہ دے۔ ارادہ تو یہی ہے کہ کوئی نہ کوئی کام سیکھ لوں۔ مجھے فیشن ڈیزائننگ کا بہت شوق ہے لیکن یہ نہیں پتا کہ یہ کہاں

سے اور کیسے کرتے ہیں۔ کسی کو اس بارے میں پتا ہو تو ضرور بتایئے۔

ثریا راجپوت ...... جاتری شریف

(1) بالکل ٹھیک 2020ء صرف لکھتے ہوئے ہی مزا آتا تھا۔ دنیا میں خوف و ہراس اتنا کہ کسی مہمان کو دیکھ کر چہرہ خوف سے سفید پڑ جاتا تھا۔ بچوں کی پڑھائی خراب ہوگئی۔ سال ضائع ہو گیا اور اوپر سے مہنگائی نے جو کمر توڑی سو الگ۔ حکومت تو گویا عزرائیل کا دوسرا روپ ہے۔ عوام کو تڑپا تڑپا کر جان نکال رہی ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوا میرے ساتھ۔ میری دنیا نماز قرآن اور مطالعہ ہے۔ میں اکیلی بہن ہوں، گھر کے کام سارے میرے ذمہ تھے۔ میں ان میں الجھی رہتی۔ اور پھر 2019ء نومبر میں بھائیوں کی شادی آ گئی تو میں اتنا الجھ گئی کام کام کام ...... سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی۔ رات تک اس قدر تھکاوٹ ہو جاتی کہ بستر پر گر ایسے سو جاتی گویا موت آ گئی مجھے۔ جس کروٹ سوتی صبح اس کروٹ ہی اٹھتی۔ شادی کے ہنگاموں میں گھر کی تعمیر بھی جاری تھی۔ مستریوں کی روٹیاں بنا بنا کر بس مت پوچھو

کوئی ہیلپ کرنے والا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس دوران میں نے ایک بات محسوس کی کہ میری فی میل کزن مجھ سے کھنچی کھنچی سی رہتی ہیں۔ میں ان سے بات کرنے کی کوشش بھی کرتیں لیکن وہ اس طرح پوز کرتی گویا مجھے سنا ہی نہ ہو۔ آپس میں خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتیں۔

شادی گزر گئی اور مجھے محسوس ہوا کہ جو شادی سے پہلے کام تھا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ کام تو اب اسٹارٹ ہوا ہے۔ گھر سمیٹتے سمیٹتے میں آدھ موئی ہوگئی۔ بارہ دن بعد بھابھیوں کی کھیر پکائی کی رسم ہوئی تو میری جان کو تھوڑا سکون ملا۔

دونوں بھابھیوں نے کچھ کام سنبھالا۔ گھر کی صفائی، برتن دھونا، کپڑے دھونا اور روزانہ راشن منگوانا میرے ذمے آ گئے پکے پکے...... شادی کے بعد جو مجھے انعام ملا۔ وہ کمزوری کے باعث بخار تھا۔ میں اپنے حصے کا کام کرتی اور بستر میں گھس جاتی۔ میرے بارے میں کون کیا کہہ رہا ہے کزنز کے درمیان میرے خلاف کیا کھچڑی پک رہی۔ میں مکمل بے خبر تھی۔

پھر 6 فروری 2020ء میں میری بڑی کزن نے یہ افواہ پھیلا دی کہ میرا رویہ اپنی بھابھیوں کے ساتھ ٹھیک نہیں۔ باقی سب کو بھی ساتھ ملا لیا اور بڑی بھابھی کی میرے بارے میں خاموشی نے اس بات کو اتنی ہوا دی کہ میرا بڑا بھائی میدان میں اتر آیا اور اللہ پاک کی قسم مجھے پورے دس ماہ کے بعد آج بھی اپنے بھائی کے الفاظ یاد آتے ہیں تو دل کرتا ہے کہ میں مر جاؤں......

بھائی نے کہا تھا "یہ میری بیوی پر ظلم کرتی ہے۔"

2020ء میں الزامات کی ایک بوچھاڑ تھی جو مجھ پر ہر طرف سے کر دی گئی۔ کزنز نے آنا چھوڑ دیا۔ میں بیمار تو تھی ہی تنہائی کا بھی شکار ہوگئی۔ نماز قرآن کی پابندی تو میں بہت پہلے سے کرتی ہوں۔ میں نے مزید اللہ سے لو لگا لی۔ پھر ایک اور الزام کہ گڑیا دکھاوے کے لیے یہ سب کرتی ہے۔ اب میں فرض نماز کمرے میں بند ہو کر ادا کرتی ہوں اور قرآن بھی چھپ کر پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

ابھی دسمبر میں ہمارا زمین پر عیسائیوں سے جھگڑا ہوا۔ زمین ہمارے نام ہے عیسائی قوم کو دس کنال پر چھوٹے چھوٹے گھر بنا کر دیئے ہوئے تھے اب۔ وہ کہہ رہے ہیں ہم نے یہ زمین چھوڑنی ہی نہیں تو اس پر مقدمہ چل رہا ہے ہم بیٹھ کر سب درود پڑھتے تھے تاکہ مسئلہ حل ہو جائے۔ کافی ٹینشن والا ماحول تھا تو اس ماحول میں ہنسنا تو بنتا ہی نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہہ دیا۔ دعا کر لیں۔ باجی بولیں۔ "ہم دکھاوا نہیں کرتے اور جو بیٹھ کر ہی پڑھے، وہ ہی پڑھنا نہیں ہوتا۔ ہم چلتے پھرتے بھی پڑھتے رہتے ہیں۔"

مجھے بعد میں پچھتاوا ہوا کہ مجھے کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے باجی سے معافی بھی مانگی لیکن ان کے دل میں عجیب قسم کا حسد ہے۔ یہ تھا میرا 2020ء کہا نا کہ لکھنے کی حد تک ہی اچھا تھا۔

اے زندگی تجھے جینے کے لیے
مجھے بہت بار مرنا پڑا

(2) لاک ڈاؤن کا تجربہ بہت برا رہا۔ میں بہت دعا کرتی تھی کہ ابھی مجھے مت مارنا، خلق خدا مجھ سے خوش نہیں، جب میں نیک ہو جاؤں پھر مارنا میں چھت پر بیٹھ کر ویران سڑک دیکھتی تو سوچتی تھی یا اللہ میں بڑی بس میں کبھی سفر کروں گی بس کرونا ختم کر دے۔ حالات ٹھیک کر دے۔ اصل میں، میں بڑی بس میں سفر نہیں کرتی، مجھے ڈر لگتا ہے۔

(3) یا اللہ میرا نیا سال بہت اچھا ہو...... مجھے بہت سا حوصلہ مل جائے کیونکہ...... کیونکہ دنیا کے بازار میں زندگی کا سب سے قیمتی سکہ حوصلہ ہے۔ میں بہت سا لکھنا چاہتی ہوں۔ ذہن میں پلان تو بہت ہیں لیکن میں چاہتی ہوں تھوڑی ماں کی فرماں بردار ہو جاؤں کیونکہ جو زیادہ عزت دار ہے، وہی حق دار ہے۔

☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ 840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030"، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو 500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک 500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ 18,000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 20,500 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

نرمین اسکول میں پڑھنے والی ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کا باپ شکر قندی اور مونگ پھلی کی ریڑھی لگاتا ہے۔ بیوی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی دکان منشی اکرم کے پاس گروی رکھتا ہے اور سود بھرتا ہے۔

نرمین اور افشاں اسکول سے واپسی پر باتیں کرتی آتی ہیں، راستے میں مراد کا رکشہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کر کہتی ہے، میں تو رکشہ چلاؤں گی۔ اسی وقت سامنے والے گھر کا دروازہ کھلتا ہے، مراد کے باہر نکلنے پر دونوں بھاگ جاتی ہیں۔ نرمین اپنا بیگ بھول جاتی ہے۔

گھر پہنچ کر بیگ کا خیال آتا ہے۔ وہ ماں سے کہتی ہے کہ کتا پیچھے لگ گیا تھا، بیگ گر گیا راستے میں۔ فرخ کے ہمراہ ثمینہ اسے بیگ لینے بھیجتی ہے لیکن وہاں رکشہ نہیں ہوتا۔ فرخ کہتا ہے کہ وہ لا دے گا، رکشہ والا اس کا استاد ہے۔

مراد اس کا بیگ گھر دے جاتا ہے لیکن بیگ کھولنے پر اسے نرمین کا نام پتا چل جاتا ہے۔ وہ نرمین کے بہن بھائی کو پیسے دیتا ہے مونگ پھلی کھانے کے لیے۔

وہ فرخ کے گھر جاتی ہے۔ فرخ کے کمرے کے دروازے میں آٹومیٹک لاک لگا ہوا ہے، وہ بند ہو جاتا ہے۔ نرمین ایک دم چیختی ہے۔ ثمرین جو بہن کو بلانے آتی ہے اس کی چیخ سن کر گھر سے باہر نکلتی ہے جہاں خالہ آ رہی تھیں، وہ ان کو بتاتی ہے۔

راحت جبیں

زندگی ہم تجھے گزار آئیں گے

دوسری قسط

''کون جانتا ہے؟ کس کی بات کررہی ہو۔'' بوکھلائی ثمینہ، ثمرین پر جھک گئی۔
''امی، بکواس کررہی ہے۔ مجھے کون جانتا ہوگا۔'' نزمین ماں سے زیادہ بوکھلائی۔
''بول ثمو!......'' ثمینہ نے ثمرین کا بازو جکڑا۔
''کون تھا کس نے پیسے دیے تھے؟'' ماں کا غصہ دیکھ کر ثمرین سہم گئی۔
''پتا نہیں۔''
''اور تم نزمین! تم نے اپنے باپ سے جھوٹ بولا۔'' ماں کا صدمے سے برا حال تھا۔ ان نامساعد حالات میں سارا زور بچوں کی تربیت پر ہی تو تھا۔ کامیاب انسان بنتے ہیں یا نہیں ان کے نصیب، اچھے انسان تو بنا دیں۔
''تو کیا کرتی ابو جی انہیں ڈانٹتے جارہے تھے۔''
''بات سن......'' ثمینہ اس کا بازو پکڑ کر دروازے کے پاس لے گئی۔ کبھی کسی اجنبی سے بات تو نہیں کی۔'' ان کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔
''توبہ...... توبہ امی...... کبھی بھی نہیں۔ اور جب سے چھٹیاں ہوئی ہیں میں تو کبھی گھر سے نکلی ہی نہیں۔ افشاں سے پوچھ لیں۔''
''اپنے بچوں کی گواہی غیروں سے مانگوں گی؟ اعتبار ہے تم پر بس تمہاری کچی پکی عمر سے ڈر لگتا ہے۔''
نزمین کی اڑی اڑی رنگت نے ثمینہ کو اپنا لہجہ نرم کرنے پر مجبور کردیا۔ پھر نجانے کب تک بیٹھی وہ فضہ اور ثمرین کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی رہی۔
کچھ سمجھ میں آتا تھا، کچھ اوپر سے گزرتا رہا۔ مگر وہ زور زور سے اثبات میں سر ہلاتی رہیں۔ لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی۔ کسی غیر سے کچھ نہیں لینا۔
''بات سنو......'' ماں کے جانے کے بعد نزمین نے ثمرین کو پیار سے پاس بلایا۔
''آپا، میں نے کچھ بھی نہیں بتایا......'' ثمرین کو لگا آپا جھانپڑ رسید کرے گی۔
''مجھے پتا ہے آئندہ وہ آدمی دوبارہ ملے تو مجھے ضرور بتانا، لیکن امی کو پتا نہ چلے......'' نزمین کو تجسس نے گھیر لیا تھا۔
''مجھے تو اس کی شکل یاد بھی نہیں۔''
ثمرین کے جواب پر نزمین کا دل سچ مچ جھانپڑ لگانے کو چاہا تھا۔ مگر دروازے پر ہوتی دستک پر بس اسے گھورتی دروازہ کھولنے چلی گئی۔
''کیسی ہو؟ فرخ ہاتھ میں کھیر کی پلیٹ لیے کھڑا تھا۔
''ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہونا ہے۔'' وہ کچھ بیزار سی لگی۔
''تمہارے لیے کھیر لایا ہوں......'' فرخ نے پلیٹ سامنے کی۔ ٹھنڈی میٹھی کھیر دیکھ کر نزمین کا مزاج خوش گوار ہوگیا۔
''اچھا اور باقی میرا منہ دیکھیں گے......'' اس نے اوپر والی پلیٹ ہٹا کر کھیر کا دیدار کیا۔
''تو کیا پوری پتیلی اٹھا لاتا۔'' فرخ نے حیرت سے دریافت کیا۔
''ہاں...... پھر خالہ تمہیں دھو کر رکھ دیتیں......'' وہ کھلکھلائی۔
''مراد بھائی آئے تھے؟''
''کون مراد بھائی اور یہاں کیوں آنے لگا۔'' نزمین بگڑ گئی۔ ابھی ابھی تو ماں کی پیشی بھگتی تھی۔
''کیا ہوا تمہارا بیگ نہیں دے کر گئے......'' فرخ ٹپٹا گیا۔
''اچھا وہ......'' نزمین کو وہ حیران چہرے اور گم صم آنکھوں والا نوجوان یاد آیا۔
(آپ کا نام نزمین فاطمہ ہے)

"ہاں دے گیا تھا۔ بہت ہی بدتمیز انسان ہے۔"
"تمہارے گھر تک بیگ دے گیا اس لیے بدتمیز ہے۔ فرخ کو تاؤ آ گیا۔" تمہاری بھی عقل ٹھکانے نہیں ہے۔"
"تمہیں کیوں غصہ آ رہا ہے۔"
"استاد ہیں میرے......"
"ہیں...... تم نے ان سے رکشہ چلانا سیکھا تھا؟"
"میتھس پڑھاتے تھے۔" اس نے جتایا۔ "معمولی انسان نہیں ہیں۔"
"زمین کچھ اور بھی پوچھتی کہ اچانک اس اجنبی شخص میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ کہ ثمینہ آ گئیں اور فرخ سے سلام دعا کرنے لگیں۔
"چاچا کہاں ہیں؟" فرخ نے صحن کے کونے میں اوندھی سیدھی پڑی ریڑھی کو دیکھا۔
"ہاں بس طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو واپس آ گئے......" ثمینہ نے آہستہ سے بتایا۔

☆☆☆

خدیجہ نے کھیر کے جو حصے نکالے تھے۔ ان میں ایک پلیٹ کم تھی۔
"ایسی بھلکو ہو گئی ہوں کہ حصے پورے نہیں نکالے...... پر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بشارت بھائی کی پلیٹ نکالی تھی۔"
تب ہی فرخ خالی پلیٹیں لیے آ گیا۔
"اماں! اب بس کریں اور کتنے گھروں میں بھیجیں گی۔ صبح سے پورا محلہ گھما ڈالا ہے۔" اس نے بیزاری سے پلیٹیں رکھیں۔
"آہا مل گئی نا...... میں پہلے ہی کہہ رہی تھی۔ نیلے پھولوں والی پلیٹ میں کھیر نکالی تھی۔ میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ بس اب یہ ڈونگا زمین کے گھر دے آؤ۔" انہوں نے ایک ڈونگا اس کی طرف کھسکایا۔ تو فرخ نے نیلے پھولوں والی پلیٹ کو بے چارگی سے دیکھا۔
"وہ تو میں دے آیا تھا۔"
"یہ ایک پلیٹ......" خدیجہ نے سر پیٹ لیا۔ اور اچھی خاصی صلواتیں سنا دیں۔ "اتنا بڑا ٹبر اور ایک پلیٹ کھیر یہ تو داڑھ بھی گیلی نہ ہوئی۔ بس لمبے ہی ہوتے جاؤ عقل ٹخنوں میں ہے۔"
(اچھا اور باقی میرا منہ دیکھیں گے)
ماں کا حساب بڑا پکا تھا۔ ہر گھر میں افراد کے حساب سے کھانا بھجواتی تھیں۔ اپنی جلد بازی پر فرخ خود ہی شرمندہ ہو گیا۔
"میں اب دے آتا ہوں۔"
"رہنے دے...... اب اندھیرا ہو رہا ہے۔ اب جا کر دروازے کھٹکھٹائے گا...... صبح دیکھوں گی۔"
انہوں نے ڈونگا ڈھانپ کر رکھ دیا۔
(پتا نہیں، اس تھوڑی سی کھیر کو سب نے کیسے بانٹا ہو گا)
ثمینہ نے سارے بچوں کو لائن میں کھڑا کر کے ایک ایک چمچہ سب کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ اور آخری دو چمچ زمین کی طرف بڑھا دیے تھے۔ بچے منہ میں گھلتی مٹھاس کا مزا لے رہے تھے۔ انگلی سے پلیٹ چاٹتی زمین کو یاد آیا۔ نجانے کب سے ماں نے خود مٹھاس نہیں چکھی تھی۔

☆☆☆

فضا میں دبیز دھند کا بسیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ اس دھند راج کے سامنے اسٹریٹ لائٹس بھی سکڑی سمٹی جاتی تھی۔ مگر کاکے کے ہوٹل کی حدت ہر گزرنے والے کو مہربان ماں کی طرح اپنی آغوش میں لے لیتی تھی۔ لنڈے

کے لمبے کوٹ، گرم موٹی چادروں اور کھیس کی بکل مارے سر پر ٹوپی رکھے ...... کوئی بندہ پہچان میں نہ آتا ...... پھر گرمائش سے ٹھٹھراتے اعصاب سکون پاتے تو ٹوپی گھٹنوں اور کھیس کندھوں پر آجاتے تو آنے والے کی شناخت ہوئی۔

بازی بہت بے دلی سے کھیلی جارہی تھی۔

شرط کے بغیر بازی کا مزا ان جواریوں کو کہاں آتا تھا۔

لیکن لگتا تھا کہ سردی سے اعصاب ہی نہیں جیبیں بھی سکڑی ہوئی ہیں۔

''کیا بات ہے منشی صاحب! آج کوئی لہر نہیں کوئی ترنگ نہیں۔ کاکے نے چھیڑا۔ اس قیامت کی سردی میں چائے بنابنا کر اسے چائے کی خوشبو سے نفرت ہونے لگی تھی۔ مگر کیا کرتا یہ تو کاروبار کے عروج کے دن تھے۔ اسی کی بدولت جیب گرم اور مزاج بشاش تھا۔

''چھوڑ یار ...... کیا لہر کیا ترنگ؟'' منشی اکرم نے بے زاری سے پتا پھینکا۔

حکومت نے وقتی طور پر بھٹے بند کر دیے تھے۔ بھٹے کی اسے اتنی فکر نہ تھی۔ وہ کون سا اسی ایک نوکری کے سہارے بیٹھا تھا۔ مگر دل بجھ گیا کہ وہ رنگین سنگین انداز اطوار والی چلبلی بہو اپنے خاندان کے ساتھ کسی اا ور کام کی تلاش میں کوچ کر گئی تھی۔

''کیا بتاؤں گھر والی بیمار ہے۔ گھر کا حشر ہو گیا ہے۔ بچوں کا برا حال ہے۔'' منشی اکرم نے آہ بھری۔

''تو چاچا ...... گھر والی کا علاج کرواؤ، تم تو نئی گھر والی ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے۔'' مراد کے ایک ہی جملے نے محفل کو کشت زعفران کر دیا۔

منشی اکرم خجل سا ہو گیا۔ یہ کمبخت رکشے والا ہمیشہ غلط وقت پر انٹری دیتا تھا۔

''تو کیا ہوا؟ دوسری کروں تو کوئی پابندی تھوڑی ہے۔''

''انصاف کیسے کرو گے چاچا ...... نہ کر پائے تو عذاب۔'' مراد کرسی کھینچ کر بیٹھا، نظر پتوں پر دوڑائی۔

''عذاب کیسا؟ عورت کو چاہیے کیا دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑے۔'' اکرم تاؤ کھا کر بولا۔

''بس ...... '' مراد نے نظر اٹھا کر دیکھا تو شفاف آنکھیں سرخ سی ہو گئی تھیں۔ جیسے اکرم کے جملے نے اسے اندر سے چٹکی کاٹی ہو۔

''ہاں تو اور کیا؟'' منشی نے مونچھوں کو تاؤ دے کر داد طلب نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، نجانے کیوں مراد اور منشی جب بھی آمنے سامنے ہوتے ان کی کسی نہ کسی بات پر بحث ہو ہی جاتی تھی۔ مراد کے تند و تیز جملے منشی کو دھول چٹاتے اور لوگ خوامخواہ حظ اٹھاتے۔

''محبت ...... عزت، وفاداری ......''

منشی نے چھت پھاڑ قہقہہ لگایا۔ ''یہ تم پڑھے لکھے، لونڈوں کے سیاپے اسی لیے تو اب تک گھر نہ بسا پایا ...... اوہ لڑکے ...... مرد کی جیب دیکھتے ہیں۔ جیب ...... جتنی اچھی کمائی اتنا اچھا رشتہ یہ قدموں میں پڑا ہوگا۔ کوئی نہیں پوچھے گا منشی اکرم تیری پہلی بیوی اور بچے کیا ہوئے؟ تیری عمر کتنی ہے۔ کیونکہ مرد کبھی بڈھا نہیں ہوتا۔''

مراد ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھتا رہا۔

پتا ہی نہیں چلا کون ہنسا ...... کس نے منشی کے زعم کو دل کھول کر داد دی۔

وہ تو بے خیالی میں سفر کرتا چک 59 کے ایک پکے گھر کے ہرے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ اور نجانے کب تک کھڑا رہتا کہ اس شخص کی پکار نے واپس کاکے کے ہوٹل پر لا پھینکا۔ وہ شخص منشی اکرم سے لجاجت بھرے لہجے میں بات سننے کو کہہ رہا تھا۔

مراد کی خاموشی نے منشی کا سینہ چوڑا کر دیا کہ آج کا معرکہ وہ جیتا ہے تب ہی تو مراد کی بولتی بند ہو گئی ہے۔

''دو چار گھڑی یہاں سکون لینے آیا ہوں۔ تم بھیک منگوں کو یہ بھی گوارہ نہیں۔'' اس شخص کا شرم اور خجالت سے سرخ پڑتا چہرہ۔

مراد بری طرح چونکا۔

وہ مونگ پھلی کی ریڑھی کھینچتا شخص اور اس کے پیچھے لپکتے چار بچے۔

''قسط دینے آئے ہو؟''

''بات کرنی تھی۔ گھر بھی گیا تھا...... مگر......''

''جلدی بول''

وہ شخص چاہتا تھا اکرام ایک طرف جا کر بات سن لے...... منشی بضد کہ سب کے بیچ بات ہو گی۔ مراد کا دل چاہا منشی کی گردن پکڑ کر دکان سے باہر پھینک دے۔

''چاچا...... جا کے بات سن لے۔'' مراد کا دخل دینا منشی کو اچھا تو نہیں لگا...... مگر وہ بادل ناخواستہ اٹھ کر اس شخص کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ مراد نے کچھ لمحے بے چینی سے گزارے...... پھر کسی کو پتے پھٹنے کا کہہ کر خود دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

''اب یہ تو کوئی بات نہیں ہے...... دکان رہن رکھوائی تھی۔ رہن چھڑا لو، دو کان لے لو۔''

''قسط تو دیتا رہوں گا۔ دکان میں سامان رکھنے کی اجازت دے دو۔'' وہ شخص ملتجی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''اچھی بھلی تیری ریڑھی چل رہی ہے۔ دکان میں سودا کہاں سے ڈالو گے۔''

''کچھ نہ کچھ کرلوں گا۔ ریڑھی سے گزارہ نہیں ہوتا۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ بڑی والی تو شادی کے قابل ہو گئی ہے۔''

''اچھا......'' منشی چونکا۔ اس کا چونکنا مراد کو ناگوار گزرا۔

''کون سا سن لگا ہے؟''

''سولہواں یا ستر ہواں اس کی ماں کو پتا ہو گا۔'' انور حسین نے سادگی سے بتایا۔

''تمہاری بیٹی کی عمر کی ہو گی جا چاچا......'' منشی کے ہر معاملے میں دخل دینا مراد کی عادت ہی بن گئی تھی۔

''نہ تجھے کیا اللہ نے مجھ پر منکر نکیر مقرر کیا ہے؟'' منشی بری طرح جھنجلایا۔

''میں تو بس جا رہا تھا......'' مراد نے خوامخواہ کان میں انگلی چلائی۔

''جا انور حسین...... صبح گھر آؤں گا پھر بات کرتے ہیں۔'' منشی نے جان چھڑائی۔

''کچھ گنجائش نکال کر آنا منشی صاحب۔'' انور حسین نے آس کی ڈور تھامی۔

''دیکھتے ہیں، دیکھتے ہیں۔'' وہ اپنی سردی سے سرخ ہوتی ناک سہلاتا مراد کو گھورتا اندر چلا گیا۔

''اس سود خور کے چکر میں کیسے پڑ گئے چاچا......'' مراد انور حسین کے مقابل آیا۔

''نصیب کے چکر میں...... انہوں نے آہ بھری۔

''آجائیں ادھر ہی جا رہا ہوں......'' مراد سامنے کھڑے رکشے کی طرف بڑھا۔

''جتنا رکشے کا کرایہ ہے اس میں بچوں کے لیے کوئی چیز نہ لے جاؤں۔'' انور حسین نے کنی کترائی۔ ''تین چار تو گلیاں ہیں۔''

''تین چار گلیوں کا کرایہ مانگا کس نے ہے چاچا...... آجائیں سردی بہت ہے۔ میں بھی گھر ہی جا رہا ہوں۔''

انور حسین کی مراد سے کبھی بات چیت تو نہ ہوئی تھی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہیں کہیں رہتا ہے تب ہی خاموشی سے رکشے میں جا کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ہلکی کن من نے موسم متوالا کر دیا تھا...... بارش تھی مگر سردی کی شدت اتنی نہ تھی۔ قریبی باغات سے اترے کینو، امرود اور گریپ فروٹ سے لدی ریڑھیاں ایک کے بعد ایک اس کے قریب سے گزرتی چلی گئیں۔ خوش ذائقہ پھلوں کے خوش نما رنگ موسم کی رنگینی کو اور بڑھا رہے تھے۔

کچے پکے مکانوں کے گرد ننھے برساتی مینڈک پھدکتے تھے۔

اور ان کے پیچھے وہ دونوں بھی۔

طلحہ اور حذیفہ...... کبھی مینڈک پکڑتے...... کبھی چھوڑتے ان کے پیچھے بھاگتے۔ شاید غریب کے بچے کو کھیلنے کے لیے قدرت اپنے کھلونے دے دیتی ہے۔

گھر سے نکلتے، کچھ دور چلتے ہی
رستے میں ہے اس کا گھر
کل صبح دیکھا تو بال بناتی وہ
کھڑکی میں آئی نظر

وہ کب سے رکشے میں نیم دراز بظاہر اپنے موبائل میں مگن گنگنا رہا تھا۔ ایک آدھ سواری نے رک کر پوچھا بھی رکشہ خالی ہے۔ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ نظریں کب سے در جاناں کا طواف کرتی تھیں۔ مگر مجال ہے جو کسی نے ادھ کھلے دروازے سے باہر جھانکا ہو۔ سوائے ان ٹڈوں کے جو مینڈکوں کے پیچھے پھدکتے پھر رہے تھے۔

"کیا کروں؟ سوالی بن کے دستک ہی دے دوں۔ کیا خبر دیدار کی خیرات نصیب ہو جائے......" یہ خیال اس شدت سے وارد ہوا کہ اس نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا اور سیدھا ہو بیٹھا۔

اسی لمحے ثمینہ کو کب سے غائب ہوئے بچوں کا خیال آیا۔

"نمو! طلحہ اور حذیفہ کہاں ہیں؟"

"باہر ہیں۔"

گاجریں کاٹتی اور کچر کچر کھاتی نمو نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔ کہ منہ میں تو گاجر تھی۔

"کم بخت آدھا کلو گاجریں تو خود ٹھونس گئی ہے۔ ہانڈی کس کی بناؤں گی۔"

ثمینہ نے اس کے سامنے سے پرات کھینچ لی۔

"جاؤ انہیں لے کر آؤ...... سردی لگ گئی تو سیاپا ہو جائے گا۔"

"کیا مصیبت ہے...... کھل کے گاجریں بھی نہیں کھا سکتے......" وہ بڑبڑاتی سر پر دوپٹے کا پلو ڈالتی باہر نکلی۔

مراد اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ بے چین دل کو قرار ملا گیا تھا۔ اتنی پر مشقت زندگی گزاری تھی کہ محبت کا خیال تک چھو کر نہ گزرا تھا۔ اسے پیسہ جمع کرنا تھا اور رکشے کی جگہ ٹیکسی لینا تھی...... شادی کا کوئی ذکر بھی کرتا تو ہنس کر ٹال جاتا...... گھر بسانے کا دھیان نہ آتا اور گھر والی کا کوئی تصور ذہن میں نہ تھا۔

پھر سامنے وہ آ گئی۔

محبت گھنٹیاں بجانے لگی۔

گھر بسانے کی خواہش بھی پیدا ہو گئی۔

اور گھر والی کیسی ہو۔ اس تصور سے ذہن و دل آباد ہو گئے۔

وہ جیسے اسی کے وجود کا کوئی گم شدہ حصہ تھی۔

وہ آدم تھا اپنی حوا کی تلاش میں تھا۔ مگر اپنی ہی تلاش سے بے خبر۔

اسے دیکھ کر مکمل ہونے کا احساس ہوا۔ اسے پا کر مکمل ہونا چاہتا تھا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' زمین نے آتے ہی گھر کا۔ انہوں نے ننھی منی ہتھیلیاں سامنے کھول دیں۔ ہائے گندے مندے مٹی میں لتھڑے چھوتے چھوٹے مینڈک۔

''آخ تھو...... دفع کروان کو، پھینکو انہیں کتنے گندے ہو تم۔'' اس نے تاڑ تاڑ دو دو جھانپڑ ان کی گدی پر لگائے۔ مراد نے بے اختیار اپنی گدی سہلائی۔

''چلو اندر۔'' وہ دونوں کو کھینچ کھانچ کر اندر لے گئی اور دھاڑ سے دروازہ بند کر لیا۔

کیا بے نیازی تھی۔ ایک بار جو پلٹ کر دیکھا ہو۔

دیکھ لیتی تو جان نہ جاتی۔ محبت کیسے دیدہ و دل چشم راہ کیے بیٹھی ہے۔

مراد نے ایک پرسکون سانس بھری اور فرنٹ پر آ کر رکشہ اسٹارٹ کیا......اور مخصوص ہارن بجاتا دروازہ کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔

گھر سے نکلتے ہی، کچھ دور چلتے ہی
رستے میں ہے اس کا گھر......

☆☆☆

''اگر اب گھر سے نکلے تو میں ابا کو شکایت لگا دوں گی گندے ڈڈوؤں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔''

زمین نے ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں بستر میں دھکیلا۔ فضہ اور ثمرین پہلے ہی دوسری چارپائی پر اپنی گڑیاں لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ کچن سے کچی مونگ پھلی بھوننے کی خوشبو آنے لگی۔ زمین دل گرفتی سے بچوں کے پاس بیٹھ گئی جو لحاف میں منہ دیے کھسر پھسر کرنے لگے تھے۔

''اب ابو ساری مونگ پھلی لے جا کر بیچ دیں گے اور ہمارے نصیب میں صرف ان کی خوشبو آئے گی۔''

''بچے کہاں ہیں......'' باہر سے انور حسین کی آواز آئی۔

''کمرے میں بٹھایا ہے ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ باہر گھوم رہے تھے۔''

ثمینہ نے کام ختم کر لیا تھا، گرما گرم مونگ پھلی اس چھابڑی میں منتقل ہو گئی تھی جو انور حسین نے ریڑھی پر رکھنی تھی۔

''بچوں کے لیے اس میں نکال دو......'' انور حسین نے الماری سے چنگیر نکال کر ثمینہ کے سامنے کی تو وہ ہکا بکا ان کی شکل دیکھنے لگی۔

''ریوڑیاں بھی لایا ہوں......ضروریات پوری کرنے کے چکروں میں یہ بھی بھول گیا کہ میرے بچے خواہشیں بھی رکھتے ہیں۔'' وہ چنگیر سمیت ثمینہ کے پاس بیٹھ گیا۔

''آپ نے تو زمین کی بات کو دل پر ہی لے لیا۔''

''آنکھیں کھول دیں اس نے میری۔'' وہ خود ہی مونگ پھلی نکالنے لگا......

اور جب دونوں کمرے میں آئے تو باپ کی فیاضی دیکھ کر بچوں کی ہنسی نہ رکتی تھی۔

ثمینہ نے دونوں چیزیں برابر بانٹ دیں۔

بچے ہنستے باتیں کرتے کھانے لگے تو انور حسین اپنی نم آنکھیں چھپاتا باہر نکل گیا۔

ثمینہ ذرا فرصت سے بچوں کے پاس ہی لیٹ گئی۔

''امی! اس نے میرے ڈڈے (مونگ پھلی) لے لیے۔'' فضہ نے دہائی دی۔

''میں نے نہیں لیے۔ وہ تو میرے گرے تھے۔''

''بری بات......لڑ لڑ کر نہیں کھاتے، برکت ختم ہو جاتی ہے۔'' ثمینہ نے ڈانٹا۔ زمین ان کے پیروں کی طرف گود میں مونگ پھلی رکھے مزے سے ریوڑی چبا رہی تھی، تب ہی طلحہ نے ماں کے کان میں سرگوشی کی۔

''امی، اب اس کو باہر نکال لوں۔''

''کس کو؟'' ثمینہ پر غنودگی چھانے لگی تھی۔

''جو میری جیب میں ہل رہا ہے۔''

''کیا ہے؟''

طلحہ ذرا اونچا ہوا ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سامنے کر کے کھول دیا۔ اور عین سامنے نرمین بیٹھی تھی۔ جس کی آنکھیں اس ننھے منے ڈڈو کو دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نرمین سے گلے ملنے کی چاہ تھی یا اپنا تعارف کروانا مقصود کہ موصوف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چھلانگ لگا دی۔ اس سے لمبی چھلانگ اور اونچی چیخیں نرمین کی تھیں...... فضہ اور ثمرین نے بنا کچھ جانے بوجھے لحاف میں منہ دے کر چلانا شروع کر دیا۔ ثمینہ بوکھلا کر اٹھی۔ نرمین کونے میں پڑے ٹرنک پر چڑھ گئی۔

حذیفہ نے بھاگ کر اپنا ڈڈو قابو کیا۔

''گندے اس کو باہر پھینکو...... ورنہ میں جوتے سے ماروں گی......'' وہ چلا رہی تھی اور حذیفہ ہتھیلی پر اسے سجائے آگے بڑھتا معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

''آپی...... یہ ڈڈو نہیں ہے۔ یہ شہزادہ ہے...... اس کو پیار کریں...... یہ شہزادہ بن جائے گا۔''

''آخ تھو......'' ڈڈو کو پیار کرنے کا خیال ہی دل الٹا گیا۔ کمینی افشاں بچوں کو نجانے کون کون سی کہانیاں سناتی رہتی تھی۔ نرمین نے حذیفہ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا...... متوقع شہزادہ اڑ کر دروازے کے باہر گیا۔ اگلا ہاتھ حذیفہ کی کمر پر پڑا تو ثمینہ نرمین کو ہی سخت سست سنانے لگیں۔ لوٹھا کی لوٹھا ہو کر ننھے منے مینڈک سے ڈر رہی تھی۔

☆☆☆

خدیجہ خالہ کے گھر سے آیا کھیر کا ڈونگا کام آ گیا۔ کہ منشی اکرم کی خاطر داری کے لیے زیادہ جتن نہیں کرنے پڑے...... کھیر بھجوا کر ثمینہ نے جلدی سے انڈے ابلنے رکھ دیے۔ اپنے جہیز کے بچ جانے والے برتنوں میں سے سب سے اچھا کپ اور پرچ نکالی۔

نرمین کا کتنا دل چاہا تھا اس میں چائے پینے کو مگر مہمان کا قدم گھر سے باہر ہوتا اور کپ پرچ دھل دھلا کر شوکیس میں۔

''یہ موٹی توند والا بندہ ہے کون جس کی اتنی خاطر ہو رہی ہے۔'' نرمین نے کینہ توز نگاہوں سے بیٹھک کا دروازہ دیکھا...... دو بار کھڑکی سے جھانک آئی تھی۔ خالی ہوتے ڈونگے کا غم لگ گیا تھا۔ بدقسمتی سے توند کا لفظ بچوں کے کانوں میں پڑ گیا...... انہوں نے صحن میں گھوم گھوم کر گانا شروع کر دیا۔

بابو جی   کی   توند   تو   دیکھو
دفن   ہے   اس   میں   بکرا   کوئی

مرغا اپنی مرضی سے بکرے میں بدل گیا تھا۔ نہ نظم یاد تھی نہ پورے الفاظ لیکن شرمندہ کروانے کو اتنے لفظ ہی بہت تھے۔ انور حسین دانت پیستا باہر نکلا۔ نرمین چائے کی ٹرے لیے دروازہ کھٹکھٹانے کو تھی۔

''رکھ دے......'' وہ کچچیاں (دانت پیستا) لیتا دونوں کو کان سے پکڑ کر اندر کمرے میں بند کر آیا۔ اب وہ بابو جی کی توند میں بکرا دفن کرتے یا مرغا...... بابو جی کی سماعتوں سے دور ہی رہتا۔

نرمین نے ٹرے میز پر رکھ کر بڑے ادب سے سلام کیا تھا۔

''سلام تایا جی......''

ماں نے بتایا تھا سامنے والا باپ سے بڑی عمر کا ہو تو تایا جی کہتے ہیں...... چھوٹا لگے تو چاچا جی۔

تایا جی ٹکر ٹکر نرمین کو دیکھتے گئے۔

بالی سی عمر

جیسے منہ بند کچی کلی...... جسے ہوا بھی چھوئے بغیر گزری ہو۔
اور مرد کی عمر کون دیکھتا ہے مرد کی تو جیب دیکھی جاتی ہے۔
منشی اکرم کو اپنی بھاری جیب اور انور حسین پر کیے بھاری احسان پر فخر محسوس ہوا۔
تایا جی نے سلام کا جواب نہ دیا تھا۔ نرمین نے حیران ہو کر سر اٹھایا...... دوسرے لمحے باوجود ضبط کے ہنسی پہاڑی جھرنے کی طرح لبوں سے پھوٹ پڑی......
"تایا جی کی مونچھوں پر کھیر لگی تھی۔
وہ منہ پر ہاتھ رکھتی وہاں سے بھاگ لی۔
(بس میرے گھر میں اسی ہنسی کی کمی ہے)
انور حسین معذرت کرتا ہوا واپس آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اٹھا اور تولیہ لا کر سامنے رکھ دیا۔
"صاف تولیہ ہے جی۔ منہ صاف کر لیں۔"
بنا شیشہ دیکھے منشی صاحب کو جائے واردات کا پتا چل گیا تھا۔ اس نے پیالی چمچہ رکھا۔ منہ صاف کیا۔ مونچھیں سنواریں۔
"اب تم چاہتے کیا ہو؟"
"عرض تو آپ کے سامنے ہے منشی صاحب۔ دکان واپس مل جائے...... ہر مہینے قرض کی ادائیگی کرتا رہوں گا۔"
"دکان میں سامان کہاں سے بھرے گا۔"
"اللہ سبب بنائے گا۔ بس آپ احسان کر دیں۔" انور حسین نے امید بھری نگاہوں سے دیکھا۔ "آپ کو اللہ کا واسطہ ہے۔"
"اب اللہ رسول کو درمیان میں لے آئے ہو۔ تو کچھ سوچنا پڑے گا۔"
وہ کھڑا ہوا تو انور حسین بھی تیزی سے کھڑا ہو گیا۔
"قرض کے بھی اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ پر تمہارے لیے راہ نکال لوں گا۔"
"اللہ آپ کا بھلا کرے، اللہ آپ کی اولاد کو سلامت رکھے۔"
انور حسین کی ہاتھ جوڑ کر دی گئی دعائیں طویل ہو گئیں تو منشی نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔
"یہ تمہاری بڑی لڑکی تھی نا......" منشی نے کھڑے کھڑے کپ اٹھا کر چائے کا گھونٹ بھرا۔
"جی......"
"بلاؤ......" منشی کا لہجہ تحکمانہ تھا۔
انور حسین حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔
"اب اتنی اچھی چائے لائی ہے تو انعام تو بنتا ہے نا۔" منشی نے قہقہہ لگایا تو انور حسین نرمین کو آواز دینے لگا۔ وہ سہمی ہوئی آئی...... نہیں بے ساختہ ہنسی کی شکایت تو نہیں لگ گئی؟
"لے بھئی تمہارا انعام......" منشی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو کا نوٹ نکالا۔
"نہیں...... نہیں منشی صاحب! یہ بہت زیادہ ہیں......" انور حسین نے بوکھلا کر روکنا چاہا۔
"تمہاری بیٹی کے سامنے تو کچھ بھی نہیں۔ لو بھئی پکڑو۔"
نرمین نے باپ کو دیکھا۔ باپ نے اثبات میں سر ہلایا۔
نوٹ پکڑتے نرمین نے سر پر پیار لینے کے لیے سر اس کے سامنے جھکایا۔ تو منشی کا ہاتھ سر کے بجائے اس کے کندھے سے پھسلتا کمر تک چلا گیا۔

ایک لمحے کا کھیل تھا۔
کسی کو اندازہ بھی نہ ہوا۔
اس لمس میں طلب تھی۔ حرص ہوس تھی۔
"کل آنا۔ کھل کر بات کریں گے۔" وہ کہہ کر باہر کی سمت چلا۔
انور حسین خوشی میں بوکھلایا اس کے پیچھے نکل گیا۔
زمین نے پانچ سو کے نوٹ کو کھول کر بے یقینی سے دیکھا اور ماں کے پاس بھاگی۔

☆☆☆

"کیوں کیوں میرا نوٹ ہے...... مجھے دے کر گئے ہیں۔ آپ کیوں رکھیں گی۔"
ثمینہ نے پیسے کیا رکھے...... مارے صدمے کے زمین کی آنکھیں چھلک آئیں۔
"سارے مہمان بچوں کو ہی پیسے دے کر جاتے ہیں۔ مگر کام تو بڑوں کے ہی آتے ہیں۔" ثمینہ نے ابلے ہوئے انڈے ڈونگے میں چھپائے۔ مہمان نے تو کھائے نہیں تھے۔ رات کو دو آلو ڈال کر شوربے والا سالن بن جاتا۔
"یہ ناانصافی ہے۔ ظلم ہے، میں احتجاج کروں گی۔"
"جا کے جلوس نکال لے......" ثمینہ زچ ہو گئی۔ "ابھی ابو سے تو پوچھنے دو۔ رکھنے بھی ہیں یا واپس کرنے ہیں۔"
"رکھنے نہ ہوتے تو مجھے کیوں اشارہ کرتے کہ لے لو۔"
"کیا ہو رہا ہے......" انور حسین مطمئن سا اندر داخل ہوا۔ منشی اکرم نے جس طرح تسلی کروائی تھی لگتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔
"یہ پانچ سو اس کو کیوں دے کر گیا ہے۔ اب کہتی ہے۔ مجھے دو۔" ثمینہ نے نوٹ انور حسین کی طرف بڑھایا۔
"ابو جی...... میرا بند جوتا نہیں ہے۔" چپل میں پاؤں ٹھٹھر جاتے ہیں۔" زمین نے دہائی دی تو انور حسین نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔
"اچھا اچھا صبح ماں کے ساتھ جا کر لے لینا۔"
زمین کی گویا عید ہو گئی تھی۔ ساری رات سرہانے تلے رکھ کر سوچتی رہی۔ بند جوتا کس رنگ کا اور کیسا لینا ہے۔
"نہیں...... کوئی شال لے لیتی ہوں...... پرانی والی کا تو رنگ ہی اڑ گیا ہے۔"
"کافی کا ڈبہ کتنے کا آتا ہو گا۔ ایک بار فرخ نے پلائی تھی۔ اور وہ عنیزہ بھی کتنی شوخیاں مارتی ہے کہ ہم تو سردیوں میں چائے نہیں کافی پیتے ہیں۔"
"گولڈن کلر کی جھمکیاں نہ لے لوں۔ مینا بازار پر پہن کر جاؤں گی تو ساری سہیلیاں دیکھتی رہ جائیں گی۔"
ایک کے بعد ایک خواہش۔
کسے پورا کرے کسے چھوڑے۔
"کیا بات ہے نمو! ابھی تک سوئی نہیں۔" ثمینہ سارے کام سمیٹ کر آخری نظر بچوں کو دیکھنے آئی تھی۔
"امی جی......" زمین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "زندگی بہت ادھوری سی لگتی ہے۔"
"کیوں بیٹا؟"
"کوئی خواہش بھی تو پوری نہیں ہوتی۔" کومل سا لہجہ اداسی لیے ہوئے تھا۔ ماں کا دل مٹھی میں آ گیا۔
مگر کیا کرتی؟ خود تو صبر کا گھونٹ پی کر سوتی تھی تو صبح نہار منہ بھی وہی پینا پڑتا تھا۔ بیٹی کو بھی یہی درس دینا تھا۔
"خواہش کا کیا ایک پوری ہوتی تو دوسری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تو جنگل کی طرح اگتی چلی جاتی ہیں۔"
"اللہ نے سب کو ایک سا پیدا کیوں نہیں کیا؟"

''اس کی تقسیم ہے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔'' ثمینہ نے سادگی سے کہتے ہوئے ہر لحاظ ٹھیک کیا۔ معصوم فرشتے۔ نجانے کون کون سی خواہشیں ہر روز تکیے تلے رکھ کر سوتے ہوں گے۔

''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر آپ غربت میں پیدا ہوتے ہیں تو یہ آپ کی غلطی نہیں۔ لیکن اگر آپ غربت میں مرتے ہیں تو یہ آپ کی بے وقوفی ہے۔''

ثمینہ نے تیزی سے پلٹ کر زمین کو دیکھا۔

کبھی کبھی وہ ایسی باتیں کر جاتی تھی کہ ثمینہ کو ڈر سا لگتا تھا۔

اس کے اندر تسلیم و رضا کم تھی۔ یوں لگتا تھا اس کے اندر کوئی بے چین روح ہے۔ جو اسے کچھ کرنے پر اکساتی ہے۔

مگر وہ کرے کیا۔

کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔

''ایسی باتیں مت کیا کرو نزمین۔''

''ایک اکیلے ابو جی کی محنت...... اور ہم اتنے جی کھانے والے...... امی جی...... یہ پانچ سو کا نوٹ...... جس کے لیے میں نے آپ سے اتنی بحث کی۔ میں خود بھی تو کما سکتی تھی۔''

''وہ کیسے؟ تم لڑکی ہو نمو!'' ثمینہ مزید ڈر گئی۔

''تو کیا ہوا؟ میں پکوڑے بنا کر اسکول کے اندر بیچ سکتی ہوں یا آلو کی ٹکیاں۔''

''لیکن نمو! لوگ کیا کہیں گے؟''

''میں کون سا بھیک مانگوں گی جو لوگ کچھ کہیں گے۔'' نزمین کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔ ماں ڈر کیوں رہی تھی۔

''اچھا، فالتو باتیں مت سوچا کرو۔ دعا کرو، تمہارے ابا کو دکان مل جائے تو حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم دل لگا کر پڑھو۔ پرسوں سے اسکول بھی کھل رہے ہیں۔''

ثمینہ نے ساری گفتگو لپیٹ دی۔ تو نزمین خاموشی سے لیٹ گئی۔

''ٹھیک ہے، دل لگا کر پڑھ لوں گی۔ پھر کالج میں داخلہ لے لوں گی...... لیکن......'' وہ ذرا سا چپ ہوئی۔

''کیا ابو جی میرا کالج کا خرچا اٹھا پائیں گے؟''

ثمینہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

☆☆☆

افشاں اور اس کی امی کو بازار جانے کے لیے پیسے سے زیادہ بہانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ جیب میں ہزار پانچ بھی ہوتا تو مزے سے چل دیتیں۔ ایک آدھ چیز خریدی، پورا بازار گھوما اور گھر واپس...... پھر چیچہ وطنی کا بازار تھا بھی کتنا بڑا...... گھنٹہ بھر میں پورا بازار کھنگال کر گھر واپس آ جاؤ۔ انہوں نے کون سا برانڈز دیکھنے ہوتے تھے۔ جہاں سے چیچہ وطنی کے امراء شاپنگ کرتے تھے، انہیں بس دور سے ہی سلام کر لیا جاتا۔

اس گلی کی یاترا گویا فرائض میں ہی شامل ہو گئی تھی۔

کبھی ایک جھلک نصیب ہو جاتی تو وہ پورے شہر میں رکشے کو جہاز بنا کر اڑاتا اور سواریوں کی چیخیں نکلواتا تھا۔

آج بھی وہیں تھا۔ کانوں میں ہینڈز فری لگائے، پچھلی سیٹ پر نیم دراز تصور جاناں میں یوں محو ہوا کہ جاناں پاس آ کھڑی ہوئی اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔

''بھائی! کمبوہ چوک چلتے ہو۔'' افشاں کی امی نے رک کر پوچھا۔ جبکہ افشاں اور نزمین نے رکشے اور رکشے والے کو پہچان کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

''خالی نہیں۔'' مراد نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"چھوڑیں خالہ! آگے دیکھ لیتے ہیں۔"

وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔

"اس نے کیا یہاں بیٹھ کر انڈے دینے ہیں۔ سواری ہے نہیں اور کہتا ہے خالی نہیں۔" خالہ نادرہ کو تاؤ آ گیا۔

"خالی ہے جی۔ وہ تو بے خیالی میں کہہ گیا۔ بیٹھیں اماں جی۔" (آج تو میری سواری کے نصیب جاگے ہیں)

ایک ہلکی سی نظر زمین پر ڈال کر وہ آگے بیٹھ گیا۔

"کرایہ کتنا لو گے؟"

"جو دل چاہے دے دیں۔"

اب کرائے کی حاجت کہاں تھی۔ اس لیے یوں ہی کہہ دیا۔

وہ کونے میں بیٹھی مسلسل باہر دیکھتی رہی تھی۔

مراد اپنی نظروں کو باندھنے کی کوشش میں بے حال ہو گیا۔

دنیا آگے کہاں تھی، دنیا تو اس کے عقب میں سمٹی بیٹھی تھی۔

(آہ...... کوئی یوں بھی بامراد ہوتا ہے)

مراد کو اپنی خوش نصیبی پر یقین آ گیا۔

فیروزی دوپٹا سنبھالے وہ رکشے سے اتر گئی تھی۔ خالہ جی نے کتنا کرایہ دیا، مراد نے بنا دیکھے جیب میں ڈال لیا۔

"کیا لینا ہے؟" افشاں نے پوچھا۔

جب خواہشیں بے تحاشا ہوں اور پوری کرنے کی پسلی بھی نہ ہو تو انہیں ایک طرف لپیٹ کر اپنی ضرورت دیکھنی چاہیے۔

زندگی نے یہ سبق بہت پہلے پڑھا دیا تھا۔

"جوتا ہی لوں گی۔" زمین آہستہ سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

معصوم چہرہ، نیچی نگاہیں

بھولی سی لڑکی...... بھولی ادائیں

نہ اپسرا ہے نہ وہ پری ہے

لیکن یہ اس کی جادوگری ہے

دیوانہ کر دے وہ، اک رنگ بھر دے وہ

شرما کے دیکھے جدھر

گانا کہاں اس کے دل کی ترجمانی تھی۔ بستر پر نیم دراز مسکراتا وہ عالم بے خودی میں تھا۔

گویا فیروزی دوپٹا اس کے چہرے پر سرسرا رہا ہو۔

وہ بازار میں جہاں رکی تھی۔

مراد وہیں تھم گیا تھا۔

وہ جہاں سے چلی تھی۔

مراد نے وہیں سے قدم اٹھایا۔

چوڑی...... جھمکا...... شال...... زمین نے جس جس چیز کو شوق کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

مراد نے اسے خرید لیا۔

دو بہت عام انسان ایک دوسرے کے لیے بہت خاص بننے جا رہے تھے۔ مراد کو ایسا لگتا تھا۔

''وہ بس میرے لیے بنی ہے۔'' مراد نے کروٹ بدلی اور بہت پیار سے فیروزی چوڑیوں پر انگلی پھیری اور اس کے عقب سے عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔

علی بخش ترکھان کا رندہ یوں چل رہا تھا جیسے بجلی پر چل رہا ہو۔

مراد جھنجلا کر سیدھا ہوا۔

''یار ابا! خوشی میں تو تنہا چھوڑ دیا کرو۔''

''تنہا نہیں ہے تو۔'' وہ رندہ روک کر غرایا۔ تو مراد بھڑک اٹھا۔

''تنہا ہوں ہمیشہ سے...... نہ کوئی آگے ہے نہ پیچھے...... اور ابا! تم...... ؟ کیوں چلے آتے ہو؟ چھوڑ آیا میں چک 59 اور تمہیں بھی وہیں دفن کر آیا تھا۔ تو سکون سے وہیں کیوں نہیں رہتے۔ ہر روز سپارہ پڑھ کے بخشتا ہوں پھر قبر میں بھی چین کیوں نہیں آتا۔''

''تمہارے لیے تو زندہ بھی مردہ ہو گئے۔ علی بخش کو چین کیسے آئے۔''

وہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے اکڑوں بیٹھا اونچا اونچا رونے لگا۔ بالکل اس طرح جس طرح کبھی چک 59 کی کیکر تلے بیٹھ کر رویا کرتا تھا۔

مراد ششدر سا رہ گیا۔

علی بخش ترکھان اس سے ناراض تھا۔

باپ کی روح بے چین تھی۔

☆☆☆

ہر دعا مستجاب نہیں ہوتی تب ہی تو دروازہ ثمینہ نے کھولا تھا۔

مراد ٹپٹا گیا۔

''جی بیٹا!'' ثمینہ نے نیلی پینٹ، سفید شرٹ پر کالی جیکٹ پہنے شائستہ چہرے والے نوجوان کو حیرت سے دیکھا۔

''جی...... میں...... یہ...... یہ دینے آیا تھا۔'' اس نے ایک شاپر سامنے کیا۔

''نرمین کے ابا تو گھر پر نہیں ہیں۔'' نرمین گھر کا پہلا بچہ تھی، تو بس یہی منہ پر چڑھ گیا۔ اب نہ جانے کون تھا، کیا لایا تھا۔

''نرمین تو گھر پر ہوگی؟''

(ہائے یہ بے اختیاری) مراد نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

ثمینہ کا رنگ فق ہو گیا۔

کمرے سے ثمرین نکلی۔ ثمینہ تو آدھی دروازے کی اوٹ میں تھی۔ نظر سیدھی مراد پر گئی وہ سرپٹ چھت کی طرف بھاگی۔ جہاں نرم گرم ڈھلتی دھوپ میں افشاں اور نرمین کے ادھ گیلے، ادھ سوکھے بال پشت پر بکھرے تھے۔

''میرا بھی دل چاہتا ہے، میں بال کٹواؤں۔'' نرمین نے حسرت سے کہا۔

''جانے دو، آج کل تو لمبے بالوں کا فیشن ہے۔'' افشاں نے یوں روکا جیسے وہ ابھی کٹوانے جا رہی ہو۔''

''لیکن ہمارے بال ان کے جیسے تو نہیں ہیں۔'' نرمین نے بال سامنے کر کے دیکھے۔ دھونے کے باوجود ان میں تصویر والی ماڈل جیسی چمک نہیں تھی حالانکہ اس کے بال بہت اچھے تھے۔ افشاں تو ہمیشہ رشک سے دیکھتی۔

''مہنگے والے شیمپو لیتی ہیں...... اور باقی کیمرے کا کمال ہے۔ اب تو ایسی ایسی ایپ آگئی ہیں کہ تصویر

کھنچواؤ تو منہ پر میک اپ خود بخود ہو جاتا ہے۔"
"ہیں......واقعی۔" زمین کو یقین نہ آیا تھا۔
"بھائی کا موبائل ہاتھ لگا تو لا کر دکھاؤں گی۔"
"ثموآپی......ثموآپی......" جوش میں ہانپتی کانپتی ثمرین بھاگی آئی۔
"رسالہ چھپالو، جا کر امی کو بتائے گی۔"
افشاں نے جھٹ سے رسالہ دوپٹے کے نیچے کرلیا۔
"کیا ہے؟ بتایا بھی تھا۔ نہا کر دھوپ سینکنے آئی ہوں۔ دو منٹ سکون سے نہ بیٹھنے دینا۔"
"نیچے نا......وہ مونگ پھلی والے بھائی جان آئے ہیں۔"
ثمرین نے پھولی پھولی سانس کے درمیان بتایا۔
"یہ کون سے بھائی جان ہیں؟" افشاں نے حیران ہو کر زمین کو دیکھا تو وہ سرعت سے کھڑی ہوئی۔
"آ کر بتاتی ہوں۔"
"آ کر کیا مطلب؟ میں بھی ساتھ آتی ہوں۔" افشاں رسالہ وہیں بھول بھال کر اس کے پیچھے بھاگی تو ثمرین نے رسالہ اٹھالیا۔
"آپی رسالے پڑھتی ہیں۔ امی کو بتاؤں گی۔"
زمین جا کر چھت کی چھوٹی سی منڈیر نما دیوار پر لٹک گئی۔
چھوٹا سا صحن عبور کر کے سامنے دروازہ کھلا ہوا تھا اور سامنے وہ کھڑا تھا۔
"ہائے اللہ۔ یہ تو وہی رکشے والا ہے۔" افشاں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔
"اف......کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ ہیرو لگ رہا ہے ہیرو......پر یہاں کیوں آیا ہے؟"
زمین گم صم کھڑی تھی۔ کچھ بولتی کہتی نگاہوں کو محسوس کر کے وہ غصے سے تپ گئی تھی۔ تب ہی تو منہ موڑے رکشے سے باہر دیکھتی رہی۔
ثمینہ کو شاپر تھماتے مڑتے مڑتے نگاہ اٹھ گئی تھی۔
فیروزی دوپٹا کندھوں پر دھرا تھا۔ کھلے بالوں میں موہنی صورت، حیران نگاہیں......جیسے ہی مراد کی نظر اٹھی، وہ سرڈھانپتی الٹے قدموں پیچھے ہٹی۔ ثمینہ دروازہ بند کرتی' زمین کو پکارنے لگی۔
"جی امی!" تمتماتا چہرہ پھولی سانس......دھڑکتا دل۔
"تم لوگ جس رکشے میں آئی تھیں، اس میں شاپر بھول گئی تھیں، وہی دینے آیا تھا۔"
"امی! میں نے تو بس جوتا ہی خریدا تھا۔" زمین نے بوکھلا کر وضاحت دی۔
"دکھائیں تو......" افشاں نے تیزی سے شاپر کھینچا، کھولا......اندر جھانکا۔ پھر زمین کی آنکھوں میں دیکھا۔
"جی خالہ! یہ میرا ہے۔ میں بھول گئی تھی۔" افشاں نے شاپر بند کیا۔ زمین کا ہاتھ پکڑا اور چھت کی طرف دوڑ لگادی۔ ثمینہ ان کی لاپروائی کو کوستی اندر چل دی۔
"ایسی بھی کیا لاپروائی......کون سا پورا بازار خرید لیا تھا۔ وہ بھلا مانس نکلا تب ہی دے گیا، کوئی اور ہوتا تو......"
اور ثمرین ان کی جگہ چارپائی پر بیٹھے ہجے کر کر کے کہانی پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ افشاں نے اس کے ہاتھ سے رسالہ جھپٹ لیا۔
"چل......نیچے بھاگ۔"

"امی کو بتاؤں گی، آپ رسالے پڑھتی ہیں۔"

"جا کے بتا دے۔" افشاں نے اسے سیڑھیوں کی طرف دھکیلا اور اس کے جاتے ہی شاپر چارپائی پر الٹ دیا۔

زمین ششدر سی رہ گئی۔

خود افشاں بھی ایک لمحے کو بولنا بھول گئی تھی۔

☆☆☆

باہر دسمبر کی آخری رات بھیگی تھی اور اندر وہ بے چین تھی۔ من ایسے تھا جیسے منہ بند کنواری کلی کو بارش کی پہلی بوند نے چھو لیا ہو۔

شرم تھی...... گھبراہٹ یا خوف کہ وہ کانپ کانپ گئی۔

یہ تو وہی جھمکے تھے جنہیں اس نے اپنے کان سے لگا کر دیکھا تھا۔ ننھی منی جھمکیاں جن کے ساتھ باریک گلابی موتی تھے۔ قیمت تھی ساڑھے چار سو...... پانچ سو کے نوٹ کو مٹھی میں دباتے اس نے مایوسی سے واپس رکھ دی تھیں۔

اسے کیا معلوم تھا اس کی مایوسی کسی کا دل چیر گئی تھی۔

وہ سرخ کیپ شال جس کے پہننے کا وہ صرف تصور کر سکتی تھی۔

یہ فیروز چوڑیاں......

زمین نے اپنا فیروزی دوپٹا مٹھی میں بھینچ لیا۔

"یہ......" افشاں ہکا بکا تھی۔

زمین کانپ کر چارپائی پر بیٹھی۔

"افشاں! وہ ہمارے پیچھے تھا۔ اس نے بچوں کو پیسے دے کر کہا آپی کے لیے مونگ پھلی لے جانا...... وہ کب سے میرے پیچھے تھا۔"

"ہائے اللہ۔ یہ تو کوئی فلمی سین ہو گیا۔" عالم حیرت سے نکل کر افشاں عالم جوش میں آئی۔ ساری لو اسٹوریز جو پڑھی اور دیکھی تھیں، تصور میں گھوم گئیں۔

"ہائے اللہ۔ ہم سے کیوں نہ کی کسی نے اتنی محبت۔"

"محبت......؟" زمین ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھے گئی۔

"ہاں تو اور کیا؟ وہ تم پر مرمٹا ہے پگلی۔ آج سمجھ میں آیا اس کا رکشہ ہمیشہ ہماری گلی کے نکڑ پر کیوں کھڑا ملتا ہے۔ یہ تو اس نے اپنی محبت کے اظہار کے لیے تحفے بھیجے ہیں۔ اوئے ہوئے...... کتنا کھلے دل کا ہے۔"

افشاں نے نہال ہوتے کیپ شال کو کھول کر اسے اوڑھنا چاہا۔

زمین تڑپ کر پیچھے ہوئی۔

"افشاں! میں نہیں لے سکتی۔"

"کیوں؟"

"امی جی میری جان نکال دیں گی۔" زمین کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

"تو وہ محبت ہی کیا جس میں مرنے مارنے کی باتیں نہ ہوں۔" افشاں نے شرارت سے زمین کو چٹکی بھری۔

"اور کیا تم نے اسے دیکھا نہیں، کتنا ہینڈسم ہے۔"

''افشاں! مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو اور یہ...... یہ سب اسے واپس کر دو یا تم رکھ لو۔ میں نہیں لے سکتی...... مجھے نہیں رکھنا۔''

افشاں کے سمجھانے بجھانے کے باوجود وہ مان کے نہ دی۔ افشاں وہ چیزیں اپنے گھر بھی نہیں لے جا سکتی تھی۔ نرمین نے مجبوراً وہ شاپر لا کر چارپائی کے نیچے چھپا دیا اور خود سر شام منہ سر لپیٹ کر لیٹ گئی۔ بچوں کا کیا پتا؟ کب چارپائی کے نیچے گھس جاتے۔

اب وہ جتنے بھی کان بند کرتی...... کبھی چوڑی کھنکتی...... کبھی جھمکا بولتا۔

کبھی وہ خود کالی جیکٹ پہنے دروازے میں آ کر کھڑا ہوتا۔

وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی۔

''کیا بات ہے نمو! نیند نہیں آ رہی؟'' ثمینہ آدھی رات کو جب بھی آنکھ کھلتی، بچوں کے کمرے میں ضرور آتی تھیں۔

''جلدی سو گئی تھی تو آنکھ کھل گئی۔'' وہ جھوٹ بول کر خود ہی چور بن گئی۔

''درود شریف پڑھتی جاؤ۔''

''امی جی!'' نرمین تیزی سے بیٹھ گئی۔ اسے لگا وہ ماں سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ ثمینہ دروازے میں رک گئیں۔

نرمین نے فیصلہ کن سانس لی۔

''ماں بیٹی سہیلی ہوتی ہیں، ماں سے کوئی بات نہیں چھپانی۔''

ایک بار ماں نے سبق پڑھایا تھا۔ اسے ماں کے پڑھائے اسباق ازبر تھے۔

نرمین نے جھک کر چارپائی کے نیچے سے شاپر نکال کر اوپر رکھا۔

''یہ افشاں کا نہیں تھا۔''

''پھر کس کا تھا؟'' ثمینہ نے پاس آ کر شاپر کھولا۔

''امی! خدا کی قسم مجھے کچھ بھی نہیں پتا۔ میں تو اس کا نام تک نہیں جانتی۔ اسے دیکھا تک نہیں...... پتا نہیں اس نے ایسے کیوں کیا؟'' وہ رونے والی ہو گئی۔

''نمو! کیا...... کیا...... کہہ رہی ہو؟'' ثمینہ کا دل ڈوب گیا۔

''وہ اس دن جب میرا بیگ رکشے میں رہ گیا تھا۔''

نرمین نے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ ہر بات سچائی اور ایمان داری سے بتاتی گئی۔

ثمینہ کی ہتھیلیوں پر پسینہ اترنے لگا۔

وہ حیرت سے بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کب اتنی بڑی ہو گئی کہ لوگ اسے اس نظر سے دیکھنے لگے۔

☆☆☆

کھولتے تیل کا کڑاہا انور حسین کے سر پر آ پڑا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے منشی اکرم کو دیکھنے لگا۔ منشی کی شکل آج سے پہلے کبھی اتنی مکروہ اور کریہہ نہ لگی تھی۔

''منشی! میں یہاں اپنی دکان چھڑانے آیا ہوں۔ اپنی بیٹی کو گروی رکھنے نہیں آیا۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں تو رشتہ داری نباہ رہا ہوں۔ شادی کی بات کر رہا ہوں۔ کیا نہیں ہے میرے پاس...... رانی بنا کر رکھوں گا۔''

''ابھی تو بچی ہے......'' مجبوریوں نے ہاتھ باندھ رکھے تھے ورنہ حساب کتاب کے کھاتوں کے درمیان

بیٹھے منشی کا منہ تھپڑوں سے لال کر دیا۔

"باپ کی نظر سے دیکھتے ہو اس لیے بچی لگتی ہے۔"

"منشی اکرم!" انور حسین غصے سے کانپ گیا۔

"اوہ، ہولی انور ہے۔" منشی کے تیور بدلے۔ نرم لہجہ کرخت ہو گیا۔

"مجھے کیا لڑکیوں کی کمی ہے۔ اتنا پیسہ ہے کہ جس گھر رشتہ بھیجوں، وہیں سے ہاں ہو جائے۔"

"غریبوں نے اپنی بیٹیاں بیچنے کے لیے نہیں پالیں۔ ان کی مجبوریاں خرید لو گے، غیرت نہیں خرید سکتے۔"

انور حسین ہر چیز پر لعنت بھیج کر چل دیا۔

"ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنا۔ صرف دکان واپس نہیں کروں گا، مال بھی ڈلوا دوں گا۔ آج نہیں تو کل بیٹی کی شادی تو کرنا ہی ہے۔ تمہارے باقی بچوں کی زندگی سنور جائے گی۔" انور حسین بجلی کی طرح وہاں سے نکل گیا۔

"دیکھتا ہوں، کیسے رشتہ نہیں دیتا۔ دکان ضبط نہ کی تو میرا نام بھی منشی اکرم نہیں۔" وہ زہریلے انداز میں پھنکارا۔

کسی سانپ کی طرح وہ انور حسین کے گلے سے لپٹ گیا تھا۔ اب ڈسنا تھا یا بس سانس بند کر کے چھوڑ دینا تھا، فیصلہ انور حسین کے ہاتھ میں تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر پہنچا۔

دونوں ماں بیٹی چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔

"وہ پانچ سو کا نوٹ کہاں ہے؟"

نہ جانے کیوں اسے فساد کی جڑ پانچ سو کا نوٹ لگتا تھا۔

"ابو! اس کا تو جوتا لے لیا تھا۔" نرمین نے لڑکھڑاتی آواز میں کہتے پیروں کے پاس پڑے جوتے کو دیکھا۔

"کہیں انہیں کچھ پتا تو نہیں چل گیا۔" ثمینہ کے دل میں الگ خدشے جاگے۔

عقب میں بند شاپر کے اندر سرسراہٹیں ہونے لگی تھیں۔

اگلا لمحہ ان کے لیے بے حد حیران کن اور بھیانک تھا۔

انور حسین نے پاگلوں کی طرح جھک کر نرمین کا نیا جوتا اٹھایا۔

نرمین ڈر کر ماں کے کندھے سے جا لگی۔ جیسے بغیر گناہ کے سزا بھگتنے جا رہی ہو مگر انور حسین نے وہ جوتا اپنے سر پر برسانا شروع کر دیا تھا۔

وہ خود کو مار رہا تھا...... اذیت دے رہا تھا...... اور رو رہا تھا۔

ثمینہ تڑپ کر آگے بڑھیں۔

انور حسین نے اسے دھکا دے کر ہٹایا۔

"یہ سارا قصور میرا ہے...... میں کسی قابل نہیں...... میں تم لوگوں کے لیے کچھ نہ کر سکا۔"

بچے گھبرا کر جاگے۔ باپ کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگے۔

نرمین باپ کا ہاتھ پکڑ کر بازو سے لٹک گئی۔

ثمینہ نے جوتا کھینچ کر اتنی دور پھینکا کہ صحن میں جا کر گرا تھا۔

انور حسین نے نرمین کو بازو کے گھیرے میں لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''میرا قصور ہے۔ مجھے معاف کر دینا میری بچی۔ میں کمزور ہوں...... میں کسی قابل نہیں ہوں۔''
''ابو جی! آپ تو ہمارا سب کچھ ہیں۔ ہمارا فخر ہیں۔ آپ کمزور نہیں ہیں۔ آپ تو ہمارے گھر کی چھت ہیں۔'' نرمین باپ کے سینے سے لگی بلک رہی تھی۔
ثمینہ نے نرمین کو پیچھے ہٹایا اور انور حسین کو سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔ نرمین نے چہرہ صاف کرتے مڑ کر بچوں کو دیکھا۔
''آپی! ابو پاگل ہو گئے ہیں۔'' فضہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
''اللہ نہ کرے۔'' وہ تھک کر پائنتی پر بیٹھی۔ خود اسے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باپ کو ہوا کیا تھا۔ انور حسین نے ثمینہ کو ایک لفظ نہیں کہا۔ بس کروٹ بدل کر سسکیاں لیتا رہا۔ ثمینہ نے پہلی بار شوہر کو اتنا بے حال اور کمزور دیکھا تھا۔

☆☆☆

نیا سال خاموشی سے وقت کے سمندر میں گم ہو گیا تھا۔
تاریخ تھی دو جنوری۔
مگر ان کے لیے نہ سال بدلا، نہ تاریخ، نہ حالات......
اسکول کھل گئے تھے۔ سارے بچے یونیفارم پہنے ماں کے پاس باورچی خانے میں جمع ہو گئے۔ ثمینہ نے گرما گرم چائے کا ایک ایک پیالہ اور دو دو رسک ان کے سامنے رکھ دیے۔ نرمین کسی سوچ میں ڈوبی روکھے رسک کو دانتوں سے کتر رہی تھی۔
''تمہیں اسکول نہیں جانا۔''
ماں کی آواز پر نرمین نے ایسی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو، اسے جانا چاہیے۔
''تیار ہو جاؤ۔''
تب ہی افشاں شور مچاتی ہوئی آ گئی۔ نرمین نے چائے کے گھونٹ بھرے اور یونیفارم بدلنے کو بھاگی۔
بچے بھی اسکول چلے گئے...... ثمینہ چائے کا پیالہ انور حسین کے سرہانے رکھ گئی۔ وہ اب بھی جاگ رہا تھا۔
افشاں اور نرمین خدا حافظ کہہ کر جانے کو تھیں۔ جب ثمینہ شاپر لیے کمرے سے نکلی۔
''کہیں راستے میں کھڑا ہو گا۔ واپس کر دینا تاکہ اسے پتا چل جائے، تم ایسی ویسی لڑکی نہیں ہو۔''
افشاں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
''کم بخت...... تو نے سب کچھ خالہ کو بتا دیا۔ ایسی باتیں ماؤں کو بتائی جاتی ہیں؟'' اس نے دروازے سے نکلتے نکلتے نرمین کی کہنی دبوچی۔
''چھپائی بھی تو نہیں جاتیں۔'' ثمینہ دروازہ بند کرنے آئی تھی۔
''یاد رکھو، جو بات ماؤں سے چھپائی جائے وہ زمانے کے سامنے کھلتی ہے۔ جس میں سوائے بدنامی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔'' اس نے نرمی سے سمجھا کر کچھ پڑھ کر دونوں پر پھونکا اور انہیں گلی کے موڑ تک دیکھتی رہی۔
''وہ تمہیں اچھا نہیں لگا۔'' افشاں کا بالکل دل نہیں تھا، وہ تحفے واپس کرے۔
نرمین نے جواب نہ دیا۔
''کاش اس نے یہ تحفے مجھے دیے ہوتے۔'' افشاں نے حسرت سے آہ بھری۔
نرمین اب بھی خاموش تھی۔ کچھ بولنے کو دل ہی نہ کرتا تھا۔
وہ انہیں اس کے گھر کے سامنے مل گیا تھا۔ دروازے کو تالا لگا کر مڑا تو وہ رکشے کے دوسری طرف کھڑی

جنوری 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک

- "بیادِ ابن انشاء" ٭ نئے سال کے حوالے سے شاہین رشید کا سروے،
- اداکارہ "زینب احمد" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"، ٭ اس ماہ "عائشہ کیانی" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "دامنِ سحاب" مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول، ٭ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- "کنارِ خواب جو" فرح بخاری کا مکمل ناول، ٭ "سیماب" اُم ہانی کا مکمل ناول،
- "کانچ سے سائبان" مصباح علی سید کا ناولٹ، ٭ "آدم اور حوا" میمونہ صدف کا ناولٹ،
- "مجھے تیری ضرورت ہے" انعم خان کا ناولٹ،
- زارا مجید، عمارہ امداد، کنیز زہرہ اور اُم اقصیٰ کے افسانے اور مستقل سلسلے
- **"کرن کتاب"**

معلوماتی مضامین اور مزے دار ریسیپیز کے ساتھ۔

جنوری 2021ء کا شمارہ شائع ہوگیا

تھی۔ وہ بے اختیار آگے ہوا۔
نرمین نے شاپر رکشے کی سیٹ پر رکھا اور آگے بڑھ گئی۔
بنا دیکھے...... بنا کچھ کہے...... وہ اس کی محبت ٹھکرا گئی تھی۔ مراد خاموشی سے اسے دھند کی دبیز تہہ میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

کاکے کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ ساتھ ہی لمبی دھار باندھ کر چائے پیالے میں چھانی اور مراد کے سامنے رکھ دی۔ مراد نے پیالہ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ حسب روایت چائے خوش ذائقہ اور خوش رنگ تھی۔ مراد کا معمول تھا ناشتا یہیں کرتا تھا۔ نان کے ساتھ حلیم یا چنے...... مگر آج بس چائے پر اکتفا تھا۔
"تو نے کب سے یہ نوعمر لڑکوں والی حرکتیں شروع کر دیں۔"
"اس نے مجھے غلط سمجھا۔" مراد مایوس ہو گیا تھا۔
"پتر! تم نے اسے غلط سمجھا۔" کاکے نے ٹوکا۔ "عزت دار گھر کی لڑکی ہے۔ ایسے تحفے دیکھ کر خوش نہیں ہوگی۔ شکر ہے، اس نے تیرے منہ پر نہیں دے مارے۔"
"میں بھی اسے اپنی عزت ہی بنانا چاہتا ہوں۔"
"گھر بسانا چاہتا ہے۔" کاکے نے شفقت سے مراد کو دیکھا۔
"ہوں......" مراد نے سر ہلایا۔
"تو سیدھے سیدھے رشتہ لے جا۔"
"کون لے کر جائے گا۔ اور اکیلے لڑکے کو رشتہ کون دے گا؟"
"اس لیے تم نے سوچا، لڑکی پٹا لوں۔"
"ایسی بات نہیں ہے۔" مراد شرمندہ ہو گیا۔
"یار مر گئے ہیں، میں جاؤں گا۔ تیری گارنٹی بھی دوں گا۔ شکل وصورت تو ویسے شہزادوں والی ہے۔"
"واقعی۔" مراد نے خوش ہو کر پیالہ رکھا۔
"آپ سچ کہہ رہے ہو کاکا؟"
"ہاں...... پر وہ بندہ مجھے ٹھیک سے جانتا نہیں ہے۔ کیا پتا مجھ پر بھی اعتبار نہ کرے۔"
"تو......" مراد کا منہ لٹک گیا۔
"وہ اپنا منشی اکرم ہے نا، اس کا اس گھر میں آنا جانا ہے۔ اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔" کاکے کو مطلوبہ بندہ مل گیا تھا۔
"کاکا! وہ تو مجھے ویسے ہی پسند نہیں کرتا۔" مراد کو پکا یقین تھا۔ منشی کبھی اس کی گارنٹی نہیں دے گا۔
"تو بھی تو اس کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔"
"میں نے کون سا اس کی بھینس چرا لی ہے۔ ویسے ہی چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی ہے۔"
"اب کچھ دن اس کے ساتھ بنا کر رکھ، اور فکر نہ کر۔ میں بات کرتا ہوں۔ وہ ہمارے ساتھ رشتہ بھی لے کر جائے گا اور تمہاری گارنٹی بھی دے گا۔" کاکے کی تسلی پر بھی مراد کی ڈھارس نہیں بندھی تھی۔

☆☆☆

صاف ستھرا ڈرائنگ روم تھا۔ سفید ٹائلز والا...... جس میں جامنی صوفے رکھے تھے اور سفید جامنی پھولوں والے کشنز...... نیٹ کے پردے...... وہ اپنا اسکول بیگ ایک طرف رکھ کر تکلف سے کنارے پر بیٹھ گئی۔ پھر مزا

آیا تو تھوڑا پیچھے کو کھسک گئی۔

"ہائے کبھی ہمارے ہاں بھی ایسا صوفہ ہوگا۔"

ثمینہ کے جہیز کا صوفہ تو تھا مگر اب اس کی گدیاں بیٹھ گئی تھیں۔

"فرخ! مجھے کچھ کام کرنا ہے۔" اس نے کچھ دن پہلے فرخ سے کہا تھا۔

"کیسا کام؟" وہ چونک گیا۔

"پتا نہیں، کچھ ایسا جس سے مجھے کچھ پیسے مل جائیں۔ دیکھو، ساگ کی گٹھیاں باندھ باندھ کر میرے ہاتھ درد کرنے لگے ہیں۔ تمہیں تو اندازہ بھی نہیں ہے، اذان سے بھی پہلے اٹھ کر اوس میں بھیگے ساگ کی گٹھیاں باندھنا کیسا ہوتا ہے۔"

فرخ دردمندی سے اس کی ہتھیلیاں دیکھ گیا۔ انگلیوں کی پوروں پر ہرا رنگ مستقل رچ بس گیا تھا۔ اس نے ڈھونڈی تھی یہ ٹیوشن...... نرسری...... پریپ میں پڑھنے والے تین بچے۔ ننھے منے تمیزدار سے...... اسکول سے سیدھا وہ یہیں آتی تھی۔ ہاؤسنگ کالونی کے ای بلاک میں۔ جہاں غلام رسول نمبردار کے پوتے پوتیوں کو ٹیوشن چاہیے تھی۔ ان کی تیز طرار بہو نے اس کی تعلیمی قابلیت کو دیکھ کر بمشکل ایک بچے کے پانچ سو دینے منظور کیے تھے۔

اوپر سے فرخ کے کہنے پر اسے پانچ سو ایڈوانس بھی دینے پڑ گئے۔

پہلا دن تھا۔ اس نے اپنی ساری صلاحیت لگا دی اور جب وقت ختم ہوا تو بچے خوش تھے۔ انہیں اپنی چھوٹی سی ٹیچر پسند آ گئی تھی۔

واپسی کا سفر اکیلے تھا، مگر وہ مسرور تھی۔

مراد کے گھر کے سامنے اس کے قدم لاشعوری طور پر رک گئے۔

"دفع ہو...... خوامخواہ راستے میں آ جاتا ہے۔" وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

پریشان سی ثمینہ دروازے کے آس پاس ہی چکرا رہی تھی۔

"کہاں رہ گئی تھی نمو! افشاں تو کب کی گھر آ گئی۔"

"افشاں نے بتایا نہیں، اسکول میں ٹیچر کو کوئی کام تھا تو انہوں نے روک لیا۔"

وہ تھک گئی تھی، بیگ اٹھا کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"یہ اچھا اسکول ہے، خوامخواہ کام کروانے کے لیے روک لیتے ہیں۔ اس افشاں کو کیوں نہ روکا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں چل دی۔

"کہہ دینا ٹیچر سے آج کے بعد نہیں رکو گی۔ گھر سے اجازت نہیں ہے۔"

رات کو لائٹ چلی گئی تھی۔ انور حسین نے چھوٹی سی ٹارچ جلا کر رکھ دی۔ ثمینہ نے کھانا لا کر سامنے رکھ دیا۔

ثمرین نے دیکھا ابا لکڑ بگا بن کے دیوار پر چڑھ گیا ہے۔ ساتھ ہی ایک چھدری جھاڑی اگ آئی تھی جو یقیناً طلحہ کے سر کے بال تھے۔ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ فضہ نے چونک کر ثمرین کو دیکھا اور دونوں کو گویا مشغلہ مل گیا۔

کبھی جھاڑیوں میں سانپ نکالتیں تو کبھی ہاتھوں کے سائے سے چوہا دوڑا جاتا۔ جس وقت فضہ ابا کے سر پر سینگ بنانے کی کوشش کر رہی تھی، تب ہی نمو اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیروں میں چپل تھی کیہ اس دن کے بعد اس نے ایک بار بھی اپنا بند جوتا نہیں پہنا تھا۔ جب بھی پہنتی ابو کی حالت یاد آ کر جھرجھری آ جاتی۔

"ابو جی!" اس کے پکارنے پر نوالہ منہ میں ڈال کر انور حسین نے نرمین کو دیکھا۔

"یہ آپ اس منشی کو واپس کر دیں۔" اس نے ان کی طرف پانچ سو کا نوٹ بڑھایا۔ نجانے کیوں نرمین کو بھی لگتا تھا، پانچ سو کا نوٹ ہی اصل فساد کی جڑ تھا۔
ثمینہ اور انور حسین نوٹ دیکھ کر بت سے بن گئے۔

☆☆☆

اندر سے ڈھولک کی تھاپ اور لڑکیوں بالیوں کے قہقہے باہر تک آ رہے تھے۔ رنگ برنگی روشنیوں کی لڑیوں سے پورا گھر بقعہ نور بنا تھا اور کیوں نہ ہوتا، آخر ملک سرفراز کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔ یہ شادی کا موسم تو نہ تھا مگر مجبوری تھی لڑکے کو کویت واپس جانا تھا۔
ابھی لڑکے کے دوستوں نے ڈھول کے ساتھ مہندی لے کر آنی تھی۔
اور رات کو رانی کھسرے کا ڈانس بھی تھا۔
نمی ادھر اُدھر کاموں میں ہلکان ہونے کے ساتھ ساتھ مسرور سے محو انتظار تھے کہ لڑکے مہندی لے کر کب آتے ہیں۔ چولہے میں الاؤ جل رہا تھا۔ توے پر ایک کے بعد ایک روٹی پڑتی اور اترتی...... فضا میں بھنے گوشت کی خوشبو...... اور پلاؤ کی مہک گڈمڈ ہو رہی تھی۔ رشیداں نے سانس لینے کو ہاتھ روکا۔ تب ہی اندر سے ساجدہ بھاگتی ہوئی آئی۔
"ہائے رشیداں! آ کر دیکھ تو سہی، اندر ثریا نے کیسی رونق لگائی ہے۔"
("اسے اور آتا کیا ہے۔ باہر رانی کھسرا رونق لگائے گا اور اندر یہ۔")
برسوں ہوئے لفظ رشیداں کے اندر ادھم مچاتے سر پٹختے رہتے اور باہر وہ جو لب بھینچے، کان بند کیے یوں بن جاتی جیسے کچھ سنتی ہی نہ ہو۔ اب تو یاد بھی نہیں یہ حکم زباں بندی کب ملا تھا؟
بس اتنا یاد تھا اب تک اسی پرکار بند تھی۔
"چل بھاگ، کام کرنے دے۔" پھاتاں نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔
رشیداں نے تھکن زدہ ہاتھوں سے باقی پیڑے بنائے۔ روٹی ہاتھوں پر بیلی اور توے پر ڈالی۔ روٹی چرمراسی گئی۔ وہ دھک سے رہ گئی۔
رشیداں کی روٹی پر بل......
یہ تو پورے گاؤں میں مشہور تھا۔ چنگیز میں رکھی روٹیوں پر پرکار سے دائرہ کھینچ دو۔ مجال ہے کسی روٹی کا کنارہ باہر نکل جائے۔ پتلی اتنی کہ رومال کی طرح لپیٹ لو۔
"میں آج تھک گئی ہوں۔" اس نے خود کو تسلی دیتے اگلی روٹی ڈالی...... دوسری...... تیسری۔
ہر روٹی توے سے اترتے اترتے چرمرا جاتی تھی۔ بالکل اس کی زندگی کی طرح۔
"ہائے رشیداں! کیا کر رہی ہے۔ یہ روٹی مہمان کھائیں گے۔ چل تو سینک لے، میں پکاتی ہوں۔"
پھاتاں نے اسے اٹھا کر خود پیڑھی سنبھال لی۔
رشیداں نے دوسری طرف بیٹھ کر جلتی ہوئی کپاس کی من چھڈیاں باہر کھینچی اور نارنجی آگ کی روشنی میں اپنے ہاتھ کو دیکھا۔
اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔
اس کے ہاتھ میں رعشہ اتر آیا تھا۔

☆☆

باقی آئندہ ان شاء اللہ

حمیرا شفیع

ماہ دسمبر کا آغاز ہو چکا تھا۔ فضا میں بڑھتی ہوئی خنکی کی وجہ سے اب کچن کی حرارت اور گرمی جسم و جان کو نہایت سکون بخش محسوس ہوتی تھی۔

اس لیے آج فاریہ بی بی دروازہ نیم وا کیے مزے سے ناشتا بنا رہی تھیں۔ ورنہ گرمیوں میں یہی فاریہ پسینے سے شرابور ہنڈیا میں دو چار الٹے سیدھے چمچ گھما کر

لاؤنج کی جانب بھاگنے کی کرتی تھی۔ مگر اس وقت سکون سے کھٹا کھٹ مولی بھرے پراٹھے اتارے جارہی تھی۔ ادھ کھلے دروازے سے سوندھی سوندھی سی مہک باہر تک جارہی تھی۔ اشعر کسی کام سے ادھر آنکلا تو مزے دار خوشبو سے بے قرار ہوکر جھٹ کچن میں جھانکا۔

"واؤ! آج تو ناشتا بڑا شان دار ہے۔" مولی بھرے پراٹھے اور پودینے کی چٹنی سے لبالب بھرے باؤل پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ہاں! آج چھٹی ہے تو میں نے سوچا کہ تم لوگوں کے عیش ہی کروادیے جائیں۔" اس نے بے نیازی سے سر جھٹکا۔

"شکریہ، نوازش، کرم، مہربانی......!" اشعر نے جھٹ ایک گرما گرم پراٹھا پلیٹ میں منتقل کیا۔ فاریہ نے ایک کٹوری میں اس کے لیے چٹنی نکالی۔ اشعر نے ایک کے بعد دوسرے پراٹھے کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فاریہ نے جارحانہ انداز میں فوراً اس کا ہاتھ پرے جھٹکا اور پھر ہاٹ پاٹ کا ڈھکن مضبوطی سے بند کردیا۔

"سب کے لیے ایک ایک ہی بنایا ہے۔" وہ کچھ بے مروتی سے بولی۔

"مگر مجھے تو ایک اور دے دو۔" اشعر کا لہجہ خوشامدی ہوا۔

"ہرگز نہیں......تمہارے لیے بھی ایک ہی کافی ہے۔ ابھی پرسوں تک تو تم ڈائنگ کا اعلان کرتے پھر رہے تھے۔"

"ایسے اعلانات تو میں ہر دوسرے چوتھے روز کرتا ہی رہتا ہوں اور میں اکثر بھول بھی جاتا ہوں۔" وہ اک شان بے نیازی سے بولا۔

"مگر میں اس بار تمہیں بھولنے نہیں دوں گی۔"

وہ تنک کر بولی اور ساتھ ہی باہر جانے کا اشارہ کیا تو وہ بڑبڑاتا ہوا کچن سے نکل گیا۔

پھر اس نے نہایت قرینے سے ایک ٹرے میں ناشتے کے لوازمات کررکھے اور اماں ابا کے کمرے میں پہنچا آئی۔ کچن میں دوبارہ آکر اس نے الماری سے ایک ڈبہ نکالا۔ ایک پراٹھے کو تہہ کرکے نہایت احتیاط سے اس میں رکھا۔ پھر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں چٹنی بھی نکالی اور اس کو بڑے ڈبے میں رکھ کر ڈھکن بند کردیا۔ باہر نکل کر اس نے ایک محتاط سی نظر صحن میں ادھر ادھر ڈالی۔

اپنے آنچل کو پھیلا کر ڈبہ اس کے نیچے چھپایا اور پھر دبے پاؤں اوپر جاتی سیڑھیوں کا رخ کیا۔

چھت پر پہنچ کر اس نے پاس ہی اوندھے پڑے ایک اسٹول کو سیدھا کیا اور پھر اسے اٹھا کر دیوار سے لگایا۔ اس پر چڑھ کر ساتھ والی چھت پر جھانکا۔ سامنے کونے میں ذرا سی دھوپ نیچے اتری ہوئی تھی اور اس ذرا سی دھوپ میں ہی کرسی ڈالے ہادی بیٹھا تھا۔ وہ سرمئی دھاری دار شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔

موصوف نے چند ماہ پہلے ہی شعروشاعری کا آغاز کیا تھا۔ شومئی قسمت کالج کے میگزین میں اس کی دوچار نظمیں بھی لگ چکی تھیں تو اب اس نے خود کو بالکل وصی شاہ ہی سمجھنا شروع کردیا تھا۔ اکثر استغراق کے عالم میں نظر آتا۔

"ہش......ہش......ہادی......ہادی۔" اس نے نیچی آواز میں پکارا مگر اس نے کوئی ردعمل نہ دیا اور مسلسل غائب دماغی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"ہادی......!" اب کے اس نے جھنجلا کر تھوڑا زور سے پکارا۔

"کیا ہے......؟" اب کے اس کے بت میں جان پڑی اور وہ بے زاری سے بولا۔

"میں تمہارے لیے یہ لائی ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھ اوپر کرکے ڈبا ہوا میں لہرایا۔

ہادی کی سستی ایک منٹ میں اڑن چھو ہوگئی اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا قریب آیا۔

"کیا آمد ہورہی تھی......" فاریہ نے طنزاً کہا۔

"نہیں یار......خالی پیٹ کیا خاک آمد ہوگی۔"

اس نے جھٹ ڈبہ اس کے ہاتھ سے لے کر ڈھکن اٹھایا۔

"واہ! پراٹھا" اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"خالی پیٹ کیوں......؟ کیا چچی نے آج ناشتا نہیں بنایا......؟" وہ اچنبھے سے پوچھنے لگی۔

"نہیں یار...... رات ان کے جوڑوں میں درد تھا۔ دوا کھا کر سوئی تھیں۔ ابھی تک نہیں اٹھیں۔" اس نے چھوٹی ڈبیا کھول کر چٹنی کا ایک گھونٹ بھر کر چٹخارہ لیا۔

"اچھا سنو! برتن فارغ ہو جائیں تو نیچے اسٹول پر رکھ دینا، میں آ کر اٹھا لوں گی۔" وہ جانے کے لیے پلٹی۔

"ارے سنو......! رکو تو سہی۔" اس نے پکارا۔

"میں نے کل رات ایک نظم لکھی ہے۔ سنو گی نہیں......؟"

"نہیں ہادی! پھر کبھی سہی۔ آج نانو آ رہی ہیں۔ گھر میں بہت کام ہے۔"

"ہیں، تمہاری نانو آ رہی ہیں۔ واہ بھئی...... اس کا مطلب ہے خوب مزے مزے کی چیزیں بھی ہمراہ لائیں گی۔" اس کا لہجہ رال ٹپکاتا ہوا تھا۔

"فکر نہ کرو...... تمہارا حصہ ضرور رکھوں گی، ندیدے کہیں کے......!"

وہ چمک کر بولی اور پھر تیزی سے نیچے اترتی چلی گئی۔

☆☆☆

لاؤنج میں خوب ہنگامہ برپا تھا۔ نانی اماں تشریف لا چکی تھیں۔ وہ کمزور جان تھیں۔ فقط دو تین گھنٹوں کے سفر نے ہی انہیں بری طرح سے نڈھال کر دیا تھا۔ اس لیے آتے ہی ہائے ہائے کرتے ہوئے لاؤنج میں رکھے صوفے پر ہی ڈھیر ہو چکی تھیں۔ فاریہ فوراً بھاگ کر کمبل اٹھا لائی اور انہیں اوڑھا دیا اور اب وہ مسلسل ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

وہ اپنے ساتھ حسب معمول گاؤں کی ڈھیروں ڈھیر سوغات بھی لائی تھیں۔ اشعر ملازم کی مدد سے وہ سب سامان سمیٹ بھی رہا تھا اور ساتھ اس پر اچھا خاصا ہاتھ بھی صاف کرتا جا رہا تھا۔

"ذرا دھیان سے، کوئی چیز ضائع نہ کر دینا۔" شکیلہ بیگم پاس ہی کھڑی تھیں۔ وہ دودھ سے بھری بوتلیں بے دھیانی سے اٹھا رہا تھا۔ ان کی نظر پڑی تو فوراً ٹوک دیا۔ اس کے منہ میں بیسن سے بنی مٹھائی کا ایک بڑا سا ٹکڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس لیے بولنے سے قاصر تھا۔ ماں کی بات کی فقط سر ہلا کر تائید کی۔

"ارے شکیلہ......! تم بچوں کے ساتھ خود ہی مجھ سے ملنے آ جایا کرو۔ مجھ سے نہیں ہوتا سفر۔ مانو کہ جوڑ جوڑ ہل کر رہ گیا ہے۔" نانی اماں ایک بار پھر کراہیں۔

"کیا کروں اماں...... دونوں بچے پڑھ رہے ہیں۔ کبھی ایک کے امتحانات، کبھی دوسرے کے...... اگر دونوں فارغ ہوں تو ان کے ابا مصروف ہوتے ہیں۔ میں کیسے آ سکتی ہوں......؟" وہ بے چارگی سے بولیں۔

"فاریہ بیٹا! یہ تمہارے بالوں کو کیا ہوا ہے......! کتنے گھنے تھے مگر اب کیسے چوہیا کی دم جیسے دکھ رہے ہیں۔"

اب کے نانو نے اپنا رخ روشن فاریہ کی جانب کیا تو ان کی تشبیہ پر شکیلہ بیگم بے اختیار مسکرا دیں جبکہ فاریہ نے دہل کر اپنی چٹیا پر ہاتھ پھیرا۔ واقعی بال پہلے سے بہت ہلکے لگ رہے تھے۔

"یہ لڑکی نہ تو دودھ پیتی ہے اور نہ ہی بالوں میں تیل ویل لگاتی ہے۔ بس آئے روز نت نئے شیمپو بدلنے کا شوق ہے۔"

شکیلہ بیگم نے نانی اماں سے شکایتی انداز میں کہا تو فاریہ اپنی جگہ پر کھسیا کر رہ گئی۔

☆☆☆

خوب بڑے سارے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کے بالکل بیچوں بیچ چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے نانی اماں بیٹھی تھیں اور ان کے سامنے نیچے چوکی پر فاریہ بیٹھی تھی۔ نانی کے پاس ہی ایک کٹوری دھری تھی جس میں دو تین قسم کے خالص تیل ملا کر ڈالے گئے تھے اور وہ اپنی نرم انگلیوں سے اس کے بالوں میں ان سے مساج کر رہی تھیں۔ نانی اماں مالش کے ساتھ ساتھ تواتر سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ غنودگی سے جوں ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں تو وہ اس کے سر پر دھپ سے ایک چپت رسید کرتے ہوئے کہتیں۔

"ارے فاریہ! سن رہی ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔"
وہ فوراً بند ہوتی آنکھیں کھول کر چوکس ہو جاتی اوران کے سوالوں کے جواب دینے لگتی۔

"فاری ......! تم اپنی چچی کے پاس جاتی ہو کیا......؟" اب کے ان کی آواز سرگوشی نما تھی مگر چچی کے ذکر پر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"نہیں نانو...... بالکل نہیں اماں کے ہاتھوں قتل ہونا ہے کیا......! آپ کو پتا تو ہے کہ دونوں گھروں میں کتنا زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ تب سے بول چال، آنا جانا سب بند ہے۔ بس کبھی کبھار ہادی سے بات ہو جاتی ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"یہ تو ٹھیک نہیں ہے بیٹا! خون کے رشتے تو بڑے مضبوط ہوتے ہیں ایسے چھوٹے موٹے جھگڑوں سے وقتی طور پر کمزور تو پڑ جاتے ہیں مگر ٹوٹتے نہیں ہیں۔"

"مگر نانی اماں !...... آج کل تو دھن دولت کا رشتہ زیادہ مضبوط ہو گیا ہے جس کے مقابلے میں خون کے رشتے ریشم کی ڈور سے بھی زیادہ نازک ثابت ہوتے ہیں۔"

وہ دل گرفتگی سے بولی تو چند لمحوں کے لیے نانی کی مساج کرتی ہوئی انگلیاں تھم گئیں اور پھر کچھ دیر بعد انہوں نے دوبارہ زور زور سے ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔

☆☆☆

رفیق احمد اور شفیق احمد دو بھائی تھے۔ دونوں کی عمروں میں تو تقریباً چار سال کا فرق تھا اور مگر شادیاں دونوں کی اکٹھے ہی ہوئی تھیں۔ چھوٹے شفیق احمد کو تو اللہ تعالیٰ نے شادی کے سال بعد ہی ایک خوب صورت صحت مند بیٹے سے نوازا مگر بڑے رفیق احمد سات سال تک اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔

پھر قدرت ان پر مہربان ہوئی اور ٹھیک سات سال بعد ان کے آنگن میں بھی رحمت اتری۔ دونوں گھر ہی خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے کیونکہ ان کے خاندان میں بیٹیاں خال خال ہی تھیں۔ خود ان کی اپنی بھی کوئی بہن نہ تھی۔ اس کے دو سال بعد دونوں بھائی ایک ساتھ ہی نعمت سے نوازے گئے۔

اب دونوں کے دو دو بچے تھے۔ رفیق احمد کی بیٹی فاریہ اور بیٹا اشعر شفیق احمد کے دو بیٹے شرجیل اور ہادی۔

دونوں بھائیوں کی فیملی بڑھ گئی تھی۔ گھر تو بہت بڑا تھا مگر کمروں کی تعداد محدود تھی۔ اس لیے خاندان کے ایک سیانے کے مشورہ پر بار بار خرچا کرنے کے بجائے اسی گھر کے درمیان سے دیوار اٹھا کر دو پورشن بنا دیے گئے اور دونوں خاندانوں نے اپنی اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق تعمیری اعتبار سے کچھ ضروری تبدیلیاں بھی کروالیں۔

یوں آبائی گھر کی تقسیم کا مرحلہ تو بخوبی نمٹ گیا۔ مگر ان کے والد مرحوم نے ترکے میں گھر کے علاوہ ایک دکان بھی چھوڑی تھی۔ وہ فی الحال کرائے پر چڑھا رکھی تھی کیونکہ دونوں بھائی ملازمت پیشہ تھے اور باپ کے کاروبار سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

دونوں کی مشترکہ رائے تھی کہ جونہی دوکان کے اچھے دام ملیں فروخت کر دی جائے۔

☆☆☆

وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور بچے بڑے ہوتے گئے۔ کزنز میں سب سے سینئر شرجیل تھا۔ جو کئی سال تک دونوں گھروں کا اکلوتا بچہ ہونے کی حیثیت سے لاڈ پیار اٹھواتا رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک نہایت ذہین، سلجھا ہوا اور باادب بچہ تھا۔ ماں باپ کے ساتھ ساتھ تایا اور تائی کا بھی چہیتا تھا۔ باقی بچوں کی نسبت اب بھی اسے زیادہ پروٹوکول دیا جاتا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب شرجیل احمد نے امتیازی نمبروں سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی پورے خاندان کی جانب سے اس پر تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسائے جا رہے تھے اور وہ غبارے کی مانند پھولا پھولا سا ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ مگر اس غبارے میں جلد ہی ساری ہوا نکل گئی جب اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور اپنی شان دار ڈگری کی بدولت جگہ جگہ جوتیاں چٹخانے پر بھی اسے بامشکل چند ہزار کی نوکری ہی مل سکی۔

وہ سخت پژمردہ اور روٹھا روٹھا سا رہنے لگا۔
باپ اور تایا کا خیال تھا کہ وہ چند ہزار کی نوکری کرنے کے بجائے دادا مرحوم کا کاروبار سنبھال لے جبکہ اس کا جوشیلے جذبات سے لبریز دل یہ بات قبول نہیں کر رہا تھا کہ اس کے باپ اور تایا نے خود تو واجبی سا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ملازمت کو ترجیح دی تھی جبکہ اسے اتنا شان دار تعلیمی پس منظر رکھنے کے باوجود دکان سنبھالنے پر اکسایا جا رہا تھا۔
اب اس نے راتیں کالی کر کے ایم بی اے کی ڈگری سلنڈروں میں گیس بھرنے کے لیے تو نہیں لی تھی۔
اپنے جذباتی پن میں وہ یہ بات نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کے باپ اور تایا کے زمانے میں معمولی تعلیم یافتہ کو بھی اچھی نوکری ملنا محال نہیں تھا جبکہ فی زمانہ تو اس سے بھی شان دار تعلیمی اسناد رکھنے والے رلتے پھر رہے تھے۔
ابھی وہ گومگو کی کیفیت میں تھا کہ اس نے اور اس کے چند دوستوں نے اپنی اپنی سی وی بیرون ملک بھجوا رکھی تھیں۔ خوش قسمتی سے تین لوگوں کا انتخاب ہو گیا تھا جن میں ایک وہ بھی شامل تھا۔
فی الحال تو ان کو چھ ماہ کی آزمائشی جاب کی آفر کی گئی تھی۔ کارکردگی کا جائزہ لینے کے بعد اس میں توسیع یا تنسیخ کی جا سکتی تھی۔
شرجیل کے دوست اسے بھی اس جاب کے لیے تیار کر رہے تھے۔ مگر مسئلہ سفری اخراجات اور رہائش کا تھا۔ شفیق احمد کے پاس تو اتنی اضافی رقم موجود نہیں تھی۔ بھائی کے بچے بھی پڑھ رہے تھے۔ ان کی مالی حالت میں بھی اتنی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ فقط ایک دوکان کا آسرا تھا۔ اگر وہ اپنا حصہ بیچ کر پیسوں کا انتظام کر بھی لیتے تو اس میں بھی خاصا رسک تھا۔ کیونکہ شرجیل کو فی الحال صرف چھ ماہ کی جاب آفر ہو رہی تھی۔ اگر اس میں توسیع نہ ہو پاتی یا وہ کسی متبادل جاب کا بندوبست نہ کر پاتا تو ان کا لگا لگایا سارا سرمایہ ڈوب جاتا۔
شرجیل تو اپنے حساب سے سوچ رہا تھا مگر ان کے اپنے تحفظات تھے۔ اس لیے انہوں نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا۔

اسی اثنا میں انہیں اپنی دکان کے بھی اچھے دام مل رہے تھے۔ سودا تقریباً طے پا چکا تھا۔ شرجیل کے ہی ایک دوست کے چچا دوکان خرید رہے تھے۔
رفیق احمد اور شفیق احمد دونوں اسی وقت کو دکان کی فروخت کے لیے مناسب سمجھ رہے تھے کیونکہ وہ مشترکہ طور پر گاؤں میں کچھ زرعی زمین خریدنا چاہ رہے تھے جو ان کا ایک چچا سستے داموں بیچ رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ زمین کو ٹھیکے پر چڑھا کر کچھ اضافی آمدنی کا سبب بن جائے گا۔ بیعانے کی رقم مل چکی تھی اور باقی رقم گاہک نے مقررہ تاریخ پر ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔
مقررہ تاریخ پر رقم تو نہ ملی البتہ اس سے اگلے دن شرجیل کی ماں کو اس کے خالی کمرے میں تکیے کے نیچے دبا اس کا ایک خط ملا۔ وہ خط کیا تھا ایک چھوٹا موٹا سا ایٹم بم تھا جو اس وقت ان کے سر پر پھٹا۔ اس نے چند سطروں میں صاف صاف لکھا تھا کہ وہ دوست کے چچا سے تمام رقم وصول کر کے بیرون ملک سدھار رہا ہے۔ ہو سکے تو اسے معاف کر دیا جائے۔ وہ جلد ہی دونوں گھروں کا ادھار چکانے کی کوشش کرے گا۔
ماں نے کانپتے ہاتھوں سے وہ خط جب باپ کو دکھایا تو اسے پڑھتے ہی غم و غصے کی زیادتی سے انہوں نے اسے پرزے پرزے کر دیا۔
جب اس حادثے کی خبر دیوار پار بھائی بھاوج تک پہنچی تو دونوں کو ہی یہ ٹوپی ڈرامہ لگا۔ بھلا ایک نہایت سعادت مند اور سلجھا ہوا بچہ ماں باپ کو اعتماد میں لیے بغیر اتنا بڑا قدم اکیلے کیسے اٹھا سکتا تھا۔
یقیناً یہ ان کی ملی بھگت سے ممکن ہو سکا تھا۔ پھر خاندان والوں کی بات نے بھی بھرپور چنگاری کا کام کیا۔ یوں ایک بڑے جھگڑے کے بعد دونوں گھروں کے تعلقات کشیدہ ہوتے ہوتے ختم ہو گئے۔

☆☆☆

دوسری طرف شرجیل احمد جس نوکری کو حلوہ سمجھ کر بیرون ملک سدھارے تھے۔ وہ لوہے کے چنے چبانے سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوئی۔
پورا مہینہ گدھوں کی طرح کام کر کے جو ایک

اچھی خاصی معقول رقم ہاتھ آتی وہ حلال خوراک کے حصول اور دیگر اخراجات کی مد میں اڑن چھو ہو جاتی۔ گھر سے جو رقم وہ ہتھیا کر لائے تھے وہ ڈالروں میں تبدیل ہو کر اتنی کم رہ گئی تھی کہ بامشکل اس سے چند فٹ کی رہائش گاہ کا ہی انتظام ہو سکا تھا۔ پھر ایک معمولی غفلت پر وہ عارضی ملازمت بھی ختم ہو گئی اور اپنے وطن کی کلرکی کو لات مار کر آنے والے کو ہوٹل کے گندے برتن دھونے پڑے، باتھ روم تک صاف کرنے پڑے اور گیراج وغیرہ کی صفائی کرنی پڑی تو اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔

کئی سالوں کی ان تھک محنت کے بعد وہ اپنے پاؤں غیر زمین پر جما سکا پھر جب کچھ رقم پس انداز کرنے کے قابل ہوا تو سب سے پہلے رقم کا چیک اس نے اپنے تایا کے نام ہی بھیجا۔ پھر مزید کچھ سالوں تک وہ آدھی پونی رقم کا ادھار چکانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مگر تب تک دونوں گھروں کے بیچ بدگمانیوں اور رنجشوں کی دیوار اس قدر بلند ہو چکی تھی جس کا پاٹنا ممکن نہ رہا تھا۔

☆☆☆

حالات و واقعات سے بے نیاز وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی 2020ء آیا تھا اور ابھی چلا بھی گیا۔ حالانکہ پورے بارہ ماہ بیت گئے تھے اور ہم ایک اور نئے سال کی دستک سن رہے تھے۔

یہ سارا سال تو ایک عالمی وبا سے نبرد آزما ہی گزرا تھا۔ بیماری کا خوف، معاشی عدم استحکام، لاک ڈاؤن کے اثرات اور غیر یقینی مستقبل نے ہر ذی ہوش کو خدشات میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کچھ خوشی کچھ غم کی ملی جلی کیفیات لیے سب ہی خود کو نئے سال کے استقبال کے لیے تیار کر رہے تھے۔

فاریہ بی بی یوں تو پہلے بھی نئے سال کی آمد پر بہت زیادہ ہلے گلے کی شوقین نہ رہی تھیں۔ بس اتنا ہوتا کہ اپنے ہاتھ سے کارڈز وغیرہ بنا کر دوستوں کو وش کر لیتی۔

ہاں البتہ وہ نئے سال کی صبح اپنے ہاتھوں سے ایک بڑا سا کیک ضرور بیک کرتی تھی۔ پھر وہ پہلی صبح بابا کے کمرے میں اکٹھے ناشتہ کرتے۔ چاچا چچی کی فیملی بھی شریک ہوتی۔ امی اور چچی مل کر ناشتہ بناتیں۔ خوب رونق ہوتی تھی مگر اب تو یہ خواب وخیال کی باتیں لگتی تھیں۔

اس بار تو اس کا بالکل بھی دل نہیں تھا مگر اشعر رات کو ہی کیک بنانے کے لیے سارا سامان لے آیا تھا۔ ناچار صبح اٹھ کر اسے کیک بیک کرنا پڑا۔ کیک کو ٹھنڈا ہونے کے لیے کچن کی ٹیبل پر رکھ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس نے ابھی اپنی ایک دو دوستوں کو وش کرنا تھا۔ موبائل کھولا تو باکس بھرا پڑا تھا۔

ایک میسج پڑھتے ہوئے وہ چونک گئی۔ الفاظ مانوس سے تھے۔ نیچے دیکھا تو S.A لکھا تھا۔ اس کے دل نے ایک بیٹ مس کی۔ یہ تو شرجیل بھائی کا میسج تھا۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی انہوں نے اسے اپنے مخصوص انداز میں وش کیا تھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ سب کزنز تو آپس میں شیر و شکر ہی تھے بس مسئلہ تو بڑوں کی خود ساختہ انا کا تھا۔ نجانے بچوں کے دل اتنے بڑے اور بڑوں کے دل اتنے چھوٹے کیوں ہوتے ہیں۔

میسج پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی سی چمکی اور بے شمار خوب صورت یادیں ذہن کی اسکرین پر روشن ہو گئیں۔

ہر سال جب وہ نئے سال کا کیک بیک کرتی تھی تو اسے کاٹنے پر ان تمام کزنز میں جھگڑا ہو جایا کرتا تھا۔ ہر کوئی خود کیک کاٹنا چاہتا تھا پھر سب کی مشترکہ رائے سے قرعہ فال شرجیل بھائی کے نام نکلتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک گھڑ دوشیزہ کی طرح نہایت نفاست سے کیک کے بالکل ایک سے پیس کاٹتے تھے۔

اس نے آنچل کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ بابا کے کمرے سے کچھ ملی جلی آوازوں کا شور آ رہا تھا۔ غالباً تمام گھر والے ناشتے کے لیے پہنچ چکے تھے۔

وہ کیک اٹھانے کچن میں گئی تو کیک غائب تھا۔ شاید اشعر اٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے

قدم اٹھاتی ہوئی بابا کے کمرے کے دروازہ پر پہنچی تو اندر کا منظر دیکھ کر ساکت رہ گئی۔

سامنے سینٹر ٹیبل پر کیک دھرا تھا اور بابا کے بیڈ کے پائینتی وہی بیٹھے تھے۔ ہاں بلاشبہ وہی تھے۔ شرجیل بھائی۔ اس نے بار بار آنکھیں جھپک کر دیکھا تو وہ حقیقت میں شرجیل بھائی ہی تھے۔ بیڈ کی دوسری طرف چچا چچی بھی موجود تھے۔

''آؤ گڑیا......''

سب سے پہلے شرجیل بھائی کی ہی اس پر نظر پڑی تو انہوں نے وہی پرانے لب و لہجے میں پکارا۔ اس کے ساکت بت میں جان سی پڑ گئی اور وہ بھاگ کران کے پہلو سے آ لگی۔

اچانک کسی کی گھٹی گھٹی سی چیخ پر اس نے پلٹ کر دیکھا تو ہادی اپنی ٹانگ پکڑے دہرا ہوا دکھائی دیا۔ وہ شاید پہلے ہی نیچے کارپٹ پر بیٹھا تھا اور اس نے انجانے میں اس کے گھٹنے پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ اس نے جلدی سے گھبرا کر پاؤں ہٹایا تو کمرے میں موجود تمام افراد زیر لب مسکرا اٹھے۔

☆☆☆

نانی اماں گاؤں میں صبح سویرے سیر کی عادی تھیں۔ یہاں آ کر معمول ترک کیا تو چند ہی روز میں ان کے گھٹنے جڑ گئے۔ پھر وہ یہاں بھی کبھی اشعر اور کبھی فاریہ کے ہمراہ واک پر جانے لگیں۔

روز صبح وہ بہت آنا کانی کے بعد ان کے ہمراہ جاتے۔ اس روز وہ اکیلی ہی کالونی کا چکر لگانے نکل کھڑی ہوئیں۔ واپسی پر جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچی تو عین اس وقت ساتھ والے گھر کے پاس ایک ٹیکسی آ رکی۔ اس میں سے شرجیل باہر نکلا۔ نانی کو دیکھ کر وہ احتراماً رک گیا اور انہیں سلام کیا۔

نانی اماں نے خوب لپٹا کر پیار کیا۔ شفیق احمد بھی بیگم کے ہمراہ بیٹے کے استقبال کے لیے دروازے پر موجود تھے۔ وہ بھی کچھ جھجک کر آگے بڑھے تو نانی اماں سلام دعا کے بعد انہیں بھی بصد اصرار گھر کے اندر ہی لے آئیں۔

وہ تو شاید پہلے ہی ایسے کسی موقع کی تلاش میں تھیں۔ پہلے تو رفیق صاحب نے چھوٹے بھائی کو دیکھ کر منہ پھیر لیا مگر جب چھوٹے بھائی نے ''بھائی جان'' کہہ کر ان کے گھٹنوں کو چھوا تو سالوں سے جمی لاتعلقی کی برف چند لمحوں میں ہی پگھل گئی اور انہوں نے بھائی اور بھتیجے کو گلے سے لگا لیا۔

نانی اماں اسے آہستہ آہستہ بتا رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ وہ درست کہا کرتی تھیں۔ خون کے رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ ٹوٹتے نہیں ہیں بس کمزور پڑ جاتے ہیں اور آپس میں ناراضی کی صورت میں صلح کے لیے ہمیشہ ''پہل'' کے منتظر رہتے ہیں۔

آج بھی اگر نانی ہمت کر کے دو گھروں کے بیچ ''پل'' کا کام نہ کرتیں تو نجانے اس ''پہل'' کے انتظار میں مزید کتنے سال اور گزر جاتے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

منظر نہایت خوش گوار تھا۔ امی اور چچی باتوں میں یوں مشغول تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آنسوؤں کی برسات تمام رنجشیں بہا کر لے گئی تھی۔

وہ کچن میں سب کے لیے چائے بنانے گئی تو سامنے شیلف پر دھرے اس کے موبائل کی اسکرین روشن تھی۔ ہادی نے اپنی نظم میسج کی تھی۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ زیر لب مسکراتے ہوئے پڑھنے لگی۔

نظم

ایک ہی زندگی ہے
کتنی چھوٹی سی
اتنی چھوٹی سی زندگی میں
اتنے بڑے بڑے غم نہ پالو تم
گلے شکوے سارے بھلا دو تم
اور کھل کے مسکرا دو تم

ہاں
ایک ہی زندگی ہے
کتنی چھوٹی سی

نعیمہ ناز

دوپہر ڈھل رہی تھی، پھولوں کا پتا نہیں کھل رہے تھے کہ نہیں، بریرہ کو تو بس یہ معلوم تھا کہ جسم کا جوڑ جوڑ ہل رہا ہے۔ تین افراد تھے فقط اور سامان اتنا کہ درجن بھر افراد کا کنبہ ہو۔

الگ الگ کارٹن میں سارا مال و متاع پیک کر کے ان پہ ٹیپ لگائے، فہرست بنائی، اب جب کہ وہ سارا فرنیچر اور کارٹن جو درجن بھر سے زیادہ ہی تھے۔ اس نئے فلیٹ کے لاؤنج اور کمروں میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کشن ترتیب سے رکھ کر ان پہ بے سدھ لیٹی بریرہ کی آنکھیں بند تھیں فقط منہ کھلا ہوا تھا اور زبان چل رہی تھی۔

"پیزا آرڈر کر دیا؟ بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے، جب فوت ہو جاؤں گی تب منگوائیں گی، میری بھتی (کڑوی روٹی) میں دوسروں کو کھلائیں گی۔"

بریرہ کے ذخیرہ الفاظ میں بہت سے ایسے الفاظ شامل ہو گئے تھے جو انا بی کی زبان پہ رہتے تھے اور اب نئی نسل کی یہ محترمہ انہیں فراٹے سے استعمال کرنے لگی تھیں۔

"ویسے تمہاری ندیدی اور چٹوری سہیلیوں کو پیزا کافی نہیں ہوگا ساتھ میں شوارما، زنگر، ملائی بوٹی، تکہ بوٹی اور کولڈ ڈرنک بھی چاہیے ہوں گے، فوت ہونے کا ارادہ ہو تو کچھ اماؤنٹ چھوڑ کے جانا میرے پاس جو قارون کا خزانہ تھا، وہ اب پاکستانی خزانہ بن گیا ہے۔"

پھپھو جانی نے بڑے پیار سے اطلاع دی بلکہ اطلاع کہاں یہ تو بریکنگ نیوز تھی، بریرہ تڑپ کر اٹھی اور اٹھ کر تڑپی۔

"لاکھوں روپے تھے، پانچ سال میں ہی ختم ہو گئے؟"

"کتنے لاکھوں؟ ٹوٹل چار لاکھ روپے تھے۔ روپے۔" انہوں نے روپے پر زور دے کر کہا۔ "ڈالر
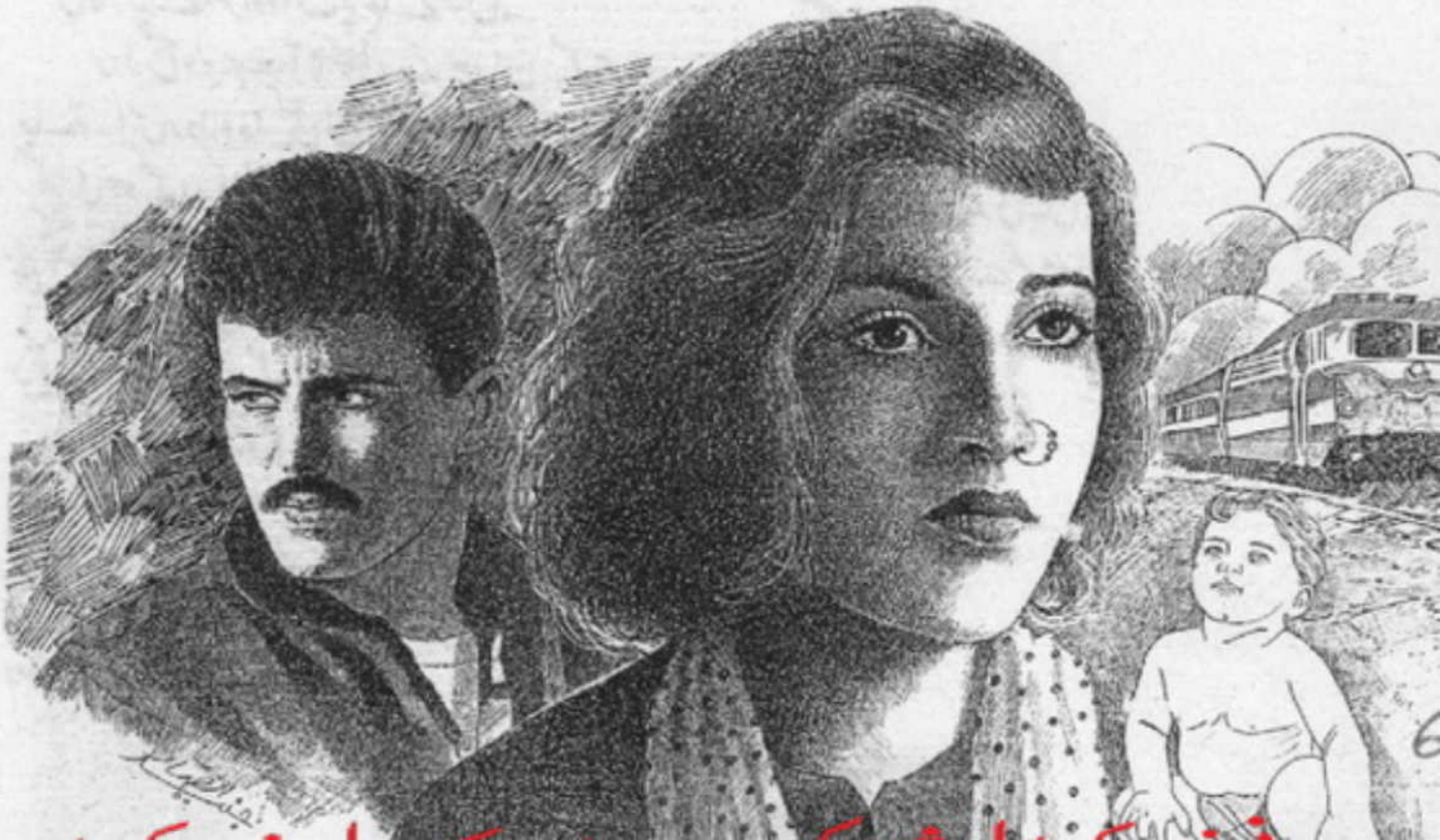
مکمل ناول

نہیں تھے، نہ یورو، پاؤنڈ اور درہم و دینار جو بانڈ کھلاتا تھا ہم دونوں کا......"

صوفے پہ آڑی ترچھی لیٹی پھپھو نے تفصیل سے اسے سمجھایا۔

"مگر وہ خرچ کہاں ہوئے؟" بریرہ ابھی تک بیٹھی حساب پوچھ رہی تھی۔

"کہاں ہوئے کیا مطلب؟ یہ جو تم آئے دن "ڈیلز" منگواتی رہتی ہو، برانڈڈ چیزوں کی شاپنگ کرتی ہو، تمہارے ہی فرمائشی پروگرامز پہ سارا بینک بیلنس صفر ہو گیا اور ہاں یاد آیا میرے موبائل کا بیلنس بھی صفر ہے، ڈیل منگوانی ہے تو خود آرڈر کرو اور بل بھی خود ہی پے کرنا، اپنا بھی میرا بھی۔" پھپھو نے آرڈر کرنے سے پہلے اپنا آرڈر جاری کیا۔

"پھپھو! سیلری ملنے میں چار دن باقی ہیں، پرس خالی ہو چکا ہے۔ کہاں سے نکالوں نوٹ؟" بریرہ عرف بیلی جھنجھلا اٹھی۔

"بیلی تو تو ہے ہی سدا کی کنجوس، مکھی چوس۔" پھپھو نے اپنی ازلی سستی اور کاہلی کے ساتھ انگڑائی لی۔

"اللہ، کتنا تھک گئی ہوں میں۔"

اس نے صوفے کے نیچے اور آس پاس ہاتھ مارا، موبائل اٹھایا اور آرڈر کرنے لگی۔

"تھکن تو ایسی ہو رہی ہے آپ کو جیسے پتا نہیں کتنا کام کروایا ہے میرے ساتھ۔"

بیلی کی تو جان ہی جل کے رہ گئی۔ "اگر حکم چلانا بہت بڑا کام ہے اور اس سے تھکن بھی ہوتی ہے تو یقیناً محترمہ بہت بری طرح تھک گئی ہوں گی۔" وہ دوبارہ کشنز پہ لیٹ گئی۔

"کھانا کھا کے سامان سیٹ کروانا ہے، کم از کم کچن کی چیزیں تو نکلوا دیجیے گا۔" بیلی نے پھپھو صاحبہ کو ہدایات دیں، اگرچہ انہیں اس قسم کی باتوں یا ہدایات سے ہرگز ہرگز کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ڈلیوری بوائے آ گیا، پھپھو کا زنگر برگر اور بیلی کا پیزا، دونوں نے ڈٹ کر کھایا تو آنکھوں میں کچھ روشنی آئی۔

"اٹھیں پھپھو، کم از کم کچن تو سیٹ کروالیں، میں کارٹن کھول رہی ہوں۔" بیلی کو صبح کی فکر ہو رہی تھی اور پھپھو صاحبہ دوبارہ پسرنے کے موڈ میں تھیں۔

"صبح کی چائے بھی آرڈر کریں گی کیا؟" بھتیجی نے پھپھو کا موڈ بھانپ لیا اور اس کے لیے کسی اعلیٰ درجے کی ذہانت یا جیمز بونڈ کے دماغ کی ضرورت نہیں تھی۔ بچپن سے پھپھو کے ساتھ رہنے والی بھتیجی ان کی عادات اور فطرت کے سارے رنگوں سے خوب واقف تھی۔

"ہاں، تمہیں آرڈر کر دوں گی، بنا کے دے دینا، ایک مگ ہی تو پیتی ہوں، کون سا پوری کیتلی پیتی ہوں۔" غنودگی میں گم ہوتی آواز مدھم ہوتی چلی گئی۔

"لو یہ تو ہو گئیں انٹا غفیل۔" بریرہ نے ایک بار پھر انا بی کی زبان استعمال کرتے ہوئے دانت کچکچائے۔

"پھپھو، پھپھو!" بریرہ کی آوازیں صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی تھیں۔ خمار گندم نے پھپھو کو نیند کی گہری وادیوں میں پہنچا دیا تھا۔

ناچار وہ خود ہی تلملاتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ کلستے ہوئے مطلوبہ کارٹن کھولا، ڈبے، بوتلیں، جار، سب کے سب ترتیب سے کیبنٹ میں لگائے برتنوں کا کارٹن دیکھنے لگی، نہ جانے کس کمرے کے کس کونے کھدرے میں تھا۔ نیند کے جھونکے اسے بھی آ رہے تھے۔ جماہیاں لیتی ہوئی ان ہی کشنز پہ دراز ہو گئی، جنہیں جوڑ کر اپنا بستر بنایا تھا۔ چند منٹ ہی لگے تھے اور وہ بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

یہ بھی ایک فلیٹ تھا۔ جس کے کمروں اور لاؤنج میں کچھ کارٹن کچھ گٹھڑیاں اور بہت سا سامان کھلا ہوا بکھرا پڑا تھا۔

"میری شیونگ کٹ کہاں ہے؟" ماموں جان نے اپنے رخساروں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بھانجے سے استفسار کیا۔

"آپ نے خود ہی رکھی تھی بہت خیال اور حفاظت کے ساتھ۔"

بھانجے صاحب نے گھور کر ماموں جان کو دیکھا، شیونگ کٹ کے چکر میں آدھے سے زیادہ سامان نکال کر باہر پھینک دیا تھا۔ اب یہ سب اسے ہی سمیٹنا تھا۔ ماموں تو کسی کام کو ہاتھ لگانا، گناہ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

''صبح شیو کیسے بناؤں گا؟'' انہیں صبح کی فکر ہو رہی تھی۔

''ڈھونڈ لیں نا، یہیں کہیں ہوگی، جو سامان باقی رہ گیا ہے کارٹنز اور ان گٹھڑیوں میں، انہیں بھی کھول کر بکھیر دیں۔''

بھانجے کا لہجہ طنز سے بھرپور تھا، جسے ماموں جان بخوبی سمجھ رہے تھے۔

''ببلو میاں! بڑوں کا بھی کچھ حق ہوتا ہے، ادب لحاظ بھی ہوتا ہے۔''

انہوں نے اس بار اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا، نئے گھر میں شفٹ ہونے سے پہلے، نیا ہیئر کٹ کروایا تھا۔ اپنی موٹی موٹی خمار آلود آنکھوں اور گھنی مونچھوں کے ساتھ اس نئے ہیئر کٹ میں اچھے خاصے ہینڈسم اور اپنی عمر سے کافی کم لگ رہے تھے۔

''اور ایک میں ہوں؟'' بھانجے بے چارے نے ماموں کا بغور اور بھرپور جائزہ لے کر خود پہ ترس کھاتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔ ہیئر کٹ تو دور کی بات بالوں میں کنگھا کرنے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ منہ دھونے کے نام پہ دو چھپاکے مارے تھے فقط ابھی تک اسی سے ہی کام چل رہا تھا۔

''ڈھونڈ نا یار، مجھے صبح پرابلم ہو جائے گی، آفس جانا ہے؟''

ماموں ہمیشہ کی طرح اس کے پیچھے پڑے تھے، ان کا کام تھا چیزیں ادھر ادھر کر دینا، کھو دینا اور پھر تلاش گمشدگان پہ بھانجے کی ڈیوٹی لگا دیتے۔

''دیکھ تو رہا ہوں ہزاروں چیزیں تو پھیلا کے رکھی ہیں کچھ ڈھونڈنا اتنا مشکل ہے کہ اس سے بہتر بندہ ماؤنٹ ایورسٹ چھو کر آجائے یا بحرالکاہل میں غوطے مار کے موتی نکال لائے۔''

بابر عرف ببلو بڑبڑاتے ہوئے اشیا الٹ پلٹ کر رہا تھا، کپڑے، جوتے، ہینگر، گھڑیاں، چشمے، برتن، چادریں، تولیے، کتابیں، ڈائریاں، قلم، چمچے، تکیے، کشنز، جار، صابن، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ پکس گرم مسالے...... الم غلم ہر شے ہاتھ آ رہی تھی سوائے شیونگ کٹ کے۔

''آپ نے رکھی بھی تھی یا وہیں بھول آئے؟''

''ابے ہاں، رکھی تھی، پاگل ہوں کیا جو بھول آؤں گا، پچھلے ہفتے تو نئی خریدی ہے تو ٹھیک سے دیکھ، یہیں کہیں ہوگی، مل جائے گی چل شاباش۔'' آخر میں انہوں نے ذرا پیار سے چمکارا۔

''یہ کام بیوی کے کرنے کے ہوتے ہیں، بھانجے کے نہیں، شوہروں کی کھوئی ہوئی چیزیں بیوی ہی ڈھونڈ سکتی ہے، اللہ میاں نے یہ ہنر انہی کو دیا ہے ہم جیسوں کو نہیں۔''

ببلو تو تھک کے چور ہو چکا تھا میٹرس پر سے سامان نیچے گرا کے خود اس پر ڈھیر ہو گیا۔

''تیرا کیا خیال ہے۔ ایک ذرا سی شیونگ کٹ ڈھونڈنے کے لیے میں پہلے دولہا بن کر بارات لے کر جاؤں، ایک عدد بیوی کا پھندا گلے میں ڈالوں، پھر اس سے اپنی چیزیں ڈھونڈ واؤں؟ اس سے تو بہتر ہے بازار سے نئی چیزیں خرید کر استعمال کر لوں۔''

''تو اور آپ کرتے ہی کیا ہیں؟ شادی کر لیں تو چیزیں کھونے کی نوبت ہی نہ آئے، سلیقہ اور سگھڑاپا تو عورتوں کے دم سے ہی ہوتا ہے۔ مجھے بھی کچن سے اور ناشتے کھانے پکانے سے نجات مل جائے گی۔''

بابر نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''باؤلا ہوا ہے کیا؟ اتنے بڑے شہر میں ہزاروں ڈھابے، ریسٹورنٹ اور ہوٹل کھلے ہوئے ہیں۔ اب ذرا سا کھانا کھانے کے لیے شادی جیسا معرکہ سر کروں؟''

ماموں کی تو آنکھیں ہی حلقوں سے ابل پڑیں۔

''تو کیا ایسے ہی لنڈورے پھرتے رہیں گے!''

ببلو بے چارے کی جان پھنسی ہوئی تھی، دل جلا ہوا تھا۔ ماموں خود تو شادی سے ایسے بدکتے تھے

جیسے بکرا قصائی اور اس کی چھری ہے اور اس چکر میں بے چارے بابر کی شامت آئی ہوئی تھی۔ اسی فیصد وہ تمام کام اس کے ذمے تھے جنہیں ہر اچھی بیوی اپنا فرض سمجھ کر سرانجام دیتی ہے۔

"یار تو تو آرام کرنے میں مصروف ہو گیا؟" ماموں نے جیب سے موبائل نکالا اور اسے آن کرنے لگے۔

"اب بھی نہ کروں آرام، جب سے آیا ہوں، کام میں ہی لگا ہوا ہوں۔" بابر بری طرح تپ گیا تھا۔

"آپ تو بس آرام فرمانے اور حکم چلانے کے لیے دنیا میں آئے ہیں؟"

"اچھا چل ایک ملازم رکھوا دیتا ہوں تیری ہیلپ کے لیے، ایک تو تو بڑی جلدی ایموشنل ہو جاتا ہے بالکل آپا جان پہ گیا ہے اللہ بخشے وہ بھی ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ رونے بیٹھ جاتی تھیں۔"

فخر ماموں بھی بس ایسے ہی تھے اچھا بھلا اسے چمکارتے چمکارتے پھر سے چپت رسید کر دیتے تھے۔

"تیسویں سال میں لگ گیا، اب بھی ایموشنل نہ ہوں، خود نے تو اپنا پکا پکا مائنڈ بنایا ہوا ہے کہ بور کے لڈو نہیں کھانے، او بھائی ہمیں تو کھانے دو، مگر نہیں جی، خود کو سہرا نہیں سجانا اپنے مکھڑے پہ، ہمیں بھی ایویں لائن میں کھڑا کر رکھا ہے، نہ اپنی فکر ہے نہ بھانجے کی ہائے، میرے پیرنٹس حیات ہوتے تو اب تک دو چار بچے ہوتے مجھے پاپا کہنے والے، ایک پیاری سی بیوی ہوتی آگے پیچھے پھرنے والی۔ میرے لیے کھانا پکا کے رکھتی، کپڑے دھوتی، استری کرتی، بیمار ہو جاتا تو میرا خیال کرتی، اپنے نرم نرم ہاتھوں سے سر دباتی اور ان ہی پیارے پیارے ہاتھوں سے سوپ اور دلیہ بناتی، ہم اکثر شام میں سیر و تفریح کے لیے جاتے، میں اس کے لیے پھولوں کے کنگن اور گجرے خریدتا اور اسے اپنے ہاتھوں سے پہناتا وہ شرما جاتی اور اور......"

"بھانجے! میں ابھی بنفس نفیس یہیں موجود ہوں۔"

ماموں جان کی ٹھہری ٹھہری پرسکون آواز بھانجے کو خوابوں خیالوں کی دنیا سے واپس حقیقت کی دنیا میں کھینچ لائی۔ جہاں چاروں طرف بکھرا ہوا سامان دہائیاں دے رہا تھا کہ خدارا ہمیں سمیٹ کر ٹھکانے پہ رکھ دو۔

"یہی تو سارا مسئلہ ہے کہ آپ موجود ہیں بنفس نفیس اور بقلم خود، وگرنہ میں اب تک یوں لنڈورا نہ پھر رہا ہوتا۔" بابر نے منہ پہ چادر تان کے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

شام بدلی رات میں، پھر آدھی رات پھر آخری پہر اور شام کی سوئی سوئی حمرہ کی آنکھ اب کھلی تھی۔ بیداری میں اک دم تو سمجھ میں آیا نہ یاد کہ وہ ہیں کہاں؟ اپنے مانوس بستر اور تکیے کی جگہ صوفے کا اجنبی سا احساس کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ انہوں نے موبائل آن کر کے وقت دیکھا، فجر ہونے میں دس منٹ تھے حمرہ نے کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، بکھرے سامان کو دیکھ کر کھوئی ہوئی یادداشت واپس آ گئی، سب کچھ یاد آ گیا کہ وہ اپنے نئے فلیٹ میں شفٹ ہوئے تھے اور شام میں "ڈیل" کھانے کے بعد جو نیند آئی ہے تو اب آنکھ کھلی تھی۔

"خدا جانے کیا تھا کھانے میں جو ایسی مدہوشی کی نیند آ گئی اور یہ بلی تو ابھی تک بے ہوش ہی پڑی ہے۔" حمرہ نے بلی کو کمبل اڑھایا جو سکڑی سمٹی پڑی تھی۔

"لگ رہا ہے تھکن ہو گئی بہت۔" وہ جماہیاں لیتی ہوئی باہر بالکنی میں آئیں جہاں سرد ہوا کے جھونکوں اور تاریکی نے استقبال کیا۔ دور کہیں کہیں اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں۔

حمرہ تو جھرجھری لے کر فوراً ہی کمرے میں واپس آ گئیں۔ نہ سوئیٹر پہنا ہوا تھا، نہ ہی شال، کاٹن کا سوٹ اور دوپٹہ ان ہواؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی نہیں تھے جو چھٹی منزل کے فلیٹ کی بالکنی میں آ رہی تھیں۔

دروازہ بند کر کے وہ واپس کمبل میں دبک گئیں۔

"اے ہائے نماز کے بعد چائے کا بندوبست کیسے ہوگا؟" حمرہ کو فکر لاحق ہوئی، انہیں کیا خبر کہ چترا

بھیجی نے چینی پتی سمیت کے مسالوں کے سارے ڈبے، جار، برنیاں، کچن کے کیبنٹ میں رکھ دی ہیں۔ ہاں مگر برتن ابھی تک کارٹن میں بند تھے۔

''ہائے، دنیا میں اگر چائے یا کافی نہیں ہوتی تو زندگی کتنی بے رنگ اور پھیکی پھیکی ہوتی۔'' حمرہ کے سوچتے سوچتے موذن کی آواز آنے لگی انہوں نے دوپٹہ سرپہ اوڑھ لیا۔

نماز پڑھنے سے قبل ایک بار بریرہ کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اتنی گہری نیند میں تھی کہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

نماز پڑھ کر حمرہ بالکنی میں آگئیں مگر اس سے پہلے جیکٹ پہننا نہ بھولیں جس کا ہڈ سر پہ رکھا ہوا تھا۔ سامنے سڑک اور بڑا سا پارک تھا۔ گھنے درختوں، پودوں، پھولوں، جھاڑیوں اور زمردیں گھاس سے مزین بہت وسیع و عریض پارک، جہاں مختلف پرندوں کی بولیوں نے سماں باندھ رکھا تھا۔

کچھ دیر وہیں بیٹھی وہ خوابیدہ فضا کو دیکھتی رہیں جواب دھیرے دھیرے انگڑائیاں لے رہی تھی پھر وہ کمرے میں آئیں اور بریرہ کو ایک بار پھر جھنجھوڑا۔

''کیا ہے؟ رات میں تو سونے دیا کریں۔'' وہ کروٹ لے کر کمبل منہ پہ ڈھکنے لگی۔

''صبح ہو گئی ہے محترمہ، چلو آؤ، واک پہ چلیں؟'' حمرہ نے اس کے منہ سے کمبل ہٹایا۔

''صبح چلوں گی۔'' بریرہ نے پھر کمبل میں منہ چھپالیا۔

''یہ تو سچ مچ بے ہوش ہی پڑی ہوئی ہے۔'' حمرہ نے اس کے کندھے پہ ایک دھپ لگائی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ ''اکیلے ہی جانا پڑے گا۔'' خود کلامی کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور باہر نکلیں عین اسی وقت سامنے والے فلیٹ کا دروازہ کھول کر بھی کوئی باہر نکلا تھا۔

حمرہ نے دھیان دیے بغیر اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کیا آٹومیٹک لاک بند ہو گیا۔ شال سر پہ اچھی طرح بیلنس کرتی ہوئی وہ لفٹ کی طرف بڑھیں۔

ایک مردانہ وجود بھی بس اس سے دو قدم پیچھے ہی تھا۔ لفٹ میں ہم سفر پھر لفٹ اور بلڈنگ سے نکل کر وہ حمرہ سے ذرا فاصلے پر چلنے لگا۔ وہ پارک میں داخل ہوئیں تو گھنی مونچھوں اور ڈارک براؤن بالوں والے اس اسمارٹ سے بندے کا رخ بھی پارک کی سبز روش کی جانب تھا۔ حمرہ تیز تیز چلتے ہوئے اچانک مڑیں، وہ شخص عین ان کے سامنے تھا۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ آپ میرا پیچھا کر رہے ہیں؟''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے لیڈی! ہم ایک ہی جگہ سے آئے ہیں اور یہیں ہمیں آنا تھا اس لیے آپ کو ایسا لگا۔'' دراز قد شخص نے سنجیدہ اور نپے تلے لفظوں میں جواب دیا تھا۔

''واقعی؟'' حمرہ کی گھورتی ہوئی نگاہیں سامنے کھڑے مرد کا ایکسرے کر رہی تھیں کہ وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔

''خواتین کا پیچھا کرنے کا نہ مجھے شوق ہے نہ عادت، اب آپ کی مرضی ہے اسے سچ مانیں یا جھوٹ۔'' اپنی پیشانی پہ بل ڈالتا ہوا وہ ایک طرف سے ہو کر آگے نکل گیا۔

''ہونہہ!'' حمرہ نے پیچھے سے اس کی پشت کو گھورا جو دراصل لیدر کی جیکٹ کی پشت تھی۔

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی جاگنگ ٹریک مکمل کر رہی تھیں۔ صبح کی ہوا جو آتے وقت بہت سرد محسوس ہوئی تھی، اب اتنی ٹھنڈی نہیں لگ رہی تھی۔ پارک میں لوگ آنا شروع ہو گئے تھے، حمرہ بینچ پر آبیٹھیں۔

انہیں شدت سے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ باہر نکل کے دیکھتے ہیں کہیں کچھ آسرا بنے چائے کا، حمرہ نے پارک سے باہر ادھر ادھر دیکھا۔ دائیں طرف ذرا آگے ایک ڈھابہ تھا، کوئی اللہ کا نیک بندہ چائے کا دیگچہ چڑھائے ہوئے تھا۔ اور جب وہ چائے کے انتظار میں وہاں کھڑی تھیں تب ہی وہ آیا تھا، براؤن بالوں اور سیاہ جیکٹ والا، حمرہ کی کڑی نگاہ خود پہ پڑتے دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے۔

''بلیوی لیڈی! میں صرف اور صرف اس شے کی

محبت میں یہاں آیا ہوں، جس کے بغیر میری صبح ہوتی ہے نہ شام، گھر پہ چائے کا کوئی آسرا نہیں کیونکہ ہم کل ہی شفٹ ہوئے ہیں، سامان ابھی کھلا نہیں ہے۔''

اپنی صفائی یا وضاحت پیش کرتے ہوئے موصوف نے چائے کا کپ حمرہ کی طرف بڑھایا۔

''تھینکس!'' حمرہ نے کپ تھام لیا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ سامنے ایک ہی کرسی خالی تھی جس پر وہ موصوف اپنا کپ تھامے بیٹھ گئے۔

''آپ کو یقین آ گیا میری بات پر؟''

''آ گیا، کیونکہ ہماری کہانی بھی کچھ یہی ہے۔'' گرم گرم چائے کی چسکی لیتے ہوئے حمرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''انٹرسٹنگ۔'' چائے پیتے موصوف نے کپ آنکھوں کے سامنے کیا۔

''یہ کچھ چھوٹا نہیں ہے؟''

''کچھ زیادہ ہی چھوٹا ہے، میں جس مگ میں چائے پیتی ہوں، اس میں ایسے ڈھائی تین کپ آ جائیں گے۔'' حمرہ کو بھی کپ کے سائز پہ اعتراض تھا۔

''بہت خوب، تو آپ کو چائے پسند ہے۔'' بہت خوش ہو کر وہ مسکرایا تھا۔

''پسند نہیں، بلکہ مجھے محبت ہے اس شے سے۔'' حمرہ نے انگریزی کا سہارا لیا۔

''سیم ہیئر۔'' گھنی مونچھوں تلے لب پھر مسکرائے۔

ایک کے بعد چائے کا دوسرا کپ بھی پیا گیا اور پھر ادائیگی کا مرحلہ تھا، تب حمرہ بی بی کو یاد آیا کہ ان کے پاس اس وقت پیسے نام کی کوئی شے نہیں، وہ واک کرنے آئی تھیں چائے تک تو اتفاقاً، خوشبو سونگھتی ہوئی چلی آئیں اور اب یہاں ذرا خجل اور ذرا شرمندہ سی کھڑی تھیں۔

''یہ ادھار ہے مجھ پر، میں ابھی جا کر پے کروں گی آپ کو۔'' موصوف کے ادائیگی کرنے پر حمرہ نے کہا۔

''اوکے......!'' محترم نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔

حمرہ نے جانے کے لیے قدم بڑھائے جب پیچھے سے آواز آئی۔

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے ساتھ ہی چلوں، مجھے بھی وہیں جانا ہے۔''

سوال بہت شرافت اور سنجیدگی سے ہوا تھا، اور حمرہ نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو بہت کامیابی سے چھپاتے ہوئے ویسی ہی شرافت اور سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اپنے اپنے فلیٹ کے باہر کھڑے ہو کر کوئی دس بار تو بیل بجائی ہو گی دونوں نے اور دسویں بیل کے بعد بریرہ کی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی تھی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں، جلدی دروازہ کھولو۔'' حمرہ نے دانت کچکچائے۔

''آپ باہر کیسے چلی گئیں؟'' با آواز بلند سوال کرتی ہوئی بریرہ دروازے کی طرف آ رہی تھی اور جس وقت حمرہ اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کر رہی تھیں، سامنے فلیٹ کا دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا اور کسی نوجوان کی آواز آئی تھی۔

''باہر گئے تھے تو ناشتہ بھی لے آتے اب میں......''

حمرہ تیز تیز قدموں سے اندر کمرے میں آئیں اور صوفے پہ بیٹھ کر دونوں پاؤں اوپر کر لیے۔

''کہاں گئی تھیں؟'' بریرہ جمائیاں لیتی ہوئی پھر سے کمبل میں گھس رہی تھی۔

''پارک۔'' حمرہ نے اپنا موبائل اٹھایا۔

''انابی کا فون آیا؟ کب آئیں گی وہ؟''

''سب آپ کی طرح منہ اندھیرے اٹھ کر پارک میں دوڑیں نہیں لگاتے، سو رہی ہوں گی انابی، جب اٹھیں گی آ جائیں گی۔'' بریرہ نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' بریرہ نے اعلان کیا۔ ''اپنا خزانہ نکالو اور کچھ کھا لو، اس وقت کیا بناؤ گی، ناشتے کا سامان کچھ بھی نہیں ہے۔'' حمرہ نے مشورہ دیا۔

بریرہ کے پاس چپس بسکٹ، نمکو اور اس طرح کی چیزوں کا ذخیرہ ہمیشہ ہی رہتا تھا۔ کل بھی اپنا سارا خزانہ بڑے احتیاط سے الگ پیک کر کے لائی تھی۔

''بس مشورے ہی حاضر رہتے ہیں باہر گئی تھیں نہیں کیا بھتیجی کے لیے کچھ لے ہی آتیں۔''

''بھتیجی کو اٹھایا تو تھا، ساتھ چلتیں جو دل چاہے لے آتیں، ویسے اس وقت چائے کے علاوہ کچھ اور دستیاب نہیں ہے گیارہ، بارہ بجے سے پہلے شاپس کہاں کھلتی ہیں۔'' اظہار خیال کرتے کرتے اچانک حمرہ کو کچھ یاد آیا۔ ''ارے بلی یار، جلدی سے اٹھ، منہ دھو کر آ۔''

''کام ہے، بہت ارجنٹ، بہت ضروری۔'' حمرہ ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہو گئیں۔

''آپ کے ارجنٹ اور ضروری کام کا میرے منہ دھونے سے کیا تعلق ہے؟'' بریرہ نے سوالیہ نگاہوں سے پھپھو کو دیکھا۔

''جلدی سے منہ دھو کر آؤ پھر بتاتی ہوں۔''

''کام نہیں بتا رہیں بس منہ دھونے کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔'' بریرہ جھنجلا گئی۔

''افوہ! ایک تو جرح بہت کرتی ہو، بالکل بھائی جان پہ گئی ہو ان ہی کی طرح وکیل بن جاتیں تو اچھا تھا۔'' اس بار حمرہ جھنجلائی تھیں پھر ذرا سا سانس اور وقفہ لے کر اسے ساری بات بتائی۔

''لو، آئے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے، ادھار بھی چڑھا لیا وہ بھی چائے کا۔'' بریرہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ حلیہ ٹھیک کر کے آئی تو حمرہ نے پچاس کا نوٹ دیا۔

''آپ خود دے کر آئیں نا، چائے آپ نے پی ہے میں کیا کہوں گی۔'' بریرہ کے حوصلے پست ہونے لگے۔

''کوئی تقریر نہیں جھاڑنی، فقط اتنا کہنا ہے کہ چائے کے پیسے ہیں، رکھ لیں۔''

''آپ بھی بس۔'' بریرہ نے ہاتھ میں پکڑے نوٹ کو ایک نظر دیکھا، دوسری نظر پھپھو پر ڈالی اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

سامنے والے فلیٹ پہ دستک کے جواب میں جس نے دروازہ کھولا اسے دیکھ کر بریرہ نے فوراً ہی نوٹ اس لڑکے کی جانب بڑھایا۔

''یہ رکھ لیں دو چائے کے پیسے ہیں۔''

''دو چائے کے پیسے؟'' لڑکے کے چہرے پہ اچنبھے کے آثار نظر آئے، پہلے اس نے پچاس کے نوٹ کو حیرت سے دیکھا پھر حیرت کی دوسری نگاہ بریرہ پر ڈالی کچھ سوچا پھر اس کے نقوش تن گئے۔

''یہ کوئی ڈھابہ نہیں ہے نہ ہی یہاں کوئی ''چائے والا'' رہتا ہے۔''

بابر عرف ببلو نے دروازہ اگرچہ آرام سے ہی بند کیا تھا مگر بریرہ کو وہ کسی بدتہذیبی اور بداخلاقی سے کم نہیں لگا۔ تن فن کرتی اپنے گھر آئی اور پچاس کا نوٹ حمرہ کے قریب رکھا نہیں بلکہ پٹخ دیا۔

''اب آپ خود ہی ادائیگیاں کریں اپنی۔'' اس کی سرمئی آنکھوں میں برہمی تھی۔ جلدی جلدی سارا احوال سنا دیا۔

''دیکھنے میں تو بڑا ڈیسنٹ اور پولائٹ تھا اس کی یہ مجال، میری بھتیجی کو ٹکا سا جواب دے کر اس کے منہ پہ دروازہ بند کر دے۔'' حمرہ کو طیش آنے لگا۔

''ڈیسنٹ؟ پولائٹ؟ آپ کو ایک عدد عینک کی ضرورت ہے پھپھو جان وہ اکیس سال لڑکا تھا۔ اس بڑی بڑی آنکھوں سے گھور کے دیکھا مجھے اور اتنی لمبی زبان سے ٹکا سا جواب دیا۔''

''لڑکا؟'' حمرہ چونکیں۔ ''میرا خیال، ہے کہ عینک کی ضرورت تمہیں زیادہ ہے۔ بے شک وہ ذرا خوش شکل بندہ تھا مگر لڑکا ہر گز نہیں تھا مونچھوں کے ساتھ بندہ ویسے بھی مرد ہی لگتا ہے، لڑکا تو ہر گز نہیں۔'' حمرہ نے بریرہ سے اختلاف کیا۔

''مونچھیں؟ مونچھیں کہاں سے آ گئیں، وہ تو کلین شیو تھا۔'' بریرہ جھنجلائی۔

''ائے ہائے، اچھی بھلی مونچھیں تھیں، کٹوا لیں۔'' حمرہ کو نہ جانے کیوں افسوس ہوا۔

''بالکل زین لگ رہا تھا۔''

''زین؟ کون زین؟'' بریرہ نے غائب دماغی

سے پھپھو کو دیکھا۔

"ارے بھئی تنہائیاں کا زین آصف رضا میر اور کون۔" حمرہ کو بھتیجی کی لاعلمی پہ افسوس بھی ہوا تھا اور حیرت بھی۔

"اچھا وہ، احد رضا میر کے ابا؟" بریرہ کو یاد آ گیا۔ پھپھو صاحبہ پرانے ڈرامے نہ صرف خود بڑے شوق سے دیکھتی تھیں بلکہ بھتیجی کو بھی زبردستی دکھانے کی کوشش کرتی تھیں۔

"ان کا بیٹا کتنا کیوٹ ہے نا؟" بریرہ نئے ڈراموں کی شوقین تھی۔

"جی نہیں ابا زیادہ ہینڈسم تھے اور ہیں۔" حمرہ نے فوراً اختلاف کیا۔

"آپ کو تو......" بریرہ مزید کچھ کہتی مگر حمرہ کی نظر اچانک پچاس کے نوٹ پر پڑی اور یاد آیا کہ نئی بحث میں پڑ کر وہ پرانے قضیے کو تو فراموش ہی کر رہی تھیں۔

"چلو آؤ، میں دے کر آتی ہوں، ایویں دو کپ چائے کا احسان چڑھا رہے گا مجھ پر۔" حمرہ نے نوٹ اٹھایا اور فیصلہ کن انداز میں کھڑی ہو گئیں۔

اس بار کال بیل کے جواب میں دروازہ نہیں کھولا گیا بلکہ سوال کیا گیا۔ "کون؟"

"ہم ہیں۔"

"ہم کون؟"

"ارے آپ دروازہ تو کھولیں۔" حمرہ جھنجھلائی۔

"محترمہ! ہمیں کچھ نہیں خریدنا، آپ پلیز اپنا ٹائم ویسٹ نہ کریں۔" اندر سے کوئی نکل کر نہیں آیا مگر مشورہ ضرور آ گیا۔

"ہم کچھ بیچنے نہیں آئے، آپ پلیز دروازہ کھولیے۔" حمرہ نے دانت پیسے۔

"ماموں! دروازہ مت کھولیے گا، آج کل خوب صورت حسینائیں بھی ڈکیتیاں کر رہی ہیں، لڑکیوں کی آواز سن کر لوگ دروازے کھول دیتے ہیں اور لٹ جاتے ہیں۔" اندر سے کسی نوجوان کی بلند آواز آئی جس میں اپنے ماموں کے لیے مشورہ اور دروازے پہ کھڑی لڑکیوں کے لیے الزام تراشی تھی۔

"کیا؟ ہم چور ڈاکو ہیں۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی ہمیں ڈاکو کہنے اور سمجھنے کی، ذرا باہر تو نکلو تم۔" حمرہ کا طیش کے مارے برا حال تھا۔

"محترمہ! آپ ہیں کون؟" بھاری آواز مگر معقول لہجے میں پھر وہی سوال ہوا تھا۔

"یار، آواز کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے میرا خیال ہے دیکھ لینا چاہیے۔"

سوال کے بعد ہی ذرا کم بلند آواز میں ماموں نے بھانجے کو مخاطب کیا۔

"اپنی ذمے داری پہ کھولیے گا۔" بھانجے نے وارننگ دی۔

باہر کھڑی حمرہ کے صبر کے سب پیمانے لبریز ہو کر چھلک پڑے۔

"آپ کی دو کپ چائے کا ادھار ہے مجھ پر وہ لے لیجیے۔"

فوراً ہی دروازہ کھلا۔ آگے ایک موٹی موٹی مونچھوں اور ویسی ہی آنکھوں والا ہینڈسم سا شخص اور اس کے پیچھے تولیے سے بال رگڑتا ہوا ایک خوش شکل سا نوجوان۔

"یہ لیجیے اپنے پیسے۔" حمرہ نے نوٹ دیا نہیں بلکہ تقریباً کھینچ مارا تھا جسے اگر پھرتی سے کیچ نہ کیا جاتا تو وہ یقیناً نیچے گر جاتا۔

"ارے آپ ہیں؟ تب ہی مجھے آپ کی آواز جانی پہچانی لگ رہی تھی۔" سامنے کھڑے صاحب نے انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"جانی پہچانی آوازوں پر آپ دروازہ کھولنے میں اتنی دیر لگاتے ہیں کوئی اجنبی ہو تو غالباً پورا دن باہر کھڑا رکھتے ہوں گے۔" حمرہ نے انتہائی خشک اور طنزیہ لہجے میں جواب دیا اور واپس مڑ گئیں۔

"یہ اتنی غصے میں کیوں لگ رہی تھیں؟" حمرہ اور بریرہ نے اپنے فلیٹ میں گھس کر دروازہ بند کرتے ہوئے آواز سنی جو کمال معصومیت سے بھانجے سے مخاطب تھے۔

"مجھے کیا پتا؟" بھانجے نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔

☆☆☆

انابی کے گھر میں گھستے ہی بھونچال سا آ گیا تھا۔ وہ تو سارا سامان یونہی پڑا دیکھ کر حق دق رہ گئیں۔

"ارے بچی، کل منیرہ کو ساتھ نہیں لائیں؟ کام کروا دیتی، سب سمٹ جاتا، میں تو سمجھ رہی تھا۔ گھر سیٹ ہو گیا ہوگا۔" اپنی چکن کی چادر سنبھالتے ہوئے انہوں نے ناقدانہ جائزہ لیا۔ بیڈ رومز، لاؤنج ڈرائنگ روم ہر جگہ سامان بکھرا ہوا تھا۔

"منیزہ کو بخار ہو رہا تھا میں نے کہہ دیا تھا کہ آرام سے آ جانا، تب تک ہم خود کچھ کر لیں گے۔" حمرہ نے چپس ٹونگتے ہوئے انہیں جواب دیا۔

"بہانے بناتی ہے کم بخت، تم تو فوراً یقین کر لیتی ہو اور کچھ کیا کیا اب تک، یہ تمہارے بس کا ہے کیا؟ ایک کپ چائے بنانے میں تو جان نکلتی ہے تمہاری، یہ اتنا پھیلاوا کہاں سے سمیٹ لو گی؟" انابی نے جھاڑ ہی دیا۔ حمرہ چپکی ہو رہیں، ان کے آگے بولنے کو غیر ضروری خیال کیا جاتا تھا کیونکہ وہ ڈانٹتی بہت تھیں۔ مگر وہ کام کی بھی بہت تھیں۔ بریرہ کے ساتھ مل کر انہوں نے پہلے وارڈ روب سیٹ کروائی۔ سارے کپڑے، جوتے، ہینڈ بیگز اور پھر چادریں، تکیوں، کشنز کے غلاف پردے، تولیہ وغیرہ ٹھکانوں پہ پہنچ گئے تو آدھے سے زیادہ پھیلاوا کم ہو گیا تھا۔

"انابی، آپ کے اندر کوئی جن ہے، کیسے ذرا سی دیر میں آپ سب کچھ نمٹا لیتی ہیں۔" بریرہ ان سے ہمیشہ ہی متاثر رہتی تھی۔

"اے بھنو انسان سے بڑا جن کوئی نہ ہیں۔" انہوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں جواب دیا اور حمرہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"سرور میاں آئے تھے، رشتہ بتا رہے تھے تمہارے لیے، کہہ رہے تھے بڑا اچھا لڑکا ہے فیملی بھی اچھی ہے دیکھ لو۔"

"ہائے انابی، کتنا ہی اچھا لڑکا ہو، کتنے ہی اچھے لوگ ہوں سب کو صبح صبح ناشتہ، دوپہر اور رات میں کھانا چاہیے ہوگا کون کرے گا یہ سب؟" حمرہ کی آواز میں دنیا بھر کی سستی اور کاہلی تھی، ساتھ ہی ساتھ بے زاری بھی تھی۔

"ساری لڑکیاں کرتی ہیں یہ سب، تم کوئی انوکھی ہو؟"

"ہم سے یہ سب نہیں ہوتا، نہ ہوگا۔" حمرہ کے خیالات نئے نہیں تھے ان کے لیے، کئی بار ان معاملات پہ لمبی لمبی بحث ہو چکی تھی۔

"ان کے گھر ملازم بھی ہیں۔" انابی نے دانہ ڈالا۔

"بہو آتی ہے تو سارے ملازم، ملازمائیں فارغ کر دیے جاتے ہیں۔" حمرہ نے ان سے کم سہی مگر تھوڑی بہت دنیا دیکھ رکھی تھی۔

"سب جگہ تو ایسا نہیں ہوتا نا کچھ لوگ مختلف اور اچھے بھی ہوتے ہیں۔"

"ہوں گے، ہمیں کوئی دلچسپی نہیں، نہ شادی بیاہ سے نہ ان رنگ برنگے رشتوں سے جو آئے دن سرور بھائی لے آتے ہیں۔" حمرہ نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی صاف صاف بلکہ ٹکا سا جواب دے دیا۔ یہ واحد معاملہ تھا جس پہ حمرہ انابی کے آگے ڈٹ جاتی تھیں۔

"باؤلی ہوگئی ہے یہ لڑکی۔" انابی نے اپنا رخ بریرہ کی طرف کیا۔ جو کچن کا سامان سیٹ کر رہی تھی۔

"مجھ سے زیادہ کسے معلوم ہوگا، میرے ساتھ تو رہتی ہیں۔" بریرہ بے چاری نے ایک آہ بھری۔

"ارے میری بچی، روٹی پانی کا کچھ آسرا ہے یا شام تک کا روزہ رکھ لوں؟" تین بج چکے تو انابی نے دونوں سے سوال کیا تھا۔

"آرڈر کر دیا ہے، بس تھوڑی دیر لگے گی۔" جواب حمرہ بی بی کی طرف سے آیا تھا۔

"تم ہی کھانا بازار کی الابلا ہم سے نہیں ہضم ہوتا یہ سب، اللہ ماری ان فیشنی دکانوں نے بیڑا غرق کر دیا سب کا، ستیاناس مار دیا، نہ عورتیں گھر میں کچھ پکائیں نہ مرد گھر کا پکا ہوا کھائیں، صحت خراب کر رہے

ہیں سب بک بک، اوپر سے انوکھے مشورے باورچی خانے میں تالا لگانے کے، ارے جس گھر میں چولہا نہ جلے، روٹی ہنڈیا نہ ہو وہاں خیر و برکت ہوتی ہے نہ محبت۔"

انابی کو تو بس موقع ملنا چاہیے پھر اللہ دے اور بندہ لے، وہ شروع ہو گئیں۔

"روٹی ہنڈیا پکانے کا خیر و برکت اور محبت سے کیا تعلق؟" حمرہ نے جماہی لی، فجر سے پہلے سے جاگ رہی تھیں اب نیند آرہی تھی۔

"بالکل تعلق ہے اور بہت گہرا تعلق ہے، گھر کے پکے کھانوں میں برکت ہوتی ہے، بازاری چیزیں تو لٹوری ہوتی ہیں پھر گھر میں جو بھی بنتا ہے اس میں پکانے والے کی محنت اور محبت شامل ہوتی ہے۔" انابی نے دلیل دی اور ابھی ان کی تقریر دل پذیر کچھ دیر اور جاری رہتی کہ ڈیلیوری بوائے آ گیا۔

بریرہ نے فٹافٹ ٹیبل پہ کھانا لگایا، گرما گرم کھانے کی خوشبو سے بھوک اور چمک اٹھی تھی، کچھ انابی کی وجہ سے اور کچھ منہ کا ذائقہ بدلنے کو آج چائنیز منگوایا تھا۔

"یہ ابلے ہوئے چاول گھر میں نہیں بن سکتے تھے؟ مٹھی بھر پیسے دیے ان کے لیے؟" انابی برے برے منہ بناتے ہوئے چائنیز رائس کھا رہی تھیں اور چکن کارن سوپ کو تو انہوں نے یکسر مسترد کر دیا تھا۔

"اے ہٹاؤ یہ دھوون جنے کس جناور کی بوٹیاں گلا کر بنایا ہے؟ رنگ دیکھو تو جیسے پانی میں صابن گھول دیا ہو۔"

حمرہ اور بریرہ سر ہلا ہلا کر ان کے فرمودات سنتی رہیں اور مزے سے سب کچھ چٹ کر گئیں۔

کھانے کے بعد حمرہ نے خلاف امید اور توقع ٹیبل بھی صاف کر لی اور برتن بھی دھو لیے، اس کے بعد محترمہ ایسی سوئیں کہ عصر کی نماز کا وقت تنگ ہونے لگا تو انابی نے جھنجھوڑا ورنہ وہ بعد میں سب سے شکایتیں کرتی ہے کہ نماز قضا کروا دی میری، اٹھا دیتے مجھے، خیر وہ بیدار ہو گئیں، عصر پڑھ کر چائے کی فرمائش کی۔

بریرہ چائے بنا رہی تھی جب انابی پھر سے حمرہ کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔

"پھر بٹیا! کیا سوچا تم نے؟ سرور میاں بتا رہے تھے کہ لڑکا ہیرا ہے ہیرا، اماں بھی سیدھی اللہ میاں کی گائے، دو تین بہنیں ہیں، اپنے اپنے گھروں کی ہیں تصویر دیکھ کر ہی لٹو ہو گئے وہ سب۔"

"تصویر؟ کون سی تصویر؟" حمرہ چونکی۔

"ارے وہی جو عادل کے ولیمے کی تصویریں ہیں تمہاری، سرور کے پاس ہیں۔"

"آٹھ سال ہو گئے ہیں عادل کے ولیمے کو۔" حمرہ نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"ہونے دو، تمہارا رنگ روپ تو آج بھی ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔" انابی نے ناک سے مکھی اڑائی گویا۔

"بلا لوں پھر؟ کسی روز چائے پہ بلکہ کھانے پہ بلا لیتے ہیں۔" انابی نے جلدی سے تجویز پیش کی۔

"قاضی صاحب کو بھی ساتھ ہی بلا لیجیے گا۔ وہیں کے وہیں قصہ نمٹ جائے۔"

بریرہ نے چائے کی ٹرے درمیان میں رکھی۔ ساتھ میں نان خطائی اور نمکو بھی تھے۔

"اب تمہارے فرض سے سبکدوش ہوں تو اس بچی کے لیے بھی کچھ سوچیں دیکھیں۔" حمرہ کی خاموشی پہ انابی مستقل لیکچر دے رہی تھیں۔

"یہ بچی بھی اب ماشاء اللہ اپنی بائیسویں سالگرہ منانے والی ہے۔" بریرہ نے ذرا پیار سے انابی کو دیکھا۔ کوئی تو ہے جو اس کے بارے میں بھی سوچتا ہے۔

"آپ کو میرا جواب معلوم ہے پھر بھی آپ بار بار اصرار کیے جاتی ہیں اور مجھے بار بار انکار کرنا اچھا نہیں لگتا۔" حمرہ بہت سنجیدہ ہو کر چائے کا مگ اٹھا رہی تھیں۔

"حمرہ بی بی! اچھے رشتے بھی اللہ کی نعمت ہوتے ہیں۔ انہیں ٹھکرانا کفران نعمت بنتا ہے۔" انابی بھی مزید سنجیدہ ہو گئیں۔

"میں نے شکر ادا کرنے والوں کا انجام دیکھا ہے۔" حمرہ نے چائے کا گرم گھونٹ ہی بھر لیا جو زبان اور حلق کو جلاتا ہوا نیچے اترا۔

"وہ اور بات تھی بٹیا، اب قسمت سے بھلا کون

لڑ سکا ہے۔'' اناپی نے ایک آہ بھری۔

''چہروں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کے نصیب بھی اپنی ماؤں پہ جا سکتے ہیں؟'' حمرہ نے نان خطائی اٹھالی۔

''شادی کا جوا تو اللہ کے بھروسے ہی کھیلا جاتا ہے۔'' اناپی سمجھانے پر مصر تھیں۔

''اور مجھے یہ جوا کھیلنا ہی نہیں، جس میں ہر وقت ہار جیت کا دھڑکا لگا رہے۔'' حمرہ کے موقف میں اور لب و لہجے میں کوئی لچک نہیں تھی۔

''برسوں بیت گئے، وقت گزر گیا، لوگ گزر گئے، بھول کیوں نہیں جاتیں سب کچھ، اب کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔'' اناپی بے بس سی ہو کر بولیں۔

''عبرت ہے ان باتوں میں، میرے لیے، کیسے بھول جاؤں؟'' حمرہ نے پھر گرم گرم چائے کا کپ منہ سے لگالیا۔

☆☆☆

''سب سے بڑی بہو اور وہ بھی ایسی تابعدار، فرماں بردار، جس کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا، گھر میں کسی کی پسند کا کچھ بھی پکانے کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد۔ والدین اگلے وقتوں کے سیدھے سادے لوگ، جنہوں نے بیٹی کو یہی سمجھایا تھا کہ شوہر کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر جاتا ہے اور سسرال والوں کی تابعداری اور جی حضوری میں، زندگی کا سکون اور شوہر کی خوشی ہے۔''

خود تابندہ بھی سادہ مزاج تھیں۔ لہذا شادی کے بعد یوں گھن چکر بنیں کہ کھیر میں ہاتھ لگنے کے بعد ہر دن فجر کی نماز پڑھ کے دادی اور دادا کو، ساس سسر کو چائے بنا کے دیتیں، خصوصاً سردیوں میں، شوہر کو ناشتہ اور لنچ دے کر رخصت کرتیں پھر باری باری چاروں دیوروں کو جو کنوارے تھے، ناشتہ کروا کر، لنچ دے کر کام پہ بھیجتیں، پھر اپنا، دادی اور ساس سسر کا ناشتہ بناتیں۔

ناشتے سے فارغ ہوتیں تو دوپہر کے کھانے کی تیاری پھر شام میں کوئی اسنیکس وغیرہ، پھر رات کا کھانا، تابندہ بے چاری کوشش کرتی کہ شام میں نہا دھو کر ذرا اچھا سا تیار ہو کر شوہر کا استقبال کرے اور وہ ہلکی پھلکی تیار ہو بھی جاتی تھی، مگر بس گڑبڑ اس وقت ہوتی تھی جب شوہر چاہتے کہ شام کا ایک ڈیڑھ گھنٹہ بیوی انہیں دے، شام میں آؤٹنگ پہ چلیں یا گھر پر ہی اپنے بیڈروم میں یہ وقت گزاریں، ادھر تابندہ کو آوازیں لگتی رہتیں۔

عموماً بہوؤں کے ایک ساس سسر ہوتے ہیں، اس کی دو ساسیں اور دو سسر تھے۔ کمال کے دادا دادی، امی، ابو، بھائی، بہنیں سب ہی اکلوتی بہو اور اکلوتی بھاوج کو مصروف رکھتے تھے۔ بزرگ افراد پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ دیوروں کی الگ الگ پسند اور مزاج تھے۔ نندیں آجاتیں جو کہ بھی روز آجاتیں بھی دو چار دن چھوڑ کے اور چھٹی کا دن تو لازمی مہمان داریوں میں ہی گزرتا تھا۔

تابندہ کو کچن سے اور سب کی خدمت گزاری سے فرصت نہیں ملتی تھی، کمال کا منہ بن جاتا، مزاج بگڑ جاتا۔

''تمہاری شادی مجھ سے ہوئی ہے یا کچن سے؟'' وہ غصے میں سوال کرتا۔ تابندہ بے چاری منمنا کر رہ جاتی۔

''کیا کروں میں؟''

وہ واقعی بے بس ہی تھی، کمال کا سوال ایک سچ ہی تو تھا۔ ہمارے مڈل کلاس گھرانوں میں ایک لڑکی کی شادی فقط ایک مرد سے نہیں بلکہ کچن سے بھی ہوتی ہے اور ذمے داریوں کے نام پر سسرال کے تمام افراد کی ذمے داریاں اسے سونپ دی جاتی ہیں۔ تابندہ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا، اس کی مہارت اور اس کا ہنر اس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول رہا تھا۔ اس کا شوہر ان مردوں میں سے نہیں تھا، جن کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے وہ تو ان مردوں میں سے تھا جنہیں ہر دم صاف ستھری، خوشبوؤں میں بسی، بجی سنوری بیوی چاہیے، جس کے ساتھ وہ باہر جا کر کھانا کھا سکے ۔۔۔ اسے کوئی چاؤ نہیں تھا کہ اس کی بیوی سارا دن باورچی خانے میں گھسی اس کے لیے نت نئے پکوان تیار کرے اور خود حال سے بے حال رہے اب تو وہ دبی زبان سے ٹوک بھی دیتا تھا۔

''سونے سے پہلے نہا لیا کرو، ادرک لہسن اور

پیاز کی بو کے ساتھ مجھے نیند نہیں آتی۔"
تابندہ غریب کٹ کے رہ جاتی، تھکن سے بے حال نیند کے مارے پلکیں ایک دوسرے سے جڑ رہی ہوتیں منہ دھو کر نیند بھگاتی اور یہ سوچتی رہتی کہ کس سے کہے اور کیا کہے؟

ساس بڑے فخر سے ہر آئے گئے کو بتاتی تھیں کہ بہو کو انہوں نے کچن کی راجدھانی سونپ کر سیاہ سفید کا مالک بنا رکھا ہے۔ جھاڑو سہارو، صفائی ستھرائی، برتن اور کپڑے دھونے کے لیے دو ماسیاں لگائی ہوئی ہیں۔ بس کچن کی ذمے داری ہے، بہو پر اور ویسے بہو اتنی اچھی، اتنی سلیقہ مند ہے، بہت ذمے داری اور جانفشانی کے ساتھ سب کی خدمت کر رہی ہے۔ وہی کیا سب ہی لوگ اتنی اتنی تعریفیں کرتے تھے بھابھی بھابھی کہتے نندوں اور دیوروں کی زبان نہیں سوکھتی تھی بہو، دلہن، بٹیا پکارتے پکارتے گھر کے بزرگوں کی زبان سے شیرینی ٹپکتی تھی۔

اس کے ہاتھ کی چائے، سالن، چپاتی، چٹنی، چاول، انواع و اقسام کے میٹھے، سب کی وقت بے وقت کی فرمائشیں وہ خندہ پیشانی سے پوری کرتی رہتی اور کمال کے ماتھے کی سلوٹیں گہری ہوتی رہتیں۔

اسی آنکھ مچولی میں سال گزر گیا اور وہ ایک بیٹی کی ماں بھی بن گئی۔ اب بچی نے اور بھی مصروف کر دیا تھا اسے، شوہر کو جو تھوڑا بہت توجہ اور وقت دیتی تھی اس سے بھی گئی اور کمال الدین کو ایسی ٹکڑوں میں بٹی بیوی ملتی تھی جو اپنی ساری توانائیاں دن بھر خدمتوں میں کھپا کر رات کو تھکی ہاری، نیند سے بے حال ہوتی تھی۔ وہ بے زار ہوتا جا رہا تھا۔

اچھی شکل اور ذہانت اللہ نے دی تھی۔ محنت کر کے اپنے ادارے میں خود کو منوا کر ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔ مزاج بچپن سے ہی ذرا شاہانہ اور نفیس تھا بیوی کو پیار سے اور غصے سے بھی کئی بار سمجھا چکا تھا کہ وہ خود پر سے ذمے داریوں کا بوجھ کم کرے۔

والدین سے بھی بات کی کہ کھانا پکانے کے لیے بھی کوئی ملازمہ رکھ لیں یا کم از کم کوئی مددگار جو تابندہ کے ساتھ ساتھ لگی رہے، مگر کسی کو کمال الدین کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"ساری عورتیں کھانے پکاتی ہیں گھر والوں کے لیے یہ کوئی انوکھی بات ہے کیا اور تابندہ اگر اچھی بہو ہے، سب کی خدمت کر رہی ہے تو اس میں برائی کیا ہے؟"

کمال الدین کسی کو بھی سمجھا نہیں سکا، نہ بیوی کو، نہ والدین کو، کہ اس کی بیوی، جس سے سسرال میں سب خوش ہیں، وہ اپنے شوہر کو خوش کرنے میں ناکام ہو رہی ہے۔ وہ خوش ذوق تھا، طبیعت میں رومانس تھا۔ بیوی کے لیے پھول لے کر آتا، خوشبوئیں لاتا، کپڑا، زیور، میک اپ کسی شے کی کمی نہیں تھی، لیکن بس ان سب کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔

☆☆☆

تابندہ کام سے نہیں گھبراتی تھی، شوہر کی بے رخی اور بے زاری سے ڈرتی بھی تھی مگر اس کا کوئی حل بھی تو نہیں تھا اس کے پاس، بھی لاچار ہو کر یہی سوچتی کہ دیوروں کی شادیاں ہو جائیں گی تو شاید کچھ ذمے داری کا بوجھ کم ہو جائے۔

اگلے تین برسوں میں ایک ایک کر کے تین دیورانیاں آ گئیں اور تابندہ کے لیے تین افراد کا کام اور بڑھ گیا۔ تین میں سے دو تو کھانا پکانے سے ہی دور بھاگتی تھیں۔ کبھی مارے باندھے پکانا بھی پڑا تو ایسا پکایا کہ اگلی بار کوئی کہے ہی نہیں۔

ایک دیورانی اس ہنر میں مہارت رکھتی تھی مگر اسے یہ بے وقوفی کی بات لگی کہ سارا دن بس چولہے کے آگے کھڑے گھر والوں کے فرمائشی پروگرام پورے کرتے رہو یا روز روز کی مہمان داریاں بھگتاتے رہو، وہ اپنے شوہر کو لے کر الگ ہو گئی۔

دیوروں کی شادی کے بعد بھی تابندہ وہیں کھڑی تھی، پہلے والے مقام پر جہاں سسرال والے اس کے گن گا رہے تھے اور وہ خود اپنے شوہر سے دور ہو رہی تھی۔

کمال کی بے زاری اور چڑچڑاہٹ کا احساس تابندہ کو بھی ہو رہا تھا مگر لاکھ چاہنے اور کوشش کے باوجود بھی وہ اس فاصلے کو پاٹنے اور کمال کی مرضی و

خواہش کے مطابق خود کو ڈھالنے میں ناکام ہو رہی تھی۔
شادی کی چوتھی سالگرہ کے تین ماہ بعد ایک روز کمال بھڑک ہی اٹھا اور بھڑکتا ہی چلا گیا۔
تابندہ سہم گئی، کمال نے آؤٹنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ دو بہنوں کے فون آ گئے کہ وہ گھر آ رہی ہیں تابندہ کے لیے اب کہیں بھی جانا ناممکن تھا۔
"میں الگ گھر لے رہا ہوں۔" کمال نے سب کے بیچ بیٹھ کر اعلان کیا۔
ماں اگرچہ سب سمجھتی تھیں، بیٹے کا مزاج اور طبیعت اچھی طرح جانتی تھیں اس کی برہمی کی وجہ بھی معلوم تھی پھر بھی چشم پوشی اور کسی حد تک خود غرضی سے کام لے رہی تھیں۔
"ہمیں کون دیکھے گا؟" وہ بلبلائیں۔
"دو بہوئیں اور بھی ہیں اس گھر میں، اب ان پہ ذمے داریاں ڈالیں، تابندہ کو آزاد کریں۔" کمال الدین کے لہجے میں برہمی تھی۔
"وہ دونوں کسی کام کی نہیں، ڈھنگ کی چائے تک تو بنانی آتی نہیں۔" انہوں نے برا منہ بنایا۔
"تابندہ کا کیا قصور ہے اس میں؟ اسے کیوں کولھو کا بیل بنایا ہوا ہے؟"
کمال الدین اپنی بیوی کا مقدمہ لڑنے پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اترے تھے۔
"ارے کوئی شکایت تھی تو ہم سے کہہ دیتیں۔" انہوں نے شکائتی نظروں سے بہو کو دیکھا۔
"نہیں امی! میں نے تو کچھ نہیں کہا ان سے۔"
مارے شرم کے تابندہ پانی پانی ہو گئی۔ حد سے زیادہ مروت اور بزدلی نے اس کی زبان بند کی ہوئی تھی۔
"ایسا کرو بیٹا! ہم چاروں بڈھے بڑھیاؤں کو کسی دارالامان میں چھوڑ آؤ۔ ہمارا بوجھ ہی زیادہ ہو گیا ہے۔"
ماں لڑائی جھگڑا نہیں کرتی تھیں، اپنا کام پیار سے نکلوا لیتی تھیں یا کبھی طنز اور طعنے سے، بیٹیاں آ گئی تھیں انہیں اسے قضیے سے آگاہ کیا گیا تو وہ بھی آب دیدہ ہو گئیں۔
"آپ ہماری فکر نہ کریں بھائی جان ہم اپنے گھر آنا چھوڑ دیں گے بھابھی جان پر سے مہمان داری کا بوجھ کم ہو جائے گا۔"
دونوں نے احتجاجاً چائے شربت تک نہیں پیا، بچوں کو لے کر واپس جا رہی تھیں۔ کمال الدین کا جی چاہا اپنے بال نوچ لے، اس کی بات سمجھنے کو تو کوئی تیار نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس کی بیوی بھی نہیں، جو گھر کے روتے ہوئے بزرگوں اور بیٹیوں سے معافیاں مانگ رہی تھی معذرتیں کر رہی تھی اور اپنی صفائیاں پیش کر رہی تھی۔ دیورانیوں کے لیے یہ سب ایک ڈرامہ تھا جسے وہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔
ٹھیک ہے پھر یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ وہ جو اس کے نام پر اس کی ذات کے رشتے سے بندھ کر یہاں آئی تھی۔ اسے شوہر سے زیادہ شوہر کے گھر والوں کی پروا تھی۔ ان کی خوشی ناخوشی کا خیال تھا۔ کمال الدین کی انا کو شدید ٹھیس پہنچی تھی۔ شادی گھر بسانے کے لیے کی تھی اپنا جی جلانے کے لیے نہیں۔
تابندہ میں بزدلی کے ساتھ ساتھ بے وقوفی بھی تھی۔ والدین نے اچھی بہو بننے کے بہت سے گن سکھائے تھے، اچھی بیوی بننے کا فارمولا بس یہی تھا کہ سسرال والوں کے دل میں گھر کر لو، شوہر خود بخود مٹھی میں آ جائے گا۔ مگر کمال الدین ان مردوں میں سے تھا نہ ان شوہروں میں سے، اس کے دل کا راستہ نہ معدے سے ہو کر گزرتا تھا نہ گھر والوں کی خوشی اور خوشنودی سے، اس کا اپنا الگ ایک مزاج تھا ذوق جمال اور ذوق لطیف سے بھرپور۔
تابندہ اس کے مزاج کے مطابق ڈھلنے میں بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔ کمال الدین اگر مڈل کلاس کا وہ عام سا فرد ہوتا جس کے مالی وسائل محدود اور کم ہوتے تو شاید وہ جل کڑھ کر، مجبوری میں گزارہ کر لیتا مگر اس کے پاس کسی شے کی کمی نہیں تھی، وجاہت بھی تھی، تعلیم بھی اچھا عہدہ اور قابل رشک تنخواہ۔
گھریلو حالات اور بیوی سے بے زار آئے ایسے مرد کو باہر کوئی کمی تو نہیں ہوتی پھر بھی کمال الدین نے کوئی غلط یا ناجائز ذریعہ نہیں اپنایا۔

اس نے دوسری شادی کر کے ایک علیحدہ فلیٹ کا بندوبست کرلیا تھا۔

تابندہ کے حقوق میں کوئی کمی نہیں تھی۔ گھر کو، بیٹی کو وقت دیا اخراجات پورے کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر تابندہ کے اندر دور تک سناٹا پھیل گیا تھا۔

اگلے دس برسوں میں جب ایک ایک کر کے کمال الدین کے دادا، دادی اور والدین دنیا سے چلے گئے تب تابندہ اپنی بیٹی حمرہ کو لے کر اپنے والدین کے گھر آ گئیں۔ یہاں ان کے والدین بھی فوت ہو چکے تھے، دونوں بھائی ملک سے باہر تھے، یہ گھر انہوں نے دونوں بہنوں کو دے دیا تھا۔

تابندہ سے بڑی بہن رخشندہ جنہیں سب انابی پکارتے تھے۔ وہ اپنی چھوٹی سی پوتی بریرہ کے ساتھ وہاں مقیم تھیں۔ تابندہ اور حمرہ کے آنے سے گھر کی رونق تو بڑھ گئی تھی مگر دلوں کے سناٹے اور بھی گہرے ہو گئے تھے۔

☆☆☆

نئے علاقے میں رونق بہت تھی، بلڈنگ اور پارک کے آس پاس کافی ساری دکانیں تھیں، خریدنا تو تھوڑا سا سامان تھا، مطلوبہ چیزیں خرید کر وہ یونہی گھوم پھر کر دکانیں دیکھنے لگیں، جو انواع واقسام کے سامان سے بھری ہوئی تھیں، خریدار بھی ایسے ہی تھے مکھیوں کی طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

"انہیں دیکھ کر کون کہے گا کہ یہاں غربت ہے، حالانکہ بہت ہے۔" انابی نے اندر باہر ہوتے لوگوں کو اور ان کی خریداری کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا پھر واپسی کے ارادے سے جو پلٹیں تو جی دھک سے رہ گیا۔ چلتے چلتے اتنی آگے تک نکل آئی تھیں اب واپس بھی جانا ہے، ادھر مغرب کا وقت بھی ہونے والا تھا۔ رات میں انہیں ویسے ہی کم نظر آتا تھا۔

"اے ہائے اب کیا کروں؟" پیدل چلنے کی تو ہمت نہیں ہو رہی تھی، اب کوئی رکشہ یا ٹیکسی ہی دیکھنا پڑے گا۔

وہ متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں، موٹر سائیکلوں کا اور پرائیویٹ گاڑیوں کا ہجوم تھا، رکشہ تو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا کچھ اور آگے جا کر مین روڈ تھا وہاں سے مل سکتا تھا۔

"میری بھی عقل پہ پتھر پڑ گئے تھے، اچھا بھلا دونوں بچیاں روک رہی تھیں کہ کل چلیے گا ہمارے ساتھ مگر نہیں، مجھے تو جس چیز کی دھن لگ جاتی ہے بس لگ جاتی ہے۔ اس لیے رخشندہ بی، آئندہ کے لیے کان پکڑو ہر معاملے میں پھرتی دکھانا ضروری نہیں، دو چار چیزیں تھی، کل بھی آ سکتی تھیں۔"

کھڑے کھڑے دل ہی دل میں خود کو لتاڑنے کے ساتھ ساتھ وہ کوئی سواری بھی تلاش کر رہی تھیں اور بالآخر ایک سواری نظر آ ہی گئی۔

"ارے بیٹا!" انہوں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اور شکل سے ذرا معزز و معتبر نظر آتے شخص کو مخاطب کیا۔

"ہمیں آگے تک چھوڑ دو گے وہ اس بلڈنگ تک؟" انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا۔

اس شریف انسان نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے ہامی بھر لی اور ان کی مطلوبہ عمارت تک لا کر انہیں اندر لے جا کر لفٹ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بہت بہت شکریہ بیٹا! بس اب ہم چلے جائیں گے۔" رخشندہ بی اس کے اخلاق سے بے حد متاثر ہو رہی تھیں۔

"میں بھی یہیں رہتا ہوں۔" لفٹ آ کر رکی تو اس میں اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے بتایا۔

"اچھا؟ کون سے فلور پہ؟"

"ففتھ فلور پہ۔"

"اے لو، ہم بھی تو وہیں شفٹ ہوئے ہیں۔" وہ تو اچھل ہی پڑیں۔

"ہم بھی نئے آئے ہیں۔" گھنی مونچھوں تلے عنابی لب مسکرائے۔

کاریڈور میں چلتے ہوئے وہ نمبر پڑھتی جا رہی تھیں پھر نمبر چار کے آگے رک گئیں۔

"یہ آ گیا ہمارا فلیٹ اور تم کون سے فلیٹ میں

رہتے ہو بچہ؟'' رخشندہ بی کو متوقع پڑوسی سے اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔

''آپ کے بالکل سامنے۔'' اس نے اپنے فلیٹ کی کال بیل بجائی اور رخشندہ بی نے بھی۔

'ارے بیٹا! بہت شکریہ تمہارا اب ایسا ہے کہ کم از کم ایک کپ چائے پر تو تمہارا حق بنتا ہے۔'' جب تک بریرہ نے دروازہ کھولا، انہوں نے اپنے مددگار اور پڑوسی کو چائے کی دعوت دے ڈالی۔

''اب تو ہم رات کے کھانے کے بعد چائے پئیں گے۔'' مددگار نے عذر پیش کیا۔

''تو ٹھیک ہے رات کا کھانا کھا کر آ جانا، ویسے اور کون کون ہے گھر میں؟''

''انا بی اندر آئیں نا۔'' بریرہ کو یوں کھڑے کھڑے کوفت ہو رہی تھی۔

''اچھا بیٹا خدا حافظ!'' اس کا جواب سنے بغیر وہ غڑاپ سے اندر گھسیں اور بریرہ نے فٹافٹ دروازہ بند کیا۔

''یہاں کس سے جان پہچان ہو گئی آپ کی؟ وہ بھی اتنی جلدی؟ محتاط رہیں یہ پرانا محلہ نہیں ہمارا جہاں سب ایک دوسرے کا اگلا پچھلا جانتے ہیں یہاں کیا بھروسا کسی کا؟'' بریرہ نے تقریر ہی جھاڑ دی۔

''اچھا اب اتنی پہچان ہے انسانوں کی، دھوپ میں سفید نہیں کیے یہ بال۔'' وہ صوفے پہ ڈھیر ہو گئیں دوپٹہ سر پہ ٹھیک کیا مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ ''شکل دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے شریف ہے یا بدمعاش۔''

بس جو انا بی کو شریف لگ جائے وہ سب کو ہی شریف لگنا چاہیے۔ بریرہ اور حمرہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں۔

☆☆☆

''یہ کیا ہے؟'' ماموں نے چمچے کی مدد سے پلیٹ میں رکھا ملغوبہ اٹھایا۔ سفیدلئی میں ایک دو مٹر کے ہرے ہرے دانے چمک رہے تھے۔

''مٹر چاول پکائے تھے، پانی ذرا زیادہ ہو گیا۔''

''ذرا؟ ایک دو جگ پانی ذرا ہوتا ہے؟''

''اچھا بس چپ چاپ کھا لیں شکر کریں پکا پکایا مل رہا ہے ورنہ بازار سے لا کر یا منگوا کر کھانا پڑتا تو پتا چل جاتا۔''

بھانجے صاحب نے بے نقط سنا دیں، غصے میں بھرا بیٹھا تھا، خاندان میں اس کے ہم عمر جتنے بھی کزنز تھے سب کے سب ٹھکانے لگ گئے تھے ایک آخری بچا تھا اس کی بھی شادی خانہ آبادی کا کارڈ آ چکا تھا۔ ایک یہ تھے ہنوز لنڈورے اور کچھ نہیں معلوم کہ اس عہدے پہ کب تک براجمان رہیں گے۔

''تو کوئی کوکنگ کورس کیوں نہیں کر لیتا بلکہ گوگل پہ سرچ کر کے پکایا کر بالکل پرفیکٹ پکے گا۔''

ماموں صاحب اس کے پکائے ہوئے ملغوبے کو حلق سے نیچے اتارتے ہوئے جو مشورے دے رہے تھے۔ وہ بلو کے حلق سے تو بالکل بھی نیچے نہیں اتر رہے تھے۔

''آپ ایک عدد بیوی کیوں نہیں لے آتے یا کم از کم بہو ہی لے آئیں۔'' وہ تڑخ کر بولا تھا۔

''بہو؟'' ماموں کی موٹی موٹی خمار آلود آنکھوں میں ایک لمحے کو حیرانی ابھری۔

''ہاں تو بھانجا بھی تو بیٹے کے برابر ہی ہوتا ہے۔'' بلو نے اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالا۔

''واہ بیٹے واہ! بہت شوق آ رہا ہے سہرا باندھنے کا اور گھوڑی چڑھنے کا۔ سارے ارمان ناک کے رستے نکل جائیں گے، اپنے دوستوں کا حشر دیکھ رہا ہوں اور خاندان میں بھی کتنوں کا حال برا ہے۔'' ماموں کا انداز کبھی ناصحانہ ہوتا تو کبھی طنزیہ۔

''آپ نے چھانٹ چھانٹ کے دوست ہی ایسے بنائے ہیں جو اپنی بیوی کے اور غم دوراں کے ستائے ہوئے ہیں۔''

''اچھا یار! بات سن کھانے کے بعد چائے کی دعوت ہے ہماری۔''

''چائے کی دعوت؟'' بلو صاحب نے بھنویں سکیڑ کر ماموں کو دیکھا۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ اتنی سردی میں، ایک

کپ چائے پینے کے لیے تیاری کروں۔"

"زیادہ دور نہیں جانا۔" وہ آرام سے بولے۔

"پھر کتنی دور جانا ہے؟"

"افوہ، کتنا بحث کرتے ہو، اسی لیے منع کرتا ہوں، شادی نہ کرنا، دو گھنٹے میں ہی بیوی عاجز آجائے گی۔"

"اس سے میں کوئی ایسی باتیں کروں گا؟" اتنے پیار سے مسکرایا تھا کہ ماموں جان اس مسکراہٹ پر غش کھاتے کھاتے بچے۔

☆☆☆

عشاء کی نماز پڑھ کے، کھانا کھا کے، انابی تو کمبل میں گھس گئیں۔

"ارے یہ سردی تو ہڈیوں میں گھسی جارہی ہے۔ وہ کمبل میں بھی کانپ رہی تھیں۔ میرا لحاف نہیں لائیں تم لوگ؟ یہ کمبل ہے یا چادریں۔"

"ابھی لحاف والی سردی کہاں پڑی ہے؟" حمرہ نے اپنا موبائل اٹھایا اور آن کرنے لگی یہ وقت اس کے ڈراموں کا تھا۔

"اور پڑے گی بھی نہیں۔ یہاں تو اس ٹھنڈ کو بھی غنیمت جانیے، ہائے کاش ہم لوگ کسی "ٹھنڈے علاقے" کی پیداوار ہوتے۔ جہاں برف باری ہوتی اور ایسی سردی پڑتی کہ بس مزا ہی آجاتا؟" بریرہ نے بھی کمبل میں گھستے ہوئے اپنی حسرتوں کا اظہار کیا۔

"کسی ٹھنڈے علاقے میں پیدا ہوتیں تو کسی گرم علاقے میں پیدا ہونے کی آرزو کرتیں، انسان تو ہے ہی ناشکرا۔ کسی حال میں چین نہیں ہے اسے۔"

انابی نے ناصحانہ انداز اپنایا اور اپنا منہ کمبل میں چھپالیا۔

حمرہ ہینڈفری لگا کر "پرچھائیاں" دیکھ رہی تھیں۔

"ہائے کتنی حسین ہے ساحرہ کاظمی اور شکیل کو دیکھو کتنا پیارا ہیئر اسٹائل ہے۔ "ان کہی" تک آتے آتے نہ جانے کہاں اڑ گئے سارے بال۔"

حمرہ نے بریرہ کے آگے اسکرین کی۔ ایک تو یہ بڑی مصیبت تھی کہ جو ڈرامے وہ خود دیکھتی تھیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کلپس اور تبصرے بریرہ کو بھی "برداشت" کرنے پڑتے تھے۔

"انابی کو دکھاؤ جو بات بات پہ ہمیں جتاتی رہتی ہیں اور ٹوکتی رہتی ہیں کہ ہمارے دور میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔" بریرہ نے انابی کا تکیہ کلام دہرایا۔

"یہ دیکھ لیں اپنے دور کے ڈرامے۔ شیفون کی ساڑھیاں، سلیولیس چھوٹے چھوٹے سے بلاوز، جدید تراش خراش کے بیل باٹم، میکسیاں اور دوپٹے ندارد۔" بریرہ کا خطاب انابی سے تھا جو وہ بخوبی سن اور سمجھ رہی تھیں۔

"بھئی ہم تو "شمع" دیکھتے تھے۔ شوق سے، اب فیشن تو ہر دور میں ہی کیا ہے سب نے۔" انابی نے ذرا کی ذرا کمبل سے منہ نکالا اور بات ہی ختم کردی۔ پھر تھوڑی دیر بعد کچھ یاد آیا تو کمبل منہ سے نکال کر دونوں سے مخاطب ہوئیں۔

"شہ ذوری۔" بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔ تب تو شادی شدہ تھے ہم۔ اللہ بخشے ہمارے ابا میاں (سسر) نے چند قسطوں کے بعد یہ ڈرامہ دیکھنے پر پابندی لگادی تھی۔"

"کیوں؟"

"کہنے لگے تم لوگ بھی یہی سیکھو گی۔ آستینیں چڑھا چڑھا کر ہر ایک سے لڑنے کو تیار کہ "بہت بری ہوں میں۔" انابی بتاتے بتاتے ہنس پڑیں۔

"ایک تو پہلے کے مردوں کو عورتوں کے اخلاق کی اور انہیں سدھارنے کی بڑی فکر رہتی تھی۔" بریرہ کو اپنے پردادا کی پابندی کچھ بھائی نہیں۔

"کیا پہلے کے، کیا آج کے...... مرد تو ہر دور میں ایک ہی رہتا ہے بھنو۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔"

انابی نے کمبل دوبارہ ڈھک لیا۔ بریرہ خاموش رہی۔ حمرہ کے ہینڈ فری لگا ہوا تھا دھیان ڈرامے کی طرف۔ ورنہ وہ ضرور پھڑک اٹھتیں۔

"دیکھا، اسی لیے تو شادی نہیں کرنا چاہتی۔ بھلا مرد بھی کبھی بدلتا ہے؟" اسی وقت دروازے کی گھنٹی بج گئی۔ دو چار گھنٹیوں کے بعد بریرہ نے سوچنے کی

زحمت کی۔ کیا یہ ہماری بیل بج رہی ہے؟ اس نے اپنے ساتھ ہی کمبل میں گھسی حمرہ کو ہلایا۔

"کیا ہے؟" بریرہ کو دیکھے بغیر کسمسائیں۔

"بیل بج رہی ہے۔ سنیں تو؟" بریرہ نے ہینڈ فری کی تار کھینچی۔

"بیل؟ اس وقت کون آ گیا؟" حمرہ نے موبائل میں وقت دیکھا۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ انابی نے بھی کمبل سے منہ نکالا۔

"اے اس وقت کون گھنٹیاں بجا رہا ہے؟"

"یہ تو پوچھ کر ہی پتا چلے گا۔" حمرہ دروازے کے پاس آئی۔ "کون ہے؟"

"ہم ہیں؟"

"ہم کون؟"

"آپ دروازہ کھولیں پلیز، ہم مہمان ہیں؟"

"مان نہ مان میں تیرا مہمان پھپھو! دروازہ مت کھولیے گا۔ چور ڈاکو نہ ہوں، وہ بھی راتوں میں ہی آتے ہیں۔" بریرہ نے پیچھے سے باآواز بلند پھپھو کو مشورہ دیا۔

"نام بتایئے گا۔" حمرہ دروازے کے پاس متذبذب سی کھڑی تھیں۔ باہر بھانجے صاحب کھڑے ماموں کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ اس عزت افزائی پر۔

"جی میرا نام فخر حیات ہے اور میرے بھانجے کا نام ظہیر الدین بابر ہے۔"

"ہیں؟" حمرہ نے پیچھے مڑ کر انابی کو دیکھا۔

"ظہیر الدین بابر کو تو میں جانتی ہوں۔ بادشاہ تھا۔"

"آپ کسی فخر حیات کو جانتی ہیں؟"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ ہمارے دور قریب کے سارے رشتے داروں میں اس نام کا تو کوئی نہیں تھا۔ ہاں ایک فخر النساء بھابھی تھیں، مگر وہ تو......"

"آنٹی نے ہمیں چائے پہ بلایا تھا۔" باہر سے پھر وضاحت آئی۔

"آنٹی نے؟" بریرہ نے حمرہ کو اور حمرہ نے انابی کو حیرت سے دیکھا۔

"کس نے کسے چائے پر بلایا ہے؟"

"اے ہائے۔ میں نے ہی تو بلایا تھا بچے کو چائے پر۔ توبہ توبہ، کیسا دماغ ہو گیا ہے میرا۔ بتاؤ ذرا چند گھنٹے پہلے کی بات ہی بھول گئی۔" انابی نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

"انابی! آپ بھی بس......" حمرہ نے دروازہ کھول دیا اور دونوں مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

لاؤنج میں آئی تو انابی نے شام کا سارا واقعہ سنایا۔

"ٹھیک ہے، ہیلپ کر دی تھی۔ تھینک یو بول دیتیں۔ یہ چائے وائے پر بلانے کی کیا ضرورت تھی۔" حمرہ اور بریرہ اس معاملے میں ہم خیال تھیں۔

"ارے بھئی ہمسائے ہیں۔ میل جول تو ایسے ہی بڑھتا ہے نا۔" انابی اپنی منطق سمیت ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔ حمرہ نے دوبارہ کمبل میں گھس کر ہینڈ فری کانوں میں لگا لیے۔ بریرہ کو ہی کچن کا منہ دیکھنا پڑا۔

"اکیلے ہی آئے ہو بیٹا؟" انابی ڈرائنگ میں مہمانوں کے ساتھ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"نہیں اکیلا تو نہیں ہوں۔ یہ میرے بھانجے ہیں، میرے ساتھ ظہیر الدین بابر۔"

"میرا مطلب ہے کہ گھر میں اور کون کون ہے۔ لے آتے انہیں بھی۔"

"گھر میں ہم دونوں کے علاوہ ایک ملازم ہے مگر وہ پرسوں سے کام پر آئے گا۔"

"ہائیں۔" انابی کا منہ کھل گیا مارے حیرت کے۔ "میرا مطلب تھا کہ ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے وغیرہ۔"

"والدین فوت ہو گئے ہیں۔ ایک بھائی اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔ ایک دبئی میں اور ایک بہن لاہور میں ہیں۔ سب سے بڑی بہن اور بہنوئی انتقال کر گئے تھے۔ یہ بھانجا دس سال کی عمر سے ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے۔" فخر حیات نے سنجیدگی اور اختصار

سے اپنے بارے میں بتایا۔

''ائے ہائے۔ بچہ بے چارا!'' انہوں نے ہمدردی سے بابر عرف ببلو کو دیکھا۔ ''میری پوتی کے ساتھ بھی بس کچھ اسی طرح ہوا ہے۔ چھوٹی سی چھوڑ کے بہو انتقال کر گئی۔ بیٹے کا دوسرا بیاہ کیا۔ آنے والی نے اس ننھی سی جان کو بوجھ سمجھا۔ ہم نے کہا کہ بھئی جب تک ہم زندہ ہیں، پال لیں گے اپنی پوتی کو۔ تم اپنے بال بچوں کے ساتھ خوش رہو۔ چار بچے ہیں دوسری کے۔ الگ رہائش کر لی ہے، اب بیٹی کو بلاتا ہے، مگر کم جاتی ہے وہاں۔ پھر اب تو مصروف بھی رہتی ہے، اسکول میں پڑھاتی ہے پھر گھر کی ذمہ داریاں۔ کوئی اچھا رشتہ مل جائے تو ہاتھ پیلے کر دوں۔''

عادت کے مطابق وہ نان اسٹاپ بولتی ہی چلی گئیں۔ پھر یکایک انہیں کچھ یاد آیا۔

''اپنے بیوی بچوں کے بارے میں نہیں بتایا تم نے؟''

''بیوی......اور بچے......؟'' فخر حیات صاحب نے ذرا پریشان ہو کر سر کھجایا۔

''بیوی، ڈھونڈ رہے ہیں ان کے لیے۔ جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ مل گیا۔ ان کے ہاتھ بھی پیلے نیلے یا لال ہرے کر دیں گے۔'' بابر عرف ببلو پہلی بار بولے تھے اور چھپر پھاڑ کر بولے تھے۔

''خاموش!'' ماموں نے بھانجے کی پسلیوں میں کہنی ماری۔

''اے لو، شادی نہیں کی اب تک؟'' انابی نے ناک پر انگلی رکھی۔

''کوئی ملی ہی نہیں اب تک۔'' بھانجے کو تو موقع مل گیا تھا بولنے کا اور ماموں بے بس اور خاموش تھے۔

''یہ لو بتاؤ ذرا۔ لڑکیوں کا بھی کوئی کال ہے اس جہان میں۔ جس پتھر کو اٹھاؤ دو چار نکل آتی ہیں۔'' انابی مسکرائیں۔

''اور ایسے نادر و نایاب پتھر کہاں پائے جاتے ہیں۔'' ببلو صاحب کا دل تو چاہا سوال کرنے کو مگر بس مارے ادب کے چپ ہی رہے۔

''بیٹا اتنی دیر سے کیوں آئے چائے پینے؟ کھانے کے بعد کہا تھا نا؟'' انابی نے پیار سے پوچھا۔

''دس بجے ہم کھانا کھاتے ہیں۔ ساڑھے دس بجے چائے پیتے ہیں۔ اس لیے اپنے صحیح وقت پر آئے ہیں۔'' فخر صاحب نے وضاحت کی۔

''ہم لوگ آٹھ بجے کھانا کھا لیتے ہیں اور دس بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاتے ہیں۔''

انابی نے اپنے معمولات سے آگاہ کیا۔ بریرہ نے چائے کے بڑے بڑے مگ سمیت ٹرے میز پر رکھی۔ دادی پر جز بز ہو رہی تھی جو ہر ایک کو اپنا سمجھ کر انتہائی اپنائیت بگھارنا شروع کر دیتی تھیں۔

''یہ ساری چائے مجھے پینی ہے۔'' ببلو صاحب نے دہشت زدہ ہو کر اس بڑے سے کنگ سائزنگ کو دیکھا، جسے ماموں جان بہت خوشی اور طمانیت سے دیکھ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کپ یا آدھے آدھے کپ چائے پلانے والوں سے وہ دوستانہ روابط رکھتے تھے نہ ہی ان کے لیے دل میں خیر سگالی کے جذبات، بھانجے صاحب اس کے برعکس تھے۔

''ایک خالی کپ لا دیں، یہ چائے بہت کم پیتا ہے۔'' ماموں جان نے شائستگی کے ساتھ بریرہ سے درخواست کی۔

''جی۔'' بریرہ جبراً خوش اخلاقی سے مسکرائی۔ اندر ہی اندر کلس رہی تھی۔ آدھی رات کے ملاقاتیوں پر غصہ آ رہا تھا۔ اس وقت تو نیند کی وادیوں میں گم ہو کر خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہوتی۔

''چائے بہت مزے کی ہے۔'' فخر حیات نے چائے کی تعریف کی۔

''بلی نے بنائی ہے۔'' انابی نے مطلع کیا۔

''اچھا اچھا......'' موصوف نے سر ہلایا۔ پھر چائے کی چسکیاں لینے لگے۔

''آنٹی! کوئی کام ہو تو بلا تکلف بتایئے گا۔'' چائے پلانے کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے انابی کو پیش کش کی۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ پڑوسی ہی پڑوسیوں کے کام آتے ہیں۔" انابی نے سر ہلایا۔

☆☆☆

سرسبز مخملیں گھاس کی ٹھنڈک اور نمی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ بلند و بالا درخت صبح کی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ پرندوں کی خوش کن آوازیں، صاف اور کھلا آسمان، مجموعی طور پر منظر بہت متاثر کن تھا۔ پہلے جیسے حالات ہوتے تو ضرور اس وقت اور موسم کو انجوائے کرتیں مگر پریشانی اور اضطراب ڈیرا جما کر بیٹھ گئے تھے۔ لاکھ جھٹکنے کی کوشش کرتے، ڈھیٹ بنے بیٹھے رہتے، منہ چڑاتے رہتے۔

"ہیلو۔" جاگنگ اور ایکسرسائز کے بعد فخر حیات اب کچھ ریلیکس تھے ورنہ اپنے وزن میں دو کلو اضافے نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔

"ہیلو۔" اپنے ہی خیالات میں ڈوبی حمرہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"سب ٹھیک ٹھاک؟" فخر حیات نے یونہی سرسری سا پوچھا۔

"ہوں۔"

"جاب کا کیا رہا؟ آنٹی نے ذکر کیا تھا۔" فخر نے فوراً ہی وضاحت بھی کر دی۔

"ایک تو یہ انابی ہر بات، ہر ایک کو بتا دیتی ہیں۔" حمرہ جز بز ہوئیں۔

"مل جائے گی، اپلائی کیا ہوا ہے۔"

"اگر میں کسی کام آ سکتا ہوں تو پلیز۔"

"اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ضرور۔" حمرہ نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"کچن کا نل ٹھیک کام کر رہا ہے اب؟"

"جی ہاں اور بہت شکریہ۔ آپ نے مدد کی۔" حمرہ نے سر اٹھا کر اپنی ہمراہی میں چلتے اس شخص کو دیکھا۔ سامنے طلوع ہوتا سورج اپنی کرنیں ہر طرف اچھال رہا تھا۔

"میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ آپ شکریہ ادا کریں۔ آپ کی خالہ یہ کام کر چکی ہیں۔" فخر تھوڑا سنجیدہ ہو گئے۔

"خالہ؟" ایک لمحے کو حمرہ چونکی اور اگلے ہی لمحے بے ساختہ مسکرا دی۔

"انہوں نے بتایا تھا کہ وہ آپ کی خالہ ہیں۔" فخر کی وضاحت پر اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

"دراصل ان کے بڑے انہیں رخشندہ بی پکارتے تھے۔ ان کے بچے بھی اسی نام سے بلانے کی نقل کرتے تو فقط انابی کہنے لگے اور ان کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی یہی سیکھ لیا۔ وہ ہم سب کی انابی ہیں۔" حمرہ نے تفصیل سے بتایا۔

"اف...... اتنے چھوٹے سے نام کے پیچھے اتنی بڑی کہانی۔" فخر حیران تھا۔

"جی ہاں، یوں بھی ہوتا ہے کبھی...... اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے بڑی بڑی کہانیوں اور معاملات کے پیچھے چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔"

چلتے چلتے حمرہ کے قدم سست پڑ گئے۔ دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ کرنوں سے نہائی ایک بنچ پر وہ بیٹھ گئیں۔ فخر بھی روزانہ کی طرح جلدی سے بھاگنے کے بجائے آرام سے چہل قدمی کر رہے تھے۔ آج چھٹی کا دن تھا اور حمرہ کے لیے تو ہر دن ہی چھٹی کا دن تھا جب تک نئی جاب نہیں مل جاتی۔

"کچھ مختلف زندگی ہے آپ کی۔ عام لوگوں سے ذرا ہٹ کر۔" فخر اسی بنچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گئے۔

"جی ہاں، میری عمر کی خواتین کی زندگی عموماً شوہر، سسرال اور بچوں کی دلچسپیوں اور معمولات کے گرد گھوم رہی ہوتی ہے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میں ان آفتوں سے محروم ہوں۔" حمرہ نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا تھا۔ فخر ہنس پڑا۔

"اس معاملے میں، میرے اور آپ کے خیالات ایک جیسے ہیں۔"

"اور ایک جیسے ہی رہیں تو اچھا ہے۔ خیالات بدلنے نہیں چاہئیں۔" حمرہ کے الفاظ میں تنبیہ تھی۔

"آئی ایگری ود یو۔" فخر کی نگاہیں ایک لمحے

کو بھنکیں۔ حمرہ کے چہرے کے آس پاس جہاں سورج کی چمکتی کرنیں اس کھبیج چہرے کو اور اجال رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے فخر حیات نے آس پاس کھڑے درختوں کے قریب پھدکتی ہوئی چڑیوں اور بھاگتی ہوئی گلہری کو دیکھا۔

☆☆☆

انابی شال لپیٹے بالکنی میں کرسی پر بیٹھی دھوپ کھا رہی تھیں۔ بظاہر تو وہ نگاہیں سامنے کے نظاروں پر مرکوز تھیں مگر اندر ہی اندر فکر تھی جو انہیں کھائے جا رہی تھی۔ تابندہ اپنی بیٹی کی ذمہ داری انہیں سونپ گئی تھی۔ کچھ نہ بھی کہتی تب بھی بھانجی بڑی پیاری تھی انہیں۔ کوشش میں تھیں کہ کسی طرح حمرہ کا گھر بس جائے مگر بچپن سے ہی اس کے دل میں جو گرہ بندھی تھی، اب تک کھل نہیں سکی تھی۔ اگرچہ تابندہ نے کئی بار اس کے سامنے اپنی ہی غلطی کا اعتراف کیا کہ اسے رشتوں میں، ذمہ داریوں میں توازن برقرار رکھنا نہیں آیا۔ کچھ کمال بھی دیگر عام مردوں سے الگ تھا مگر حمرہ پھر بھی شادی کے نام سے ہی متنفر ہو گئی تھی۔ تابندہ نے اپنی زندگی میں بھی کوشش کی کہ اپنی آنکھوں کے سامنے بیٹی کو ہنستا بستا دیکھ لے مگر ہر بار حمرہ کا جواب نفی میں ہی رہا۔

”میں یوں ہی خوش ہوں اور بہت خوش ہوں۔“ وہ ہر بار یہی کہتی۔ اب انابی کی بھی ہر کاوش کے جواب میں اس کا جواز یہی تھا۔

”مجھے سسرالیوں کی خدمت کر کے کوئی میڈل حاصل نہیں کرنا۔“ ابھی ایک گھنٹہ پہلے اس نے انابی کو یہی جواب دیا تھا۔

”اب کوئی نیم سے پھوٹا کہاں سے لاؤں؟ کوئی نہ کوئی تو آگے پیچھے ہر کسی کا ہوتا ہے۔ وقت کا کیا ہے، یوں دبے پاؤں گزرتا چلا جاتا ہے کہ آہٹ تک نہیں ہوتی۔ ابھی تو رنگ روپ ہے آنکھوں میں سمانے والا، دل کو لبھانے والا۔ پھر یہ وقت بھی ہاتھ سے نکل گیا تو شاید بہت ساری خوشیاں بھی ہاتھ سے نکل جائیں۔ اس لڑکی کا بھی دیکھنا کرنا ہے، اکیلی میں کیا کروں؟ سرور میاں نے کوئی لڑکا دیکھا ہے۔ اب یا تو اسے وہاں لے کر جاؤں، باپ کے پاس یا سرور سے کہوں کہ لڑکے کو یہاں لا کر دکھائے۔“

انابی متفکر ہو کر پہلے حمرہ کے پھر اب بریرہ کے بارے میں سوچ رہی تھیں اور ان ہی بجھی بجھی پریشانیوں کے دوران امید کی ایک کرن ان کے ذہن میں چمکی تھی۔

☆☆☆

”واہ واہ۔ خوشبو تو بڑی اچھی ہے بریانی کی۔ چاول بھی خوب کھلے کھلے ہیں۔“ انابی نے دم لگی بریانی کا ڈھکن ہٹا کر چیک کیا اور بریرہ کو سراہا۔

”سسرال میں بڑے نمبر ملتے ہیں ایسی بریانیوں کے۔“ حمرہ نے ٹکڑا لگایا۔

”ارے تم خاموش رہو۔ بلاوجہ ہی سسرال کو ہوا بنایا ہوا ہے۔“ انابی نے پہلے بھانجی کو لتاڑا، پھر پوتی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”ذرا نکالنا تو ایک ڈش بریانی، سامنے دے آؤں بچوں کو۔“

”آپ کا بڑا دل لگ رہا ہے۔ اتنے بڑے بڑے بچوں میں، یہ ہمارا پرانا محلہ نہیں ہے۔ جہاں آس پاس گھروں میں پکوان بھیجے بغیر آپ کھانا نہیں کھاتی تھیں۔“

”محتاط رہیں ذرا۔ یہ دونوں تو ویسے بھی اکیلے ہیں۔ بالکل چھڑے۔ شکل سے بھلے ہی کتنے شریف اور معقول لگیں۔ کوئی بھروسا پھر بھی نہیں ہے۔“ بریرہ نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنی بھولی بھالی دادی جان کو سمجھانے کی کوشش۔

”ارے چھوٹے بڑے کئی کاموں میں مدد کر دیتے ہیں بچے۔ کسی کے خلوص اور نیک نیتی کو برا نہیں سمجھتے اور اتنا شک وشبہ بھی نہیں کرتے کسی پر، کوئی کسی پر بھروسا نہ کرے تو دنیا کے سارے کاروبار ہی ٹھپ ہو جائیں۔ پہلے اللہ پر بھروسا ہے پھر بندوں پر۔“ دادی جان نے رسان سے پوتی کو سمجھایا۔

”بالکل۔ اعتبار کے بل بوتے ہی پر تو گلشن کا

کاروبار چل رہا ہے۔" حمرہ نے شرارتی انداز میں لقمہ دیتے ہوئے خالہ کی تائید کی۔

"شام تک کی بریانی پکائی تھی۔ آدھی نکال لی پڑوسیوں کے لیے۔"

بریرہ دھیرے سے بڑبڑائی مگر انابی اس کی بڑبڑاہٹ سے بے نیاز ہوکر جاچکی تھیں اور پڑوسیوں کے لاؤنج میں پہنچ چکی تھیں اور بلو بے چارہ جو آنکھوں میں آنسو بھر کے پیاز کاٹ رہا تھا۔ بریانی دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگیا۔

"اف آنٹی! جگ جگ جئیں۔ میری عمر بھی لگ جائے آپ کو۔"

پیاز ویاز ایک طرف کر کے وہ تو ہاتھ دھونے لگا۔

"آپ پلیز تشریف رکھیے نا۔ میں ابھی برتن خالی کر کے دیتا ہوں۔"

"نہ نہ۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ آرام سے واپس کردینا۔" انابی نے اطمینان سے لاؤنج کا صوفہ سنبھالا۔ اوپن کچن تھا۔ ان کے اور بلو کے درمیان صرف ایک کاؤنٹر حائل تھا۔

"کیا کھانے پکانے کی تیاری تھی؟ تمہارا ملازم کہاں گیا جو اس کام کے لیے رکھا تھا؟"

"ارے آنٹی! کیا بتاؤں۔ وہ تو مجھ سے بھی گیا گزرا تھا۔ انڈا تک ابالنا نہیں آتا تھا۔ پہلے تو ہم سے جھوٹ بول دیا کہ سب کچھ پکانا آتا ہے، بعد میں کہنے لگا کہ پکاتے پکاتے سیکھ جاؤں گا۔" بلو نے گرما گرم بریانی پلیٹ میں نکالتے ہوئے رام کہانی سنائی۔

"ہوں...... گھر میں کوئی عورت ہوتی تو سنبھال لیتی سب کچھ۔" انابی نے ہنکارا ابھرا۔

"یہی تو...... یہی تو میں بھی کہتا ہوں ماموں سے۔ کوئی لے آئیں گھر اور کچن سنبھالنے والی۔ تاکہ میری تو جان چھوٹے۔ اب دیکھیں نا، رات کے کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہنڈیا پکا کر پھر جاب پر جانے کی تیاری، ادھر رات کی ڈیوٹی۔ ادھر دن کی ڈیوٹی۔ میرا بس چلے تو ماموں کو پکڑ کے قاضی صاحب کے سامنے بٹھادوں پر کوئی لڑکی تو ملے۔"

اپنا دکھڑا روتے روتے بلو بریانی سے بھری پلیٹ لے کر وہیں آ گیا۔

"نوڈلز اور میکرونی کھا کھا کر اکتا گیا ہوں۔ بازار کی چیزیں کھا کر پیٹ خراب رہنے لگا ہے۔" بلو کی ان سے اتنی علیک سلیک ہوگئی تھی کہ اپنے سارے دکھ سکھ کہہ لیتا تھا۔

"اچھے بھلے تو ہیں فخر میاں۔ نوکری ہے، گھر بار ہے پھر شادی سے کیوں گریز ہے؟" انابی نے سوال کیا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ "آزادی" کی لت لگ گئی ہے۔ کسی کو بھی اپنے سر پر سوار نہیں کرنا چاہتے۔ مجھے بھی یہی پٹیاں پڑھاتے رہتے ہیں۔" بریانی کی بوٹیاں اڑاتے ہوئے بلو نے آگاہ کیا۔

"میاں بیوی تو دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں۔" انابی نے اپنا فلسفہ بیان کیا۔

"ماموں جان کا خیال ہے کہ اس دکھ سکھ کے فلسفے میں، دکھ شوہر حضرات کے لیے اور تمام تر سکھ بیویوں کے لیے ہوتا ہے۔ اپنے بارے میں تو کبھی سوچتے نہیں۔ میری خوشیوں کے آگے بھی دیوار بن کے کھڑے ہیں، کیا کروں۔" بلو نے بریانی کھاتے کھاتے ایک آہ بھری۔

"دیواروں میں سے راستے بنائے جاتے ہیں بیٹا۔" انابی اٹھ کھڑی ہوئیں، انہیں اچانک ہی یاد آیا کہ وہ جائیں گی تو کھانا لگے گا۔

"آنٹی پلیز، بیٹھیے نا۔ کچھ گرم، ٹھنڈا۔ کیا پئیں گی؟" بلو صاحب کو میزبانی یاد آ گئی۔

"بچیاں میرے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہوں گی پھر کبھی سہی۔"

☆☆☆

"یار! تم انسان ہو یا......" کوئی غیر پارلیمانی لفظ کہتے کہتے بھائی جان رک گئے۔

"اچھی لڑکی ہے ڈولی۔ کوئی غیر بھی نہیں۔ ہم

سب کی، تمہاری بھی دیکھی بھالی ہے۔ پتا نہیں کس بات کا نخرہ ہے تمہیں۔"

بھائی جان یوں ہی ہر تیسرے چوتھے مہینے فخر حیات کی کلاس لیتے رہتے تھے۔ کچھ ان کو بھائی کے بیاہ کی فکر بھی تھی۔ کچھ گھر والی کا دباؤ بھی — تھا کہ ڈولی ان کی آدھی گھر والی تھی۔

"جانتا ہوں بھابھی جان کو بھی اور ان کی بہن کو بھی۔ تب ہی تو......" چھوٹے بھائی صاحب مارے ادب کے خاموش ہی رہے۔

"پھر کوئی ڈیٹ فکس کروں، منگنی کی یا نکاح کی؟" فخر کی خاموشی کو نیم رضا مندی سمجھ کر انہوں نے پھر بم پھوڑا۔

"کیا ہو گیا بھائی جان آپ کو؟ کچھ سوچنے سمجھنے تو دیں مجھے۔" فخر حیات کے پیروں تلے زمین سرکنے لگی۔

"کتنا سوچو گے؟ سوچ سوچ کر تو اتنی عمر کر لی۔ تمہاری عمر میں دو بچے تھے میرے۔ تمہاری ایک بیوی تک نہیں ہے۔ بس فیصلہ ہو گیا ہے۔ میں نے آپا جان اور فیضان سے بات کر لی ہے۔ وہ لوگ دو مہینے بعد کراچی آ رہے ہیں، سب مل بیٹھ کر فیصلہ کر لیں گے۔ تم تو اگلے دس سال بھی یوں ہی سوچتے رہو گے۔" بھائی جان نے فیصلہ کن لہجہ اختیار کیا اور فخر حیات کے سر پر تو آسمان گر پڑا۔

"دنیا میں ڈولی کے علاوہ اور لڑکیاں بھی تو ہوں گی۔"

"بالکل ہیں۔ مگر تمہیں تو شاید کوئی لڑکی دکھائی ہی نہیں دیتی۔" انہوں نے طنز کیا۔

"کیا شادی بہت ضروری ہے؟" فخر میاں کی حالت ایسے بگوڑے بکرے کی سی تھی، جسے اچانک ہی قصاب نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہو۔

"جی ہاں۔ اگر دنیا میں کھانا پینا، سونا ضروری ہے تو شادی بھی ضروری ہے اور دو ماہ ہیں تمہارے پاس۔ تیاری بھی کر لینا اور خود کو بھی تیار کر لینا۔"

بھائی جان نے تو فون آف کر دیا تھا مگر فخر میاں کی گھنٹی بج گئی تھی، دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئے۔

بھانجے میاں کو جو علم ہوا کہ ماموں جان کے مکھڑے پر بارہ بجنے کا کیا سبب ہے۔ وہ پہلے تو قہقہہ مار کے لوٹ پوٹ ہو گئے پھر ایک دم سنجیدگی کی پوٹ بن کے بیٹھ گئے۔

"یہ کیا تھا؟" ماموں صاحب نے ابرو اکٹھے کیے۔

"پہلے تو یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ اونٹ پہاڑ تلے آ گیا۔ پھر یکایک ڈولی ممانی کا خیال آ گیا اور پھر...... مزید کچھ کہنے کی تاب نہ رہی۔" ببلو کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"میری زندگی میں تو کوئی ڈولی تیری ممانی نہیں بن سکتی۔" فخر میاں نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔

"اور بڑے ماموں جان آپ کی زندگی میں ہی ڈولی کی ڈولی آپ کے گھر لائیں گے۔" ببلو نے دعوا کیا۔

"ببلو یار! تنگ نہ کر۔" فخر حیات آج بری طرح پھنسے تھے۔ عقل بھی تو کام نہیں کر رہی تھی۔ وہ بھی ایسے موقعوں پر کہیں گھاس چرنے چلی جاتی تھی۔

"اسی لیے کہتا تھا کہ سیٹنگ کر لیں کہیں۔ ایسے برے موقعوں پر کوئی اچھی لڑکی ہی کام آ سکتی ہے۔"

"اب کہاں سے لاؤں کوئی اچھی لڑکی۔" موصوف جھنجلائے۔

"لانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے آس پاس دیکھ لیں۔" ببلو کا دماغ اس مشکل گھڑی میں بہت کام کر رہا تھا۔ "آس پاس یعنی کہ آمنے سامنے۔" بھانجے نے مزید لب کشائی کی۔

"کیا مطلب؟" ماموں جان نے پہلے تو بھانجے کو گھور کے دیکھا پھر یکایک ہی دماغ میں کچھ کلک ہوا تھا۔

"یار! عزت بنی ہوئی ہے، بنی رہنے دے۔" وہ ببلو کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔

"تو ٹھیک ہے۔ عزت بچا لیں اور ڈولی ممانی

سے اپنا گھر اور دل آباد کرلیں۔" بلو صاحب بے نیاز اور لاپروا بن گئے۔

"مگر...... وہ محترمہ تو شادی کے نام سے بھی دور بھاگتی ہیں۔" انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"سوچ کیا رہے ہیں؟ مستقبل کی ڈوبی ممانی سے لاکھ درجے اچھی ہیں محترمہ۔" بلو صاحب مسلسل ماموں جان کو اکسا رہے تھے۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے، بھائی جان یوں ہی دھمکا رہے ہوں مجھے۔" فخر حیات وہ کبوتر بن گئے جو بلی کو آتا دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتا ہے۔

"اپنی یادداشت کو ذرا جھاڑ پونچھ کر استعمال میں لائیں اور یاد کریں، بڑے ماموں جان اور پھوپھو جان نے متحدہ محاذ بنا کر فیضان ماموں کی شادی بھی ایسے ہی کروائی تھی۔ وہ بھی رسیاں تڑا تڑا کر بھاگ رہے تھے اور انہیں بھی کچھ وقت دیا گیا تھا۔ اس کے بعد انہیں سہرا باندھ کر قاضی صاحب کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ آپ زیادہ خوش فہم نہ ہوں، آپ کو تو ڈنڈا ڈولی کرکے قاضی صاحب کے سامنے لے جائیں گے۔"

بدتمیز بھانجے نے بدلحاظی اور حقیقت پسندی کے ساتھ مستقبل کا ایسا نقشہ کھینچا کہ فخر حیات کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔

"اب آپ اپنا منہ بند کرکے بیٹھ جائیں۔"

ماموں جان کی نگاہیں غضب ناک اور لہجہ قہر آلود تھا۔

آہ...... سچ اور حقیقت کا سامنا کرنا کتنا مشکل کام ہے؟

☆☆☆

وہ انٹرویو دے کر باہر نکلیں، جہاں بڑی اچھی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ خوش گوار حدت سے لطف اندوز ہوتی ہوئی مین روڈ کی گرین بیلٹ پر چلتی رہیں۔ آج کا انٹرویو اچھا ہوا تھا۔ ان کی خواہش اور امید تھی کہ اسی اسکول میں جاب مل جائے کیونکہ ان کے فلیٹ سے یہ اسکول بہت قریب تھا۔ اور حمرہ یہی چاہ رہی تھیں، چلتے چلتے ٹھہر کر سیل فون نکالا جو بج رہا تھا۔ لائن پر بریرہ تھی۔

"ہم لوگ یہاں آگئے ہیں مونا آنٹی کے گھر۔ آپ کا انٹرویو ہوگیا تو آجائیں۔"

"اچھا، آرہی ہوں۔"

حمرہ نے لائن کاٹی۔ آج پرانے محلے جانے کا پروگرام تھا۔ بریرہ اور انابی چلی گئی تھیں۔ حمرہ نے کہہ دیا تھا کہ انٹرویو سے واپسی پر وہیں آجائیں گی، زیادہ دور نہیں تھا۔ گاڑی میں پندرہ بیس منٹ لگتے تھے۔

"کوئی رکشہ روک لیتی ہوں۔" سیل فون بیگ میں ڈال کر اس نے سر اٹھا کر مین روڈ پر بہتے ٹریفک کے سیلاب کو بعد میں دیکھا، پہلے اپنے سامنے نگاہ گئی۔ سڑک کنارے کار روک کر وہ حمرہ کو ہی دیکھ رہے تھے۔ حمرہ نے دیکھا تو مسکرا دیے، حمرہ چلتی ہوئی قریب آئیں۔

"آئیے۔" فخر نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

"مجھے کہیں اور جانا ہے۔"

"جہاں جانا ہے، ڈراپ کردوں گا۔ آپ پلیز بیٹھیے۔ ویسے، جانا کہاں ہے؟" حمرہ کے بیٹھنے کے بعد فخر نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"سیدھے سیدھے چلتے رہیے، جہاں مڑنا ہوگا بتادوں گی۔" حمرہ نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھا۔

"مجھے لگا کہ شاید آپ انکار کردیں، نہ بیٹھیں۔" فخر نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں...... کیا میں ڈرتی ہوں آپ سے؟" حمرہ نے تیوریاں چڑھائیں۔

"نہیں۔ خیر ڈرتی تو آپ کسی سے بھی نہیں ہیں۔ اتنا تو مجھے اندازہ ہے۔" فخر نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر کہا۔ "ویسے مجھے افسوس ہوا آپ کے انکار پر۔"

"اور مجھے افسوس ہوا، آپ کے پروپوزل پر۔" حمرہ نے ترنت جواب دیا۔ "میں نے آپ کو ایک

شریف اور معقول انسان سمجھا تھا۔"
"شریف ہوں، تب ہی تو ڈائریکٹ پروپوزل بھیج دیا۔ غیر شریف یا نامعقول ہوتا تو فلرٹ کی کوشش کرتا۔"
"اور میں اس کار خیر کے لیے بہت آسانی سے دستیاب ہوجاتی آپ کو؟" حمرہ کا پارہ ہائی ہونے لگا۔
"اسی لیے میں نے کوشش کا لفظ استعمال کیا ہے۔" مبہم سا مسکرا کے کار سگنل پر روک دی۔ ایک فقیرنی کھڑکی کے پاس آکر صدا لگانے لگی۔
"اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ چاند سا بیٹا دے۔ کوئی صدقہ، کوئی خیرات...... جھولی میں ڈال دو بی بی! اللہ بہت دے گا تمہیں۔"
"ایک تو یہ لوگ؟" حمرہ نے جز بز ہو کر منہ پھیر لیا۔
فخر نے بیس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ سگنل گرین ہو رہا تھا، اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔
"اگر آپ کچھ غور کرلیتیں میری درخواست پر، سوچ سمجھ کر جواب دیتیں تو......"
"اگلے دس سال تک بھی غور کرنے اور سوچنے سمجھنے کے بعد میرا جواب یہی ہوگا۔" حمرہ نے بات کاٹ کر رکھائی سے جواب دیا۔
"یہاں سے موڑ لیجیے گا۔" اس نے آگے ایک موڑ کی طرف اشارہ کیا۔
فخر نے پانچ منٹ بعد ایک دو گلیاں اور پار کرنے کے بعد مونا آنٹی کے گھر کے باہر گاڑی روک دی۔
"آپ کو کیسے معلوم ہوا مجھے یہاں اترنا ہے۔"
"کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے انابی اور بریرہ کو یہیں ڈراپ کیا تھا میں نے۔"
"اوہ،" حمرہ نے ایک تیکھی نظر ان پر ڈالی۔
"پھر تو یقیناً انہوں نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ میں کون سے اسکول کے باہر مل سکتی ہوں؟" حمرہ نے دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔
"جی بالکل۔ انابی نے کہا تھا کہ آپ کو بھی لے آؤں۔ میرا وہاں سے گزرنا اتفاق نہیں تھا۔ ایسے اتفاقات تو فلموں، ڈراموں اور کہانیوں میں ہوتے ہیں۔"
حمرہ نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ ایک مانوس آواز بہت قریب سے سنائی دی۔
"ہائے۔ حمرہ! یہ تم ہی ہو نا؟" کالج اور یونی ورسٹی کے دنوں کی دوست کنزیٰ بہت خوشی اور حیرت سے مخاطب تھی۔
"تم یہاں کیسے؟ تم تو شاید سعودیہ چلی گئی تھیں۔" حمرہ کار سے اتر آئیں۔ کنزیٰ سے گلے ملنے لگیں۔ پرانی دوست کو دیکھ کر انہیں ایک انجانی سی خوشی ہوئی۔
"آج کل پاکستان آئی ہوئی ہوں۔ یہاں میری بہن رہتی ہے۔ اسی سے ملنے آئی تھی اور تم سناؤ۔ شادی ہوگئی ہے؟ مبارک ہو یار!" کنزیٰ نے گاڑی میں جھانکا۔ "السلام علیکم! بھائی جان!"
"کوئی شادی وادی نہیں ہوئی میری۔" حمرہ نے دانت پیسے مگر کنزیٰ اس کے لہجے پر غور کیے بغیر اپنی ہی ہانکتی رہی۔
"اچھا، انگیجمنٹ ہوئی ہے ابھی۔ پھر شادی کب ہے؟"
"افوہ......" حمرہ نے اسے کچھ سمجھانا یا وضاحت دینا لاحاصل سمجھا اور گھوم کر فخر کی جانب آئی جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے یقیناً صورت حال کو انجوائے کررہے تھے۔
"آپ ابھی تک یہاں کیوں ہیں؟" دبی ہوئی آواز میں وہ غرائیں۔
"میں جارہا ہوں۔" فخر حیات نے اپنے بے ساختہ ابلتے ہوئے قہقہے کا گلا گھونٹتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کردی۔
حمرہ پلٹ کر کنزیٰ کی جانب آئیں۔
"یہ میری آنٹی کا گھر ہے۔ آؤ، یہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" حمرہ اپنی سہیلی کو لے کر مونا آنٹی کے گھر میں داخل ہوگئیں۔

☆☆☆

بالکنی ہی واحد جگہ تھی جہاں دھوپ آتی تھی۔ یہاں بیٹھ کر سامنے پارک کا نظارہ کرتے رہو یا سڑک پر دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کو دیکھتے رہو۔ وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا

حمرہ چائے کا مگ سنبھالے وہاں بیٹھی تھیں۔ انابی چھلے ہوئے کینو پلیٹ میں لے کر آئیں اور دوسری کرسی سنبھال کر بیٹھ گئیں۔

"پھر بٹیا! کچھ سوچا تم نے؟" انابی مورچہ سنبھال کر پھر سے چوکس ہوئیں۔

"بتا تو چکی ہوں۔" حمرہ خود ابھی الجھی پریشان سی تھیں۔

"پتا نہیں تم نے بھی کیوں ضد باندھ لی ہے شادی سے۔ انسانوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں میں، اس رشتے کا کیا قصور ہے؟"

"اس رشتے میں بندھ کر ہی تو انسان غموں کا اور مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔" حمرہ نے انابی کو دیکھا جن پر اسے ترس بھی آتا تھا۔ خود سے شرمندگی ہوتی تھی۔ بے چاری، اس کے لیے ہلکان ہوئی جارہی تھیں اور حمرہ شاید انہیں اپنا ڈر اور خوف ٹھیک سے سمجھانے میں ناکام تھیں۔

تابندہ کا غم، اداسی اور پچھتاوا خود حمرہ کے بھی اندر تک اتر گیا تھا۔ اس کا ردعمل منفی اور غیر صحت مندانہ تھا مگر وہ اس سلسلے میں خود کو مجبور اور بے بس پاتی تھی۔ انابی بھی مجبور تھیں۔ گزرتا وقت، بھانجی کے خیالات انہیں کھائے جارہے تھے اور اب تو فخر حیات کی صورت میں امید کی کرن نظر آئی تھی۔ وہ دل سے چاہ رہی تھیں کہ اس بار تو حمرہ کی ناں کو ہاں میں بدل دیں۔

فخر نے انہیں بتایا تھا کہ اگلے ماہ میں اس کے بہن بھائی آئیں گے تب تک وہ حمرہ کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ وہ نہ بھی کہتا تب بھی انابی یہ فریضہ ہر بار سرانجام دیتی تھیں۔ جب جب اس کے لیے کہیں سے پروپوزل آتا تھا۔

"یہ تو اکیلا ہے، سسرال کا کوئی جھنجٹ ہی نہیں۔ میں تو کہتی ہوں، اللہ نے اپنی غیب سے مدد کی ہے۔ کفران نعمت نہیں کرتے بیٹا۔" انابی نے پھر حمرہ کو مخاطب کیا۔

"کفران نعمت کی کیا بات ہے انابی! میں خود اپنی ہی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی، کسی اور کی کیا اٹھاؤں گی۔ بے شک وہ ایک اکیلا اکلوتا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔" حمرہ نے رسان سے جواب دیا۔

"یہ تو کوئی جواز نہ ہوا۔ کیا ساری عمر یوں ہی رہو گی؟ اکیلے زندگی نہیں گزرتی بٹیا! قریبی رشتے قریب نہ ہوں تو دنیا والے زندگی اجیرن کردیتے ہیں۔ ہم تو چراغ سحری ہیں، اب بجھے کہ تب بجھے میرے بعد کیا ہوگا تمہارا؟"

"بریرہ تو ہے نا۔" حمرہ اس ایموشنل بلیک میلنگ پر جھنجلائیں۔

"ارے تو کیا اس کے جہیز کے ساتھ جاؤ گی؟ کوئی موزوں رشتہ ہو تو آج ہی اسے رخصت کردوں میں۔" انابی اس سے زیادہ جھنجلائیں۔ حمرہ نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ پھیرا۔

"ہمارے دور میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا، جو چھوٹے ہوتے تھے، وہ بڑوں کی بات مان ہی لیتے تھے۔" انابی کے لہجے میں مایوسی در آئی۔

"اف۔ پھر وہی جذباتیت۔" حمرہ اپنا سر تھام کے بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

تاریکی کے بطن سے سپیدہ سحر نمودار ہوچکی تھی۔ اپنے معمول کے مطابق شال لپیٹے، نرم سبز گھاس پر سست روی سے پڑتے قدم، وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس مخصوص بنچ پر آ بیٹھیں۔ بنچ کی سرد سطح پر پہلے تو یک دم جھرجھری آجاتی تھی پھر آہستہ آہستہ یہ ٹھنڈک ختم ہوجاتی تھی اور جذبوں اور رویوں کی برف بھی اسی طرح دھیرے دھیرے پگھلتی جارہی ہے اور گرم احساس اس ٹھنڈک کی جگہ لے لیتا ہے۔ بنچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھے فخر کو دیکھتے ہو۔ یہ حمرہ

نے سوچا۔

''انکار کر کے بھی اداس ہیں، کیوں؟'' دونوں کے درمیان اجنبیت اور سرد مہری کی برف کب کی پگھل چکی تھی۔ باوجود حمرہ کے انکار کے، فخر کا رویہ پہلے جیسا ہی تھا۔ دوستانہ اور احترام آمیز۔

''اس کا سبب انکار تو ہرگز نہیں۔'' حمرہ نے اس کی خوش فہمی کو رد کیا۔

''پھر؟''

''پتا نہیں۔'' حمرہ نے کندھے اچکائے۔

آج تو بے سبب اداس ہے جی
عشق ہوتا تو کوئی بات بھی تھی

''ہوں...... ویسے کبھی کبھی بے سبب اداسی کے دورے مجھے بھی پڑتے ہیں۔'' فخر نے اعتراف کیا۔ جس درخت کی چھاؤں میں یہ بنچ تھی، اس پر بیٹھی چڑیا مسلسل شور مچا رہی تھی۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' حمرہ نے سر اٹھا کر اس شور مچاتی چڑیا کو دیکھا۔

''کیا پرندے بھی اداس ہوتے ہیں اور اپنے اندر کی خاموشی کو باہر کے شور شرابے سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں؟''

''انسان ہر وقت ایک ہی حال میں تو نہیں رہتا نا۔ کبھی خوش، کبھی چپ، کبھی ہنسی، کبھی اداسی۔ یوں ہی دن رات گزر رہے ہیں بلکہ یہ زندگی۔'' فخر کے لہجے میں آج وہ زندہ دلی مفقود تھی، جو اس کے مزاج کا حصہ تھی۔

''خیریت تو ہے نا؟'' حمرہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں...... خیریت ہی ہے۔'' فخر کی موٹی موٹی پرکشش آنکھیں ایک لمحے کو حمرہ کی جانب اٹھیں پھر رخ بدل گئیں۔

''ایک بات شیئر کروں آپ سے؟ میں نے آج تک کبھی کسی سے نہیں کہی۔'' فخر کی نگاہیں نیچے قدموں تلے مخملیں گھاس کے فرش پر تھیں۔

''اگر مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو ضرور کریں۔''

''میں سب بہن بھائیوں میں چھوٹا اور لاڈلا تھا، والدین سمیت سب کا، ایک ایک کر کے سب بھائیوں کی اور بہن کی شادی ہو گئی۔ والد صاحب تو بہت پہلے فوت ہو گئے تھے امی موجود تھیں۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد جیسے ہی جاب ملی انہوں نے شادی کے لیے کہنا شروع کر دیا۔ میں لاڈلا ہونے کے ساتھ ساتھ لاپروا اور غیر سنجیدہ بھی تھا۔ امی سے میں یہی کہتا رہا کہ ابھی لائف انجوائے کرنے دیں۔ کر لیں گے شادی بھی۔ وہ اصرار کرتی رہیں اور میں انکار کرتا رہا اور دور بھاگتا رہا شادی کے نام سے۔''

فخر نے ایک لمحے کو بھی نگاہیں اوپر نہیں اٹھائی تھیں یونہی سر جھکائے بولتا رہا۔

''تین سال یونہی گزر گئے۔ اور پھر ایک دن اچانک ان کے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا ڈاکٹرز نے اسے ہارٹ اٹیک کا نام دیا۔ کئی ماہ تک مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ یوں بھی جا سکتی ہیں؟ مجھے چھوڑ کے سب کچھ چھوڑ کے پھر جب یقین آیا تو ایک مستقل پشیمانی اور ندامت نے مجھے گھیر لیا کاش میں ان کی زندگی میں۔ ان کی خواہش، ان کی خوشی پوری کر دیتا۔ جو مجھ سے وابستہ تھی۔ گھر والوں نے بعد میں بہت زور دیا مگر میں نے زندگی کے اس رخ کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔

دوست احباب سوال کرتے ہیں: شادی نہ کرنے کا سبب پوچھتے ہیں۔ میں مذاق میں ٹال دیتا ہوں۔ یہ سچ میں نے آج تک کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ مجھے کن پچھتاوؤں نے گھیر رکھا ہے۔'' وہ خاموش ہوا۔

''پھر اب یہ خیال کیسے آیا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی حمرہ سوال کر بیٹھیں۔

''اب میرے بہن بھائیوں نے مل کر مجھے گھیر لیا ہے۔ فقط ایک ماہ رہ گیا ہے میرے پاس۔ اگر میں نے خود سے کسی کو چوز نہیں کیا تو ان کی پسند اور مرضی کو اپنانا پڑے گا۔'' فخر کے لہجے کی بشاشت دوبارہ واپس لوٹ رہی تھی۔

''اس کا مطلب کہ میں ''ایمرجنسی کال'' تھی۔''

حمرہ نے بغور اس شخص کو دیکھا جو اب اجنبی تو بالکل بھی نہیں لگتا تھا۔

''جب آپ ڈولی سے ملیں گی تو شاید آپ کو مجھ پر ترس آجائے۔'' فخر نے اتنی بے چارگی سے کہا کہ حمرہ کی بے ساختہ مسکراہٹ نے اداسی کی ساری دھند کو غائب کر دیا۔

☆☆☆

''افوہ! یہ لائٹ کیوں نہیں بند کی اب تک۔''

بلو صاحب بھنا کر اٹھ بیٹھے کمبل لپیٹ کر نگاہ دوڑائی، ماموں جان اپنے بیڈ پر بیٹھے خلاؤں میں کچھ گھور رہے تھے۔ وہ اپنے خیالات میں اتنے محو تھے کہ انہیں بھانجے کے اٹھنے اور بڑبڑانے کا بھی علم نہیں ہوا تھا۔

''شاید انکار سے پہلے ہوا تھا یا بعد میں؟'' ایک زوردار جماہی لینے کے بعد بلو نے زوردار آواز میں ہی سوال کیا تھا۔

''کیا؟''

''وہی جو اکثر لوگوں کو ہو جاتا ہے عشق، محبت پیار و یار؟'' اس نے دوسری جماہی لی۔

''ہیں؟ گھاس کھا گیا آدھی رات کو؟'' ماموں نے پہلے گھڑی پھر بلو میاں کا چہرہ دیکھا۔ ''کون سا عشق؟ کیسی محبت؟ کہاں کا پیار؟''

''تو پھر آدھی رات کو لائٹس آن کر کے کون سا مراقبہ کر رہے ہیں؟ ساری نیند خراب کر کے رکھ دی۔ پتا بھی ہے کہ مجھے ایسے نیند نہیں آتی۔'' بلو میاں بھنا ہی اٹھے۔

''یار میں یہ سوچ رہا تھا ہو سکتا ہے ڈولی کچھ بدل گئی ہو؟''

''وہ بدلیں یا نہ بولیں۔ آپ ضرور بدل گئے ہیں؟'' بلو میاں نے معنی خیز نظروں سے ماموں جان کو دیکھا۔

''کیوں، مجھے کیا ہوا ہے؟ کیا میری وجاہت میں کچھ کمی آگئی ہے؟ فخر صاحب نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''وجاہت میں تو نہیں البتہ شرافت میں کچھ کمی آگئی ہے۔'' بلو میاں اپنی نیند کو خدا حافظ کہہ کے میدان میں آگئے۔

''میرے شریف ہونے میں کس بدمعاش کو شک ہے؟'' فخر نے اسے گھور کے دیکھا۔

''سنا ہے سامنے والے پارک کی ایک بنچ آپ نے مستقل اپنے اور پڑوسیوں کے نام الاٹ کرائی ہے۔ اکثر وہیں پائے جاتے ہیں۔''

''تم میری جاسوسی کرتے ہو؟''

''جاسوسی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ چاند چڑھتا ہے تو سب کو نظر آجاتا ہے۔''

''ویسے پہلے تو کبھی کسی خاتون سے اتنی قربت نہیں رہی آپ کی؟'' بھانجے صاحب کا انداز ٹٹولنے والا تھا۔

''بھلے لوگ ہیں یار، آج کل ایسے گھرانے نایاب ہیں۔'' فخر سنجیدہ ہوا۔

''تو پھر انہیں ہی ایگری کر لیں۔ اگر تو اتنے ہی اچھے لگ رہے لوگ۔'' بلو میاں نے مشورہ دیا۔

''کیا ڈولی ویسی ہی ہوگی جیسی تھی؟'' فخر نے تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر یوں سوال کیا جیسے اتنی دیر سے اسی پر گفتگو ہو رہی ہو۔

''میرے ناچیز خیال میں آپ کے لیے ''ڈولی ممانی'' ہی ٹھیک رہیں گی۔ جو آپ کے خیالات میں بہت آرہی ہیں۔ اب لائٹ آف کریں تاکہ مجھے نیند آئے۔''

بلو میاں آنکھیں بند کر کے اور کمبل تان کے پڑ گئے۔ اور فخر میاں بدستور اپنے خیالوں میں گم رہے۔

''کیا پتا وہ بدل گئی ہو؟''

☆☆☆

اپنی ازلی کاہلی سے پیر پسارے کارپٹ پر بیٹھی، صوفے سے ٹیک لگائے۔ پلیٹ میں باجرے کی میٹھی ٹکیاں رکھے جنہیں توڑ توڑ کر کھا رہی تھیں سردیوں کی سوغات کے طور پر یہ انابی کی محنت تھی۔

جسے دوبارا اپنے پڑوسیوں کو بھی دے چکی تھیں۔ باوجود بریرہ کی بڑبڑاہٹ کے۔ اسے بھی تو اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ اتنی محنت اور لاگت کے بعد انابی فراخ دلی سے دوسروں کے بھی حصے لگا دیتی تھیں۔

حمرہ نے مزے سے منہ چلاتے ہوئے تکیہ اٹھائی ہی تھی کہ بریرہ کی زوردار چیخ سے وہ تکیہ ہاتھ سے نیچے گر گئی۔

"یا اللہ خیر!" حمرہ نے متوحش ہو کر بریرہ کی طرف دیکھا جو آنکھیں پھاڑے اپنے موبائل کی اسکرین گھور رہی تھی۔

"تو یہ ہے بلی تم سے، خود ہی ڈراؤنی چیزیں لگاتی ہو پھر چیخیں مار مار کے ہمیں ڈراتی ہو۔" اسی دوران انابی بھی اندر آ گئیں۔

"کیا ہو گیا؟"

"مونا آنٹی نے ثمن آپی کا رشتہ طے کر دیا۔ وہیں، وہ جو تصویر ہمیں دکھائی تھی۔ یہ دیکھو اسٹیٹس یہ لگائی ہے تانیہ نے۔" بریرہ اٹھ کر حمرہ کے پاس آ کر انہیں دکھانے لگی۔

"چلو اللہ کا شکر ہے، ایک بچی ٹھکانے سے لگی۔ اس میں چیخ مارنے کی کیا بات ہے۔" انابی نے بولتے بولتے پوتی صاحبہ کو گھورا۔

"مگر ثمن آپی کے فیانسی کو تو دیکھیں آپ بلکہ آپ بھی تو ہمارے ساتھ تصویر دیکھ کر آئی تھیں اس دن، جب مونا آنٹی کے گئے تھے۔ یہ تو کسی بھی طرح ثمن آپی کے لائق نہیں۔ عمر بھی اچھی خاصی ہے اور رنگ دیکھیں۔ جسامت دیکھیں جیسے کوئی گینڈا اور......"

"اچھا بس، سب اللہ کے بنائے ہوئے انسان ہیں۔ کسی میں نقص نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا بھلا لڑکا ہے۔ انسان کا بچہ ہے۔ معقول نوکری ہے۔ اب وہ بے چاری مونا بھی کیا کرے۔ کئی برسوں سے اب یہی ہو رہا ہے کہ لوگ آتے ہیں کھا پی کے چل دیتے ہیں۔ کوئی کہہ دیتا ہے۔ موٹی ہے کسی کو عمر زیادہ لگتی ہے۔ بس ایسے ہی ہیں دنیا والے، اپنے لنگوروں کے لیے بھی حور پریاں چاہئیں۔"

انابی کو سنجیدگی سے سنتی ہو حمرہ اور بریرہ کی ہنسی نکل گئی۔

"ہنسنے کی بات نہیں ہے۔" انہوں نے کڑی نظر سے دونوں کو گھورا۔

"اور تم بھی کچھ عقل سے کام لو۔ آج وقت اور قسمت تم پر مہربان ہیں مگر ضروری نہیں کہ ہمیشہ مہربان رہیں۔" انابی نے حمرہ کو مخاطب کیا تھا۔ جنہوں نے ان کی بات سنتے سنتے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ ہنسی غائب ہو گئی تھی۔

انابی تو واپس کمرے میں چلی گئیں۔ حمرہ منہ بنائے لاؤنج میں ہی بیٹھی رہیں۔ بریرہ نے بھی فون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

"آپ کو کیا ہوا؟ پتا تو ہے انابی کی عادت کا، بولنے اور ڈانٹنے کے معاملے میں وہ کچھ سوچنے کا تکلف نہیں کرتیں۔" بریرہ ان کی دلجوئی کرنے لگی۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے انابی کی باتیں بری لگتی ہیں نہ ڈانٹ، بس کچھ عجیب سی الجھن ہے جیسے کوئی زمین و آسمان کے درمیان معلق ہو۔" حمرہ کی گہری آنکھوں میں اداسی ٹھہری ہوئی تھی۔

"آپ پریشان کیوں ہیں اب؟" بریرہ نے انہیں غور سے دیکھا۔

"میں ایک بات سوچ رہی تھی کیا ایسا ہو سکتا ہے یا ہوتا ہے کہ ہم کسی معاملے میں اپنا فیصلہ کر چکے ہوں اور پھر ایک روز ہمیں علم ہو کہ ہم غلط تھے تو؟"

"اگر زیادہ دیر نہ ہوئی ہو اور وقت اور حالات گرفت میں ہوں تو غلط فیصلوں کو درست کیا جا سکتا ہے۔" بریرہ نے جواب دیا۔

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے والی سوچ ہی درست ہو، پھر؟"

"پھر یہ کہ آپ خود کو بری طرح کنفیوز کر چکی ہیں اب مجھے نہ الجھائیں، کچھ معاملات انسان قسمت پر بھی تو چھوڑ دیتا ہے۔ سب کچھ ہمارے ہاتھ میں تو نہیں ہوتا نا؟" بریرہ جھنجلا گئی۔

"ہاں، سب کچھ تو ہمارے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ تو پھر ہمارے بس میں آخر ہوتا ہی کیا ہے؟" حمرہ نے بے بسی سے ہاتھ آگے پھیلاتے ہوئے ہتھیلی کو غور سے دیکھا۔

"ان میں کچھ نہیں ہوتا یا پھر ان ہی میں سب کچھ ہوتا ہے؟"

☆☆☆

سنہری چمکتی ہوئی دھوپ نے چھٹی کے دن کا لطف اور بھی دوبالا کر دیا تھا سارے پیڑ، پودے، گھاس پھول، پتے، سب ہی سنہری دھوپ میں نہائے ہوئے تھے۔ اور اس دھوپ میں ٹہلتی ہوئی وہ لڑکی کب کی تھک ہار کی بیٹھی کچھ کہہ رہی تھی۔

"میری امی بہت پیاری اور گھریلو تھیں۔ جنہیں شوہر اور سسرال والوں کی خدمت اور اطاعت کرنے، ان کے دل جیتنے کی نصیحت کی گئی تھی اور کہانی بہت لمبی ہے مگر بس یہ کہ سسرال والوں کے دل میں گھر کرتے کرتے امی اپنا گھر کھو بیٹھیں۔ ابو کو بیوی چاہیے تھی خادمہ نہیں اور سسرال میں خادمہ نے بغیر نمبر نہیں ملتے۔ امی کی بے وقوفی تھی یا سادگی یا شاید قسمت کہ وہ سسرال میں سب کی پیاری بن گئیں سوائے اپنے شوہر کے۔ ابو نے دوسری شادی کے بعد بھی اگرچہ ہمارا خیال رکھنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی مگر میں جانتی ہوں کہ امی کو اس بات کا کتنا دکھ تھا۔ انہوں نے کبھی ابو کی برائی نہیں کی۔ خود کو ہی قصوروار ٹھہرایا مگر میری آج تک بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ امی کا قصور کیا تھا۔ انہیں یہ دکھ کیوں ملا؟

کہتے ہیں کہ بزرگوں کی خدمت کرنے سے دعائیں ملتی ہیں۔ پھر ان کو جو دعائیں ملیں۔ وہ ان کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھرنے میں کیوں ناکام رہیں؟

ہمارے معاشرے میں سسرالی رشتے اور رویے اتنے تکلیف دہ کیوں ہیں؟ صبر و تحمل برداشت، خدمت گزاری ایثار قربانی، جاں نثاری، وفاداری، سارے جذبے عورت سے منسوب ہیں، چاہے وہ بیوی ہو یا بہو ہو؟" حمرہ آج پہلی بار اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھیں۔ سوالوں کے جواب ملیں یا نہ ملیں۔ مگر انہیں کرنے سے اندر کی بھڑاس تو نکل جاتی ہے۔

"اپنے ہوش اور شعور کی عمر میں۔ اپنی امی کو میں نے کبھی دل سے ہنستے نہیں دیکھا۔ بس ایک چپ تھی اور اداسی جو دھیرے دھیرے میرے اندر بھی اترتی چلی گئی۔ کبھی میں سوچتی ہوں کہ کیا تھا ابو تھوڑا انتظار کر لیتے۔ بہرحال دس سال بعد امی سارے جھمیلوں خدمت گزاری سے آزاد ہو گئی تھیں۔ اور یہ بھی کتنی تلخ اور خوفناک حقیقت ہے کہ بعض بہوؤں کو اپنی آزادی اور خوشیوں کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے اپنے بڑوں کے گزر جانے کا۔"

حمرہ نے اپنی مضطرب نگاہیں چپ چاپ بیٹھے فخر پہ مرکوز کیں، پھر کہنے لگیں۔

"میرے خیالات اور سوالات شاید بہت سفاک ہیں مگر یہ ہیں۔ اور مجھے ایک اور بات کا بھی ادراک ہوا۔ مجھے بھی شاید پچھتاوا اور ندامت ہے۔ امی کی زندگی میں، انہیں وہ خوشی نہیں دے سکی جو وہ مجھ سے چاہتی تھیں۔

انا بی کہتی ہیں کہ ماضی کے واقعات اور افراد کا دامن پکڑے رہو تو انسان کو مستقبل دھندلا نظر آتا ہے وہ ڈھنگ سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اپنے لیے۔"

"اور فیصلہ کرنے کا وقت گزر جائے تو انسان خود ایک ماضی بن جاتا ہے جس کے پاس نہ حال ہوتا ہے نہ مستقبل۔"

فخر نے سنتے سنتے پہلی بار لب کشائی کی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" حمرہ نے بچوں کی طرح اپنے خوف کا اظہار کیا۔

"سچ کہوں تو ڈرتا میں بھی تھا۔ غلط فیصلہ کرنے کا خوف، غلط فرد کے انتخاب کا خوف، امی کے معاملے میں ندامت کے ساتھ ساتھ یہ ڈر بھی تھا جواب تک اکیلے رہنے کو ترجیح دی مگر مجھے اب لگتا ہے کہ میں غلط تھا۔ اپنے پیاروں کو جو خوشی ہم ان کی زندگی میں نہ دے سکے ہوں۔ ان کے بعد بھی تو دے سکتے ہیں ایک مستقل اور مسلسل ندامت کے

ساتھ زندگی کیسے گزاری جاسکتی ہے؟"

"اور غلط فرد کے انتخاب کا ڈر؟" محویت سے سنتی ہوئی حمرہ نے سوال کیا۔

"شادی کے معاملے میں غلط اور صحیح فرد کا فیصلہ دنیا کا کوئی انسان نہیں کرسکتا۔ کچھ بدنیت اور لالچی افراد کو چھوڑ کر، باقی تمام لوگ ایک دوسرے پر اعتبار اور خلوص کے جذبے کے ساتھ یہ فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے زندگی گزرتی ہے وقت اور بنتے بگڑتے حالات انسانوں کی خوبیوں، خامیوں کو سامنے لاتے ہیں۔ اور ان ہی کے بل بوتے پر ہم کسی کو اچھا اور کسی کو برا قرار دے دیتے ہیں۔"

"اعتبار اور خلوص کے ساتھ آپ نے محبت کا نام نہیں لیا؟ دو افراد کے ایک ہونے کی یہ تو اہم وجہ ہے۔"

"اس معاملے میں میرا پرسنل ایکسپیرئنس تو کچھ نہیں بس آبزرویشن ہیں اور مجھے یہ لگتا ہے کہ محبت، دو افراد کے ایک ہونے کی اہم وجہ ہوسکتی ہے مگر ہمیشہ ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کی غلطیوں، خامیوں کو درگزر کرنے کے لیے محبت سے زیادہ اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ویسے محبت کا فلسفہ بہت بڑا اور بہت کامپلیکیٹڈ ہے۔ سارے چند فقروں میں تو کیا شاید چند کتابوں میں بھی ایکسپلین نہیں کیا جاسکتا۔" فخر مسکرایا۔

"یہ ایک مشکل معاملہ ہوتا ہے جسے ہم محبت کہتے ہیں۔" حمرہ خودکلامی کے انداز میں بڑبڑائیں۔

"بہت سے بھی زیادہ مشکل ویسے محبت کے نام پر یاد آیا I Love Tea۔"

"مگر انسان چائے سے شادی نہیں کرسکتا۔" حمرہ نے بے ساختہ تبصرہ کیا۔

"مگر انسان چائے کی وجہ سے تو شادی کرسکتا ہے؟" فخر کا انداز سوالیہ تھا۔

☆☆☆

"انگیج منٹ کی جگہ اب نکاح ہو رہا ہے۔" تقریب سے ایک دن پہلے انابی نے اطلاع دی، مونا آنٹی کا فون ان ہی کے پاس آیا تھا۔ انہوں نے بصد اصرار رکنے کے لیے بلایا تھا۔

"ارے بھئی یہی تو موقع ہوتے ہیں رشتے داروں سے میل ملاپ کے، خوشی کے موقع پر تو سب کا ایک ساتھ بیٹھنا ہنسنا بولنا اچھا لگتا ہے۔"

انابی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے گئیں۔ مونا آنٹی اور ان کے بچے نہال ہو گئے۔ بلبل تو ثانیہ اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ ڈھولک پر گیت گانے بیٹھ گئی حمرہ، ثمن سے باتیں کرنے لگیں جو انہیں ذرا خاموش خاموش لگی۔

"کیا بات ہے اتنی چپ چپ کیوں ہو؟" حمرہ نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا کروں؟ کیا بولوں؟ اتنے لوگوں کی "ناں" کے بعد ایک "ہاں" ہوئی ہے۔ خوش ہی ہونا چاہیے۔" ثمن کی مسکراہٹ پھیکی پھیکی تھی۔

"تم خوش نہیں ہو؟" حمرہ کو اس کی ایسی رونے جیسی مسکراہٹ پر دکھ ہوا۔

"ہوجاؤں گی، دراصل میری توقعات اور خواب ذرا اونچے تھے، مگر...... کچھ وقت تو لگے گا نا سمجھوتہ کرنے میں، خیر تم سناؤ، انابی بتا رہی تھیں تمہارا پرپوزل آیا ہوا ہے؟" ثمن نے ذرا ٹھیک سے مسکراتے ہوئے موضوع بدلا۔ مگر حمرہ خاموش رہیں۔

"اچھا لگے تو انکار مت کرنا۔ زندگی کے حقائق بڑے تلخ ہوتے ہیں ہمارے بہت سے خواب، خیال اس تلخی کی نظر ہوجاتے ہیں۔"

ثمن نے مزید کہتے ہوئے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ حمرہ نے ایک نظر ثمن کے چہرے پر پھیلی یاسیت کو دیکھا۔ ثمن تین سال ہی تو بڑی تھیں ان سے۔ بڑھے ہوئے وزن اور عام سے نقوش نے ان کی عمر کچھ اور بھی بڑھا دی تھی۔ حمرہ کو ان کے چہرے کی یاسیت اپنے چہرے پر نظر آگئی۔ ایک عجیب سے احساس نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔

☆☆☆

تھوڑی سی بارش کے بعد سردی مزید بڑھ گئی تھی۔ انابی نے ابھی ابھی گرم گرم یخنی کا پیالہ ختم کیا تھا مگر ٹھنڈ بھی کہ ان کی ہڈیوں میں گھس جا رہی تھی۔

"ہائے بڑھاپے کی ہڈیاں۔" اپنی کشمیری گرم شال مزید اپنے گرد لپیٹ کر وہ تو اپنے لحاف میں گھس گئیں۔

"کتنا پیارا موسم ہو رہا ہے۔ اللہ میاں جی، اور تیز بارش ہو جائے۔" بریرہ بالکنی میں کھڑی بوندا باندی دیکھتے ہوئے اس کے تیز ہونے کی دعا کر رہی تھی۔

"اری باؤلی ہوئی ہے کیا لڑکی؟ ویسے ہی کپکپی نہیں چھوڑ رہی تو اور ٹھنڈ کو دعوت دے رہی ہے۔ آ بیل مجھے مار۔" انا بی نے اسے ڈانٹا۔

"سنا ہے پڑوسیوں کے گھر مہمان آ رہے ہیں اگلے ہفتے۔"

"کرن کہانی دیکھتی ہوئی حمرہ نے موبائل اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر جملہ حاضرین کو آگاہ کیا۔

"ہاں، بچے بتا رہے تھے۔" انا بی نے ایک آہ بھری، کیا تھا جو یہ لڑکی راضی ہو جاتی، کتنا اچھا لڑکا ہے۔ شریف اور با ادب، آج کل کہاں ملتے ہیں ایسے لڑکے؟ جو ذرا کچھ ہوتے ہیں ان کے دماغ آسمان پر ہوتے ہیں۔" انا بی نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے بے بسی سے حمرہ پر نظر ڈالی۔

"مہمان آ جائیں تو چائے یہ پلا لیجیے گا انہیں۔"

حمرہ کی نگاہیں بدستور اسکرین پر تھیں۔

"ہاں کیوں نہیں، پڑوسیوں کا بھی حق ہوتا ہے کچھ۔" انا بی نے اپنی دھن میں بولتے بولتے بھانجی کو حیرت سے دیکھا۔

"کیا طلب؟"

"پھپھو کا مطلب ہے اسپیشل چائے اور اسپیشل مہمان۔" بریرہ نے اندر آتے ہوئے لقمہ دیا۔

"ہیں...... واقعی؟" انا بی کی اب سمجھ میں آیا تو وہ سیدھی ہو بیٹھیں۔ مارے خوشی کے ان کا چہرہ چمکنے لگا۔ سردی وردی سب غائب ہو گئی۔

"پھر، میں کہہ دوں فخر سے؟"

"جی!" حمرہ نے لاپروا اور انجان بننے کی کوشش کی مگر بنا نہیں گیا۔ بلی بدتمیز کی معنی خیز نگاہیں اور بے لگام ہنسی پر اپنی مسکراہٹ کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔

"تمہیں کیوں اتنی ہنسی آ رہی ہے؟" زبردستی سنجیدہ بن کر انہوں نے بلی کو ڈپٹا۔

"بے چارے فخر حیات کا انجام سوچ سوچ کر ہنسی آ رہی ہے۔ لنچ اور ڈنر کا تو ہوم ڈلیوری یا باہر سے گزارہ ہو جائے گا۔ کیا ناشتے کی بھی "ڈیل" منگوائیں گی؟ یا ان ہی سے بنوائیں گی؟"

"بکومت۔" حمرہ کا پھینکا ہوا کشن بالکل ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

"ارے جب سر پر پڑتی ہے تو سارے کام کر لیتی ہیں لڑکیاں۔" انا بی نے بات ہی ختم کر دی۔

"آپ آج واک پر کیوں نہیں آئیں؟" حمرہ کے پاس فون آ گیا۔

"سردی بہت ہے آج۔"

"تو کیا ہوا، جیسے میری قلفی جم رہی ہے آپ کی بھی آئس کریم جم جاتی۔"

"مجھے جمنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"اچھا، مگر اپنے انکار پر تو بہت دنوں تک جمی رہیں؟ ویسے یکایک برف پگھلی کیسے؟"

"ڈولی کو دیکھے بغیر ہی کسی پر ترس آ گیا۔"

"ترس؟ آپ کو معلوم ہے کہ ترس اور ہمدردی کے دھارے آگے جا کر محبت کے دریا میں گرتے ہیں؟"

"مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ ریڈی میڈ فلسفہ ابھی ابھی کی ایجاد ہے۔"

"ارے واہ آپ تو سچ مچ مجھے سمجھنے لگی ہیں۔ ایک بات کہوں؟"

"جی نہیں۔"

"پھر...... آپ ہی کچھ پوچھ لیں۔"

"نہ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہے نہ آپ کو کچھ کہنے کی۔"

"اچھا مگر...... ارے یہ اتنی جلدی چار جنگ کیسے ختم ہو گئی۔ یہ بلو بدتمیز اب اٹھائے ذرا میرا فون۔"

ماموں جان پارک میں بیٹھے بیٹھے بھانجے پر غصہ ہو رہے تھے اور اپنے سیل فون کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔

❋

ریحانہ چوہدری

''دیکھو نصیر! چپ کروالو اس منحوس ڈائن کو۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

یشماں اپنے بیٹے نصیر سے مخاطب ہوئی تو ناگواری اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ کیونکہ اس کی بہو صبح سے سر پر دوپٹا باندھے روئے جارہی تھی اور ساتھ ساتھ بین بھی کرنے لگ جاتی۔

''ابا! قسم سے ہماری دادی تو پکی پکی جنتی ہے۔ دیکھو، اپنے منہ سے اپنی ''خوبیاں'' بتارہی ہے ورنہ آج کل کون اپنے منہ سے ایسی سچی بات کرتا ہے۔''

عبداللہ نے دادی کو داد دینے والے انداز میں کہا مگر بے چارہ یہ بھول گیا کہ ایسی بات دادی کے قریب بیٹھ کر نہیں کرنی تھی۔ اب اگر دادی نے ایک تگڑا سا دوہتڑ اس کی کمر پر رسید کردیا کہ اتنا انعام تو بنتا تھا اتنی قیمتی رائے دینے پر۔

''ہائے ہائے اماں! ایک بے چارہ تو پہلے ہی پردیس میں، مشکل گھڑی میں پھنسا ہوا ہے۔ اب اس غریب کو بھی مارو...... مار دو...... مار دو ہم سب کو۔ تاکہ تمہارے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے اور تم اکیلی راج کرو پھر اس خالی گھر پر۔'' زرینہ بیٹے کو لگنے والے دوہتڑ سے رونا بھول کے بولی۔

''اری بدبخت! میں بڑھیا بھلا کیا کسی کو ماروں گی۔ پیچھے تو تو پڑی ہے ہماری جان کے۔ منحوس ماری۔ ہر وقت کا سیاپا، ہر وقت کا رونا ڈالا ہوتا ہے۔ نہ وقت دیکھتی ہے، نہ ویلا۔ منحوس اپنا باجا بجاتی رہتی ہے۔''

''تجھے تو نہ کسی کی فکر، نہ پریشانی۔ تجھے تو میرا رونا چبھے گا ہی۔ کیسی دادی ہے تو۔ ارے لوگوں! دیکھو میرے رونے پر بھی پابندی لگ رہی ہے۔ ارے میرے کلیجے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ بانجھ جل رہے ہیں۔ روؤں

ناں تو کیا کروں۔ ابھی میرا دل پتھر نہیں ہوا تیری طرح۔ ہائے اللہ! میرا بچہ...... پتا نہیں کس حال میں ہوگا۔'' زرینہ روتے ہوئے یشماں کو کھری کھری سنا گئی۔

''ناں تجھے کس نے کہا تھا۔ تو میرے معصوم پوتے کو باہر بھیج۔ تجھے ہی شوق ہو رہا تھا نہ باہر کی کمائیاں کھانے کا۔ اب صبر کر منحوس۔''

''ہاں ہاں اماں! تجھے تو میرا سکھ گوارا ہی نہیں ہوتا۔ میری ساری خوشیاں تو تو کسی گٹھڑی میں باندھ کے اسی وقت دریائے چناب میں بہا آئی تھی۔ جب میری ڈولی لے کے اس گھر میں آئی تھی۔ یا اللہ! ایسے ہی لوگ ہیں جن کی وجہ سے ایسے ''کرونا'' جیسے عذاب دنیا میں آتے ہیں۔''

''اب چپ وی کرجا ماں! ہماری دادی کو ایسے نہ بول۔'' عبداللہ پھر بول اٹھا۔

''کم بخت مردود! تیرا تو علاج کرتی ہے تیری دادی۔ جو صبح شام تجھے جوتیاں مارتی ہے، تو ہے ہی اسی قابل۔''

''اللہ کا واسطہ ہے تم دونوں کو۔ یہ پانی پت کی جنگ بند کرو۔ مشکل گھڑی ہے، اپنے اللہ سے معافی مانگو۔ اوئے کوئی نماز پڑھو۔ کوئی قرآن پاک پڑھو۔ یہ نہیں کرنا، بس ہر وقت کی لڑائی...... ہر وقت کا سیاپا۔ اوئے میں کہتا ہوں پورے محلے کے کسی اور گھر سے بھی کبھی لڑنے کی آواز آئی ہے۔''

نصیر دونوں کی جھک جھک سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے اکتا کر دونوں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''خود تو جیسے صبح سے مصلیٰ ڈال کے بیٹھا ہوا تھا ناں۔ بس ماں کی شان میں کوئی لفظ منہ سے نکل جائے، فوراً آگ لگ جاتی ہے دل میں۔ میرے ہی

پیچھے ہاتھ دھو کے سب پڑ جاتے ہیں۔ بھی ماں کو بھی روکا ہے، جس نے پہلے دن ہی میدان جنگ تیار کر رکھا ہے۔ پہلے میرے ابا کی منتیں ترلے کر کر کے میرا رشتہ لیا، پھر بیر باندھ لیا۔"

زرینہ جو پہلے ہی غم و غصے سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے نصیر کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"اری کم بخت! کس نے منتیں کی تھیں تمہارے باپ کی۔ پورے سات گاؤں کے لوگ میرے ہیرے جیسے بیٹے کو رشتہ دینے کے لیے تیار تھے۔ وہ تو تمہاری ماں میرے قدموں میں دوپٹا ڈال کے بیٹھ گئی کہ بھابھی کوٹھے سے چھال مار دوں گی، اگر میری بیٹی کا رشتہ نہ لیا۔ میں مسکین اس چلتر کی باتوں میں

آ گئی اور یہ بارہ من کی دھوبن اپنے شہزادے پتر کے لیے بیاہ لائی۔ میرا تو نصیبا ہی پھوٹ گیا۔''

بہشتاں نے کسی کا ادھار رکھنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ دونوں طرف سے گولہ باری جانے کب تک جاری رہتی مگر بھلا ہو نادیہ کا جس کی بروقت آمد نے ماحول کو تبدیل کر دیا۔

☆☆☆

نصیر اور ثمینہ...... بہشتاں جس کا نام تو بہشت بی بی تھا مگر پورے گاؤں میں بہشتاں کے نام سے مشہور تھی، اس کے بچے تھے۔ نصیر اور ثمینہ کی وٹے سٹے کی شادی تھی۔ دونوں کی شادی بہشتاں کی نند جو کہ اس کی بھابھی بھی تھی کے گھر ہوئی تھی۔ ساتھ والے گاؤں میں۔

زرینہ ایک خوب صورت، بھرے بھرے جسم کی لڑکی تھی جو پنجاب کی جٹی کی تصویر نظر آتی تھی۔ گھر میں خالص دودھ اور مکھن کی فراوانی تھی۔ اس کی رنگت بھی دودھ اور ملائی جیسی تھی۔ بہشتاں زرینہ کو شروع سے ہی بہو کے روپ میں ہی دیکھتی آئی تھی۔ ادھر ثمینہ جب اپنی پھوپھی کے بیٹے کے دل کی ملکہ بنی تو چونکہ ان کے خاندان میں وٹے سٹے کی شادیوں کا رواج تھا سو باہمی رضامندی سے دونوں گھروں کے بچوں کی شادیاں ہوئی تھیں۔ ثمینہ پھوپھی کے بیٹے شاہنواز کی دلہن بن کے گئی تو زرینہ نصیر کی بیوی بن کر بہشتاں کے آنگن کی رونق بڑھانے لگی۔

موٹی موٹی آنکھوں، لمبے سیاہ بالوں والی، گوری چٹی زرینہ اپنی آنکھوں میں سپنے سجائے بہشتاں کے گھر آئی تو کچھ عرصہ تو بہشتاں نے اس کے نخرے برداشت کیے۔ پھر جب کاموں میں ہاتھ ڈلوایا تو پھر جب بھی زرینہ کو کوئی کام کرنا پڑتا، اس کی زبان ہاتھوں سے کئی گنا زیادہ چلتی۔

پھوپھی، بھتیجی ایک ذات، آگے بھی اس کی پھوپھی تھی جسے اب نصیر کی وجہ سے اماں کہنے لگی تھی۔ وہ میدان جنگ گرم ہوتا کہ آس پاس کے گھروں کی عورتیں اپنی چھتوں پر چڑھ کر اس مفت کے ڈرامے سے محظوظ ہوتیں۔

اللہ نے ثمینہ کو تین بیٹے ہی دیے تھے۔ بیٹی کوئی نہیں تھی جب کہ نصیر کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی جو ثمینہ نے اپنی بہو بنالی تھی۔ ثمینہ کے تینوں بیٹے باہر جا کر یورو کما رہے تھے اور ہر مہینے لاکھوں روپیہ اپنے گھر بھجواتے، جن کی دیکھا دیکھی زرینہ نے بھی ضد کر کے اپنے بڑے بیٹے بشیر کو بھی...... جو ابھی بمشکل بیس سال کا ہوا تھا۔ ایک ایکڑ زمین بیچ کر ان کے پاس باہر بھجوا دیا۔ اسے پہنچے ابھی دو ہی مہینے ہوئے تھے کہ چین سے اٹھنے والی وبا ''کرونا وائرس'' نے پورے یورپ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اب صورت حال یہ بنی کہ زمین بیچ کے ایجنٹ کو رقم دی تھی۔ اب صرف دو ایکڑ زمین باقی بچی تھی عبداللہ کے پاس۔ ایک بھینس شاہنواز دے گیا تھا کہ بہن اور پھوپھی کو دودھ کا مسئلہ نہ بنے۔ اب بھینس کا ایک وقت کا دودھ بیچ دیتے اور ایک وقت کا گھر کی ضروریات کے لیے رکھ دیتے۔ بھینس کا گوبر تھاپ کے بطور ایندھن استعمال کرتے۔ بہشتاں نے دس بارہ دیسی مرغیاں پالی ہوئی تھیں، جن کے انڈے بیچ کے سبزی وغیرہ لے لیتے۔ یوں ہی نہ کسی طرح بیچ تان کے گزارہ ہو ہی جاتا۔ مگر زرینہ جو سدا کی جذباتی تھی، وہ حوصلہ کہاں سے لاتی۔ ہر وقت روتی رہتی، کبھی با آواز بلند تو کبھی خاموش سسکیوں کے ساتھ۔

☆☆☆

اب نادیہ کو عبداللہ نے خاموشی کے ساتھ میسج کر دیا تھا۔ نادیہ ساتھ والے گاؤں میں ہی تو بیاہی ہوئی تھی۔ ساس کو جو کہ پھوپھی بھی تھی بتا کر بنو بنی (پگڈنڈیوں) ہوتی ہوئی فصلوں کے بیچوں بیچ سے گزرتے ہوئے بیس منٹ میں میکے پہنچ گئی۔

جب نادیہ بیرونی لکڑی کے دروازے سے داخل ہوئی تو دیکھا کہ صحن کے ایک طرف بھینس ٹاہلی کے نیچے کھونٹے سے بندھی سر نیچے گرائے لیٹی ہوئی ہے اور نصیر کا پالتو کتا، بھینس کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ نادیہ کی آہٹ پر ایک دم آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو چھلانگ لگا کے نادیہ کی طرف دوڑا اور اس

کے قدموں میں لوٹنے لگا جسے دیکھ کر نادیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

پھر اس کی نظر دادی کی مرغیوں پر پڑی جو گوبر پھرول رہی تھیں کہ شاید کھانے کو کچھ مل جائے۔ مرغیوں سے ہٹ کے نظر آم کے پیڑ پر گئی، مگر نہ اسے کوئل نظر آئی نہ اس کی سکھی سہیلیاں۔ تمام پرندے اُڑ کے کہیں جا چکے تھے جبکہ اس کا باپ نصیر آم کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ خالہ سکینہ کی بہو اپنی چھت سے جھانکتی ضرور نظر آئی جو اسے دیکھتے ہی کھسیا کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ یقیناً اماں اور زرینہ کی لڑائی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"ابا جی۔ السلام علیکم!" نادیہ باپ کی طرف بڑھی۔

"بسم اللہ۔ میری دھی آئی ہے۔ وعلیکم السلام۔ جیتی رہو، خوش رہو میری دھی رانی! پھوپھی کا سناؤ، کیسی ہے میری بہن اور شاہنواز؟"

"ابا جی! سب ٹھیک ہیں۔ بس کچھ پریشان ہیں۔" ایک نادیدہ خوف تو نادیہ کے چہرے پر بھی تھا۔

"چلو پتر! اندر چلتے ہیں۔" نصیر اس کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھا۔

نادیہ سیدھی دادی کے پاس گئی، سلام کر کے سر آگے جھکایا اور پیار لیا۔

"ہونہہ! دادی سلاماں علیکم۔ نادی بدبخت! یہ تو بتا کہ تو میری بیٹی ہے یا اس کی، جس کے قدموں میں جا کے بیٹھ گئی ہے۔ نامراد! اتنا احساس نہیں کہ ماں کس تکلیف میں تڑپ رہی ہے۔ ماں کا حال ہی پوچھ لیتی۔ اس عورت نے تو جادو کر رکھا ہے سب پر۔ ساری عمر خاوند کو میرا نہیں ہونے دیا، اب میرے بچے بھی میرے نہیں رہے۔ سب اسی کا دم بھرتے ہیں۔ ہائے میرا نصیب۔"

زرینہ ایک مرتبہ پھر سے زور زور رونے اور کوسنے دینے لگی۔ واویلا کرنے لگی۔

"اماں! میری پیاری اماں۔ ہم سب تیرے ہی ہیں۔ چل اٹھ۔ باجی کو کچھ کھانے پینے کو دے۔ بے چاری دوسرے گاؤں سے آئی ہے، تجھ سے ملنے کو۔

چھوڑ، دفع کر ساری باتوں کو۔" عبداللہ نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھ سے نہیں ہوتے یہ چونچلے۔ جس کی سگی ہے وہ خود ہی کھلائے گی تم دیکھنا۔ یہ دکھاوے کی محبتیں جتانی بڑی آتی ہیں تیری دادی کو۔" زرینہ نے ساس کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نیک بخت! تو بھی کچھ اماں سے ہی سیکھ لیتی۔ کبھی بچوں سے اچھی بات کر لیا کر، دکھاوے کے لیے ہی سہی۔"

نصیر سے رہا نہ گیا تو وہ آخر بول ہی پڑا۔

"ابا جی! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ میرا اپنا گھر ہے۔ میں مہمان تو نہیں جو سب کو میری فکر پڑ گئی ہے۔"

"اماں! تو تو میری شہزادی ماں ہے۔ تیرے جیسا کون ہے بھلا؟ تو ہمیں ساری دنیا سے پیاری ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ دادی کو بھی ساری دنیا سے پیاری تو ہی لگی تھی۔ تب ہی تو اپنے اکلوتے پتر کے لیے تجھے ہی چنا تھا اس نے۔" نادیہ اماں سے لپٹتے ہوئے بولی۔

"ہونہہ! پیاری لگی تھی۔" زرینہ کے ہنکارے میں اب وہ تندی نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے تھی۔

"عبداللہ! چل میرے بھائی! جلدی سے اماں کو نلکے پر لے جا۔ اماں کا منہ دھلوا، یہ سر سے بندھا دوپٹا اتار اماں!"

نادیہ نے آگے بڑھ کر خود ہی دوپٹا اماں کے سر سے کھولا۔

"دادا! آ، ہم باورچی خانے میں چلتے ہیں۔"

نادیہ نے اماں کو عبداللہ کے ساتھ بھیجا اور خود دادی کے ساتھ رسوئی کی طرف بڑھ گئی مگر جاتے جاتے مڑ کر ابا سے مخاطب ہوئی۔

"ابا جی! ذرا بھینس کے آگے بھی کچھ ڈال دیں۔ بے چاری بھوکی بیٹھی ہے، کچھ کھائے گی نہیں تو رات کو دودھ کہاں سے دے گی۔"

☆☆☆

"دیکھ نادو پتر! گھر کی کیا حالت ہوگئی ہے؟ نہ پکاتی ہے نہ کھاتی ہے۔ بس ہر وقت رونا ہی ڈالے

رکھتی ہے۔ میری بڈھی ہڈیوں میں پتر اب اتنی ہمت نہیں کہ سارا گھر سنبھال سکوں۔"

دادی پوتی کے ساتھ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگی۔

"دادی! چھوڑ ان باتوں کو، لے یہ تو چاول کھا۔" کہیں سے ایک صاف پلیٹ برآمد کر کے نادیہ نے دادی کو چاول اس میں ڈال کے دیتے ہوئے کہا۔

"نادیہ پتر! یہ چاول کیوں لے کے آئی۔ تیری ساس کیا سوچتی ہوگی؟"

"دادی! میری بھولی دادی! تو یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ میری ساس تیری بیٹی بھی ہے۔ یہ چاول میری ساس نے نہیں تیری بیٹی نے بھیجے ہیں۔ وہ بھی زبردستی کہ میری اماں کو میرے ہاتھ کے پکے ہوئے چاول بہت پسند ہیں، لے جاؤ۔"

"ہائے میں صدقے جاؤں۔ میری کرماں والی دھی۔ کتنا خیال ہے اسے میرا۔ اللہ سوہنا اسے ہمیشہ خوش رکھے۔ اس کے گھر کو سلامت رکھے۔ اس بے چاری کے بچے بھی پردیس میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کرونا سے محفوظ رکھے، اپنی رحمت کے طفیل۔" بیشاں جھولی پھیلا کر اپنی بیٹی اور نواسوں کو دعائیں دینے لگی۔

"آمین!" نادیہ نے صدق دل سے آمین کہا۔ باورچی خانے سے جھاڑو لے کر باہر آئی اور کمرے میں گھس گئی۔ ماں کے اندر آنے سے پہلے چارپائیاں جھاڑ کے بستر کی چادریں بھی جھاڑیں۔ بستر دوبارہ بچھا دیے اور ہر چیز اپنی جگہ پہ رکھ کے جھاڑو دے کر پونچھا بھی لگا دیا اور پنکھا کھول دیا۔

"نادی! پنکھا بند کر دے میری بیٹی! تیرا اباپ اتنا شہنشاہ نہیں ہے کہ ہمیں دن رات پنکھا چلانے کی عیاشی کروا سکے۔ بجلی بڑی مہنگی ہے۔ یہاں کھانے کو مل جائے، یہ بھی غنیمت ہے۔ یہ تگڑے تگڑے بل کہاں سے بھریں گے۔ چل آم کے درخت نیچے چل کے بیٹھتے ہیں۔"

پنکھے کو چلتا دیکھ کر زرینہ نے نادیہ کو ڈانٹنا اپنا فرض سمجھا۔

"چل ٹھیک ہے اماں! آم کے درخت کے نیچے ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ اماں! ایک بات بتاؤں، مجھے پھوپھی کے گھر میں اپنا آم کا درخت بہت یاد آتا ہے۔ اس درخت کے نیچے میرا بچپن گزرا ہے۔"

نادیہ ہاتھ میں کنگھا اور تیل پکڑ کے صحن کے بیرونی دروازے سے تھوڑا ہٹ کے لگے آم کے درخت کی گھنی چھاؤں میں بچھی چارپائی پہ آ کے بیٹھ گئی۔

نادیہ نے ماں کے بال سلجھا کے چٹیا کی اور اسے شیشہ پکڑاتے ہوئے بولی۔

"دیکھ اماں! تو کتنی خوب صورت لگ رہی ہے۔ اماں کاش میں بھی تیرے جیسی سوہنی ہوتی، ہمارے پورے خاندان میں تیرے جیسی کوئی خوب صورت نہیں ہے۔"

"چپ کر، جانے کیا اول فول بکے جا رہی ہے۔" زرینہ نے اسے گھر کا۔ "تجھے میرے دکھ کا کوئی احساس نہیں، کیسی بیٹی ہے تو..... ایک بار بھی بھائی کا نہیں پوچھا۔ میری خوب صورتی کس کام کی۔ تو دعا کر تیرا بھائی خیر، خیریت سے ہو۔" زرینہ نادیہ کا بازو پکڑ کے بولی۔

"اماں! تو نے یہ کیسے سوچا کہ میں دعا نہیں کرتی۔ میری تو کل کائنات ہی پردیس میں ہے۔ میرا تو روم روم دعائیں کرتا ہے اور ہر روز میری ان سے بات ہوتی ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" وہ کنگھا اور تیل کی شیشی رکھ کر واپس آئی۔

"ابا جی! عبداللہ! ہاتھ دھو کے ادھر ہی آ جاؤ۔ دادی آپ بھی آ جائیں۔ یہ لو اماں! کھاؤ۔"

نادیہ نے سب سے پہلے زرینہ کو چاولوں کی پلیٹ پکڑائی۔ سب کو چاول دے کر وہ خود بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانے لگی۔ مگر خود کھانے سے پہلے صحن میں ہی ایک طرف بنے مٹی کے چولہے میں لکڑیوں کی آگ جلا کر چائے کے لیے دودھ اور چینی کے بجائے گڑ اور پتی ڈال کر دم پر رکھ آئی تھی کہ چاول کھانے تک چائے بن جائے۔ پلاؤ کے ساتھ گھر کا اچار بہت مزا دے رہا تھا۔

"نادیہ! اپنے گھر سے پکے پکائے چاول اٹھا کر

لاتے ہوئے تجھے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔“
”ہاں، بالکل بھی نہیں۔ بھئی اماں! میں تمہاری طرح نہیں ہر وقت لڑتی رہوں۔ میری ساس نے کہا، نادیہ یہ چاول ذرا میری نند کو دے آ۔ میں تو اس کے حکم کی غلام ہوں، میری ساس اپنی نند کی بہت فکر کرتی ہے۔“
”شکر کر باجی! اماں کو یہ خیال چاول کھانے کے بعد آیا، ورنہ اس نے تو ہمارے حلق سے نوالہ نہیں اُترنے دینا تھا۔“ عبداللہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے بولا۔
زرینہ کے پژمردہ چہرے پر نادیہ کی بات سن کر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تو نادیہ کو یوں محسوس ہوا گویا جلتے ہوئے سورج کو گہری کالی گھٹا نے ڈھانپ لیا ہو۔
”تیری بھرجائی کو پتا تھا نیک بختے کہ میری نند نے میرے میکے والوں کو ابھی تک بھوکا بٹھا رکھا ہوگا۔ تیری بھرجائی کتنی عقل مند ہے اور پھر اسے تیرا کتنا احساس ہے۔“ نصیر نے زرینہ کو چھیڑا۔
”وہ تو اپنے میکے کا خیال رکھ سکتی ہے کیونکہ اس کے تین تین پتر باہر کمائیاں کر رہے ہیں۔ سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں، جدے گھر دانے اودے کملے وی سیانے۔ میری تو ساری حیاتی کھیتوں میں جوتے گھساتے گزر گئی۔ کبھی بھینسوں کے لیے گھاس کاٹتے ہوئے تو کبھی بکریوں کو چراتے ہوئے۔ کب دن چڑھا، کب رات ہوئی، کچھ خبر نہیں۔“
زرینہ بات کو اپنے مطلب کی طرف لے جانے میں کمال رکھتی تھی۔
”اماں! میری سوہنی اماں! آج مجھے ایک بات تو بتا۔“ نادیہ چائے کی پیالی دادی کو پکڑاتے ہوئے بولی۔ ساتھ ہی دوسروں کو بھی چائے دے دی اور اپنی پیالی پکڑ کر ماں کے پاس آ بیٹھی۔
”ہاں ہاں پوچھ لے۔ پوچھ لے ساری باتیں۔ سارے سوال جواب مجھ سے ہی کرنا۔ سارا ٹبر چائے کی سڑکیاں لگا رہا ہے بیٹھ کے، اور کسی سے کچھ نہ پوچھنا۔ آئی وڈی ویلنی۔“ گرم گرم دودھ پتی پیتے ہوئے اس کا لہجہ اور بھی گرم ہو گیا تھا۔
”ناں، یہ بتا کہ تو دنیا کی اک اکیلی ماں ہے جس کا بیٹا باہر بیٹھا ہے پردیس میں۔“ وہ چائے کا گھونٹ لے کر بولی۔
”اماں! تیرے تین بھتیجے بھی وہاں بیٹھے ہیں جن میں سے ایک تیرا اکلوتا داماد بھی ہے اور جس طرح وہ وہاں سیٹ ہوئے ہیں، وہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا اللہ جانتا ہے۔ توں تے شکر کر کہ وہ وہاں پہ اکیلا نہیں ہے۔ ان کے پاس ہے۔ نہ کھانے کی فکر ہے، نہ کمانے کی۔ پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے انہوں نے۔
ذرا یہ بھی سوچ لے اماں! کہ اگر وہ ان کے پاس نہ ہوتا تو نہ اس کے پاس کام نہ کاج۔ وہ کہاں رہتا، کہاں سوتا اور کہاں سے کھاتا پیتا۔ اماں! تجھے تو کوئی فکر ہی نہیں ہونی چاہیے۔“
”دیکھا! مار دی ناں جوتی میرے سر پہ۔ ایسی ہوتی ہیں بہنیں اور بیٹیاں۔ شاباش ہے بھئی شاباش۔ ابھی ایک مہینہ نہیں ہوا اور آ گئی جتانے۔ اری کم بخت! یہ کیوں بھول گئی کہ وہ تیرا سگا بھائی ہے، جس کا کھایا پیا گنوا رہی ہے۔ عبداللہ! دیکھ لے...... دیکھ لے اپنی بہن کو۔ بڑی بہنیں جتاتا ہے، کلمہ پڑھتا ہے اس کے نام کا۔“
”جینو کم بخت! تیری تو مت ہی الٹی ہے۔ بچی تیرا احساس کر کے گرتی پڑتی، زمینوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی چاولوں کا دیگچہ سر پر اٹھا کے دوسرے گاؤں سے شکر دوپہر میں آئی ہے اور تو بجائے خوش ہونے کے الٹا اس کو طعنے دے رہی ہے۔ منحوس! تماشا بنا دیا ہے تو نے میرے گھر کو۔“
”دیکھ لے نصیرے! اپنی اماں کو۔ کیسے قینچی کی طرح چلتی ہے اس کی زبان۔“ زرینہ نے نصیر کو مخاطب کر کے شکوہ کیا۔
”نصیرے نے کیا دیکھنا ہے بھلیے لوکے۔ نصیرا تو پہلے دن سے دیکھ رہا ہے کہ اماں کی زبان اگر قینچی ہے تو تیری تلوار۔ تو مجھے یہ بتا کہ تو نے چپ ہونا ہے کہ نہیں۔ کسی کو تو بخش دے نیک بخت! بیٹی کے دل کا ہی خیال کر جس کی کل کائنات ہی پردیس میں ہے۔ پھر بھی حوصلہ دیکھ میری

شیرنی دھی کا۔ کرونا سے بڑی بلا تو ہے۔"
نصیر غصے میں بڑبڑاتا ہوا باہر صحن میں آم کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر جا کے لیٹ گیا۔
"بس اماں! بہت ہو گیا۔ اب تو نے نہیں بولنا۔ چپ رہ کر میری بات سننی ہے۔" نادیہ دادی کی ٹانگیں دباتے ہوئے بولی۔
"کروالے...... کروالے بے غیرت میری زبان بندی...... کروالے۔ دادی کی تو ٹانگیں دبائی جا رہی ہیں اور ماں کی گردن۔"
زرینہ، نادیہ کی بات پر ناگواری سے دادی پوتی کو گھورتے ہوئے بولی۔
"اللہ نہ کرے اماں! میں بھلا کیوں تیری زبان بند کروں گی۔ تو ہی نے تو ہمیں بولنا سکھایا ہے۔ بس میں تجھے پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ایک دفعہ میری پوری بات سن لے پھر۔ جتنا دل کرے بولنا۔"
وہ ماں کی باتوں سے عاجز آ چکی تھی، سورج سوا نیزے پر آ چکا تھا۔ راستے اسے پکار رہے تھے تو منزل اس کی منتظر تھی۔ وہ اگر اس گھر کی بیٹی تھی تو دوسرے گھر کی بہو بھی اور ہر جگہ، ہر توقع پر پورا اترنا تھا اسے اور یہ سبق اس نے اپنی ساس سے سیکھا تھا۔
"ہاں ہاں میری ماں! میں تو پاگل ہوں جو سارا دن بولتی رہتی ہوں۔ لے، میں اپنا منہ بند کر لیتی ہوں۔"
زرینہ نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے دبا کر بند کر لیا اور غضب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے نارمل انسان تو کہیں سے بھی نہیں لگ رہی تھی۔
عبداللہ یہ منظر دیکھ کر اپنی بے ساختہ ہنسی چھپانے کی غرض سے سر جھکا کر کمرے سے نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا اس نے ماں کے ہاتھ منہ سے ہٹا کر پیار سے گلاس ماں کے منہ سے لگایا اور ساتھ ہی بہن کو مصنوعی انداز میں ڈانٹتے ہوئے بولا۔
"چل آپا، تجھے میں تیرے گھر چھوڑ آؤں۔ دو پلیٹیں چاول کیا کھلا دیے ہمیں، میری ماں کا منہ بند کروانے لگی۔ آئی بڑی سمجھ دار بی بی۔"

نادیہ اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔
"اماں دیکھ، پورا مہینہ ہو گیا تجھے روتے ہوئے۔ یہ بتا کیا حاصل ہوا۔ کیا "کرونا" دنیا سے ختم ہو گیا تیرے رونے سے۔ اگر تو تیرے رونے سے ختم ہو گیا ہے تو پھر تو شوق سے صبح، دوپہر، شام، ہر وقت روتی رہ۔ ذرا سوچ! ادھر اُدھر نظر مار۔ پورے کا پورا گھر اوندھا پڑا ہے۔ دادی بوڑھی ہے۔"
(ہونہہ بوڑھی اس نے تو مجھے بوڑھا کر دیا ہے)
"عبداللہ نادان ہے۔"
(ہونہہ نادان، پورا چار سو بیس ہے، فراڈیا)
"ابا بھی کم پریشان نہیں ہے۔ اماں...... پیاری اماں! ہمت کر، تو تو بہادر ہے اور اس وقت تجھے ہی بہادر بننا ہے۔" نادیہ ماں کو ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے بولی۔
"ارے میری ہمت تو ختم ہو گئی۔ مٹی ہو گئی ہوں نادو پتر! میں۔ مجھے بشیرے کا دکھ مار ڈالے گا۔"
"اللہ خیر کرے گا اماں! میں تجھے بتاتی ہوں اپنے گھر کی کہانی۔ پھوپھی سب سے پہلے اٹھتی ہے، تہجد سے بھی پہلے۔ پھر تہجد کی نماز پڑھ کے تسبیح، نماز پڑھتی ہے پھر تلاوت شروع کر دیتی ہے تو اس کی آواز سے میں خود بخود اٹھ جاتی ہوں۔ نماز پڑھ کے کی بناتی ہوں اور صفائیاں کرتی ہوں۔ مرغیوں کو نکال کے دانہ پانی ڈالتی ہوں۔ ماما ڈیرے سے دودھ لے آتا ہے۔ پھوپھی ناشتا بنا کے فارغ ہوتی ہے تو دوبارہ قرآن پاک لے کے بیٹھ جاتی ہے۔ ساتھ میں بھی کام نبٹا کر قرآن پاک لے کے اس کے ساتھ پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ ہر وقت ہم ان کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ اب تو بتا اماں! مصیبت میں پھنسے ہوؤں کو تیرے رونے اور چیخ و پکار یا لڑائی جھگڑے کا کوئی فائدہ ہے یا تیری دعاؤں کا فائدہ ہے۔ ماں کی دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے اماں! کوئی صدقہ خیرات کیا کر۔ نمازیں پڑھا کر۔ دعا کیا کر بشیرے کے لیے بھی اور باقی سب کے لیے بھی اور اللہ کا شکر ادا کیا کر۔"
"واہ نادو! کیا سمجھ داری ہے کہ میں شکر ادا کروں اس بات کا کہ میرا بیٹا پردیس جاتے ہی گم

میں قید ہو گیا ہے۔" زرینہ نے نادیہ کی بات نہ سمجھنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

"اماں! شکر اس بات کا کر کہ تیرا بیٹا پردیس میں بے یار و مددگار نہیں، اپنے بھائیوں کے پاس ہے۔ جو اس کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا سوچ جن کے پاس نہ رہنے کو مکان ہے، نہ محنت کرنے کو مزدوری مل رہی ہے۔ جو وبا سے بچ بھی گئے تو بھوک کی بلا سے کیسے لڑ رہے ہوں گے۔

اماں! اپنے آسے پاسے (اردگرد) دیکھ، ذرا جھاتی مار۔ پنڈ کے لوگ بھکے مر رہے ہیں، کام نہ ملنے کی وجہ سے۔ بشیرا تو پردیس میں ہے مگر پھر بھی اللہ کا کرم ہے، اسے کوئی پریشانی نہیں۔ تو خود بھی دعائیں کر اور گھر کا ماحول بھی ایسا بنا کہ یہ بھی سکون سے عبادت کر سکیں۔"

"ناں میں نے کسی کو روکا ہوا ہے عبادت کرنے سے۔"

زرینہ کے لہجے سے تندی غائب ہو چکی تھی۔ ہاں پشیمانی کی ہلکی سی جھلک ضرور دکھائی دے رہی تھی۔

"اور بھلا روکنا کسے کہتے ہیں۔ سکون کی ایک بھی سانس تو ہمیں لینے نہیں دیتی۔ بندہ نماز، قرآن کیسے پڑھے۔ ہر وقت بھاں بھاں کرتی رہتی ہے۔" دادی کو تو دل کا غبار نکالنے کا موقع مل گیا۔

"چھوڑ دادی! ایسی باتیں کر کے تو پھر لڑائی کا ماحول بنانے لگی ہے۔" عبداللہ ماں کے تیور دیکھ کر جلدی سے میدان میں کودا۔

"یہ کیوں چھوڑے گی؟ ہمیشہ جلتی پر تیل ڈالتی ہے۔ اگر اس نے گھر میں کبھی سکون کا ماحول بنایا ہوتا۔ میں نے جو کچھ پہلے دن سے دیکھا وہی کیا، ورنہ میں کوئی پاگل تھی۔"

"ہونہہ! کبھی کوئی پاگل بھی خود کو پاگل کہتا ہے۔"

"اٹھ عبداللہ! مجھے چھوڑ کے آ۔ سہ پہر ہو گئی ورنہ میں اکیلی ہی چلی آئی تھی تو چلی بھی جاتی۔ ان دونوں نے کسی کی نہیں ماننی۔ حد ہو گئی ہے۔ اب تو محلے والیاں بھی تمہاری لڑائی سننے چھتوں پہ نہیں آتیں۔ اب لڑنا چھوڑ دو اور ہاں آئندہ میں نہیں آؤں گی تمہارے گھر۔ جب تک لڑائی ختم نہیں ہو گی۔ اتنی دیر میں تو میں نے چار سپارے پڑھ لینے تھے۔"

"نادیہ پتر! دھیاں (بیٹیاں) میکے سے ناراض ہو کے نہیں جاتیں۔ چل جینو میری دھی، اٹھ کے وضو کر۔ دونوں ماں بیٹی ظہر کی نماز پڑھیں مگر پہلے نادیہ کو پیار سے رخصت کر۔ اللہ اس کا سہاگ سلامت رکھے۔"

دادی نادیہ کو اپنے ساتھ پیار سے لگاتے ہوئے زرینہ سے مخاطب ہو کے بولی۔

"اماں! تو بھی مجھے معاف کر دے اور نادو! توں وی۔ یہ باتیں جو تو نے مجھے سمجھائی ہیں آج، یہ سب تو میرے بتانے کی تھیں مگر میں ہمیشہ یہی سمجھ کے کڑھتی رہی کہ اماں میرے ساتھ زیادتی کرتی ہے۔"

نادیہ کی باتوں نے اسے حقیقت کی کسی اور ہی روشنی سے آشنا کیا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے والی زرینہ سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی۔

"جھلی نہ ہووے تے۔ ماں دھی میں کیسی ناراضی۔ میری زبان ہی کڑوی ہے، تو تو بڑی ہمت والی ہے جس نے میرے ساتھ نباہ کر لیا۔" دادی جلدی سے بولی۔

نادیہ ان کی باتیں سن کر ادا سی سے مسکرائی اور خاموشی سے اٹھ کر گھر کا بیرونی دروازہ عبور کر گئی۔ اب اس کا دل مطمئن تھا۔

آم کے درخت کے نیچے کھری چارپائی پر لیٹا ہوا نصیر آنکھوں پر بازو رکھے سوچ رہا تھا کہ بیٹیاں واقعی اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ وہ گھر کا سربراہ ہونے کے باوجود اتنے دنوں سے اپنے گھر میں سکون کی وہ فضا قائم نہ کر سکا تھا اور نادیہ نے دو گھنٹوں میں ہی گھر کی فضا کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہوا کے تازہ جھونکے کی مانند آئی اور گھر سے مایوسی، گھبراہٹ اور ناامیدی کے حبس کو دور کر گئی۔

مکمل ناول

''دادا کہتے ہیں زندگی مائیگرین کے درد جیسی ہے۔ ادھر راحت ......ادھر اذیت ۔ خوشی اور دکھ ساتھ ساتھ۔ مگر دادا یہ بھول جاتے ہیں کہ کچھ ''پورے درد'' والے بھی ہوتے ہیں۔ دکھ ملا تو پورا..... خوشی ملی تو مکمل۔ مگر اپنے اپنے غموں کو بھوگتے روح شل ہوجاتی ہے۔ یہ ایک ایسی تھکن ہے جسے میں اب تک کوئی نام نہیں دے سکا۔''

گود میں دھرا کتابوں کا ماؤنٹ ایورسٹ۔ جیل روڈ کی مصروف ترین شاہراہ۔ وہ مسافر خانے کے شیڈ تلے بیٹھا اپنے ساتھی سے کہتا۔

''تھک گئے ہو؟'' ساتھی کی مسکراہٹ۔ وہ نظر انداز کرتا۔

''تمہارے دادا کا فلسفہ کسی کام نہیں آنے والا۔ بس آگئی ہے اٹھو اور گھر چلو...... دعوت کا انتظام کرنا ہے ابھی۔'' ساتھی کی مسکراہٹ نے ترغیب دلائی۔

وہ زنجیر کرتی تھکن کو پاؤں میں روندتا بس میں سوار ہوگیا۔

☆☆☆

اخروٹ کی لکڑی کی مخصوص باس والا وہ گھر پرسکون ہواؤں میں گھرا تھا۔ بالائی منزل کے کونے والے کمرے میں خوب صورت فانوس ہر شے کو منور کیے ہوئے تھا۔ نک سک سے تیار ایک وجود منقش لکڑی کے پلنگ کی پائنتی پہ ٹکا تھا۔

''زیادہ سے زیادہ تین دن لگ سکتے ہیں مجھے۔

نازیہ رزاق

ایک خواب سہانا کوئی

دنیا کے ایک بڑے سوشل سائنٹسٹ (سماجی سائنسدان) کانفرنس میں شرکت کر رہے ہیں۔ پھر ایک انٹرویو دینا ہے بی بی سی واشنگٹن میں۔ جلد لوٹ آؤں گا۔ آپ اپنے فزیوتھراپسٹ سے تعاون کیجیے گا۔" وہ جھکا۔ پلنگ پر چت لیٹے وجود کے ماتھے پہ بوسا دیا۔ تبھی اخروٹ کی لکڑی پہ پاؤں کی دھمک پڑی۔

"سر! فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔" اسکاٹش سکریٹری نے سرخ وسفید چہرے اور پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"ڈیوڈ کہاں ہے؟" اس نے پرسنل اسسٹنٹ کا پوچھا۔

"اس کی وچ نما آنٹی نے کل رات نیند میں چلتے ہوئے سیڑھیوں سے گر کر ٹانگ تڑوالی ہے سر۔ اس کی چھٹی کی درخواست آئی ہوئی ہے۔"

"اوہ...... یہ تو بری خبر ہے۔ لیانا! آپ کچھ رقم بجھوا دینا ڈیوڈ کو۔ میری فائل لائے گا وہ سنبھال لینا اوران کا خیال رکھنا۔" وہ گھر سے نکلا تھا۔

کینیڈا کی ریاست ورمک شائر کا خوب صورت قصبہ جو سیاحت کے لیے پوری دنیا میں جانا جاتا تھا۔ اس قصبے کا سب سے کامیاب کاروباری شخص تھا وہ۔ کینیڈا کی تمام ریاستوں کے سیاحتی مقامات میں ریسٹورنٹس کی چین چلانے والا وہ شخص تھا جس کے واسطے یہ کہانی بنی گئی۔

☆☆☆

"ایڈم! تمہارا ناشتہ ادھورا کیوں ہے؟" بالوں میں سجے رولرز کو ہاتھوں سے سیٹ کرتی وہ چودہ سالہ بیٹے سے مخاطب تھی۔

"یہ ناشتے، ڈنر میری توہین میں کمی نہیں لا سکتے۔" وہ چیخا۔

"میرے بھائی توہین، نام والوں کی ہوتی ہے...... سو یو ڈونٹ وری۔" یہ برنٹی تھی۔ تیرہ سالہ، سیاہ فام۔ گھنگھریالے بالوں میں ہیڈ فونز لگائی، ابلا انڈا کھاتی وہ ایڈم کو زہر لگتی۔

"مام، ہمیشہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بلسی جانتا تھا وہ مجھے تین ہفتوں سے ڈیٹ کر رہی ہے پھر کیوں؟ میرا ہی دوست کیوں؟" وہ بیٹے کا کندھا سہلانے لگی۔

"میں دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ (گالی) لڑکی۔" وہ غصہ ہوتی اٹھ کھڑی ہوئی ایڈم بوکھلایا۔

"میرا خیال ہے میں نے تم لوگوں کو آزاد زندگی گزارنے کی اجازت دی ہے مگر کسی لڑکی کو گالی دینے کی ہرگز نہیں۔ اگر ان فضول سرگرمیوں کے بجائے کچھ وقت اپنی کتابوں کو دے سکو تو تمہاری ماں کو کچھ پل سکون مل جائے گا۔"

مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے ڈائننگ روم سے نکلتی ہوئی درمیانے برآمدے کی سیڑھیوں تک آئی۔ ایڈم اور برنٹی پریشان ہوئے۔ سیڑھیوں کے پاس کھڑے باقی چاروں بھی متوحش ہوئے۔

"گاڑی میں بیٹھو...... میں بیگ لاتی ہوں۔" اسکول کے لیے تیار کھڑے بچوں سے کہا۔ کمرے تک گئی بیگ اور چابیاں لائی۔ سیڑھیوں کے پاس ایڈم کھڑا تھا۔

"معافی چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ پورچ تک پیچھے آیا۔

"میں نے کہا، معافی چاہتا ہوں۔" وہ رکی۔ نیویارک سٹی کا سورج اپنی کرنیں اس کی سبز آنکھوں میں سجانے لگا۔

"اپنی معذرت کی وضاحت کر سکتے ہو؟ یہ معذرت مجھ سے ہے یا پھر اپنے برے رویے سے؟" وہ چھوٹے بہن بھائیوں کو دیکھتا سرخ ہوا۔

"جو آپ کہو۔" ماں کو معتبر کیا۔

"اپنا رویہ درست کرو۔ تمہاری ماں کو یہ الفاظ دہرا کے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔"

وہ آگے بڑھا اور ماں سے لپٹ گیا۔ چار سالہ جیمز بھی جگہ ڈھونڈنے لگا۔ یوں جس کو جہاں جگہ ملی وہ اس کے وجود سے منسلک ہو گیا۔ سامنے والے بنگلے

کے مسترا و کلے اور ان کی بیٹی حیرت زدہ اس محبت کے مظاہرے کو دیکھتے رہے۔

☆☆☆

"سنگاپورین رائس کسی طرح مس نہ ہوں۔ یاد تو ہے ناں؟" برف سی یخ آواز نے اس کی پشت میں سوراخ کرتے ہوئے ہڈیوں کے گودے میں اپنی جگہ بنائی۔ "یاد ہے ناں؟" والا جملہ ہر بار اس کی اوقات کا تعین کرتا۔

اس نے چین کو تیزی سے گھما کر سبزیوں کی جگہ بدلی۔ اور کچھ بدلے نہ بدلے ان کی تو جگہ بدلے۔

"جی بس تیار ہیں۔"

"اس کا ٹیکسٹ آیا تھا ایپل کیک کی فرمائش کی تھی۔ حسن کو بہت پسند ہے۔" اس نے تھکن کو خود میں چھپن چھپائی کھیلتے پایا اور سر ہلا دیا۔

"بس چاکلیٹ کوٹنگ باقی ہے۔"

"چاکلیٹ سے یاد آیا میں نے تمہیں آلمنڈ چاکلیٹ بنانے کو کہا تھا کل؟" وہ منرل واٹر کی بوتل کو منہ لگاتے ہوئے بولیں تو دل غیر معمولی ہوا۔

جواب میں تاخیر ہوئی اور فوراً محسوس کی گئی۔

"کیا تم ہماری زندگی کو تھوڑا سہل نہیں کر سکتے؟ کیا یہ ایک غلط مطالبہ ہے تمہارے اس ماموں کے لیے جنھوں نے خود کو مشین ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی...... صرف اس گھر کے لیے مگر تمہیں کیا...... تمہاری بلا سے۔ گھر جانے گھر والے جانیں ٹوہیل وو دس منحوسیت۔"

وہ میک اپ زدہ چہرہ تھپتھپا کے گہری سانس بھر کے جوتوں کی آواز پیدا کرتی کچن سے نکل گئیں۔

وہ ہاتھ کی رفتار بڑھاتا رہا۔

یہ رئیس خان زادہ کی اکلوتی ممانی تھیں۔ بڑے جتنوں سے قابو کیا ہوا فربہی مائل وجود۔ بڑی بڑی قدرے باہر کو ابلتی آنکھیں، پھیلی سی ناک باریک ہونٹوں اور ناک کا درمیانی فاصلہ غیر معمولی۔ بڑے اور کھلے مساموں والی زردی سی جلد اور بادامی رنگ ڈائی زدہ بال۔ انسانوں کے ایسے گروہ سے تعلق رکھتیں جو خود کو "میں" سے شروع کر کے "میں" پہ ختم کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ بات اچکنے میں ماہر ہوتے ہیں...... ان کے ہوتے کسی بات کا کریڈٹ کوئی اور لے ہی نہیں سکتا۔

"ارے فریال! تمہارے بیٹے نے اے پلس لیا ہے۔ مبارک ہو۔ ویسے تم لوگوں کی فیملی میں تو اولیول میں یہ اسکور بہت ہے۔ خیر میری امی کے ماموں کی پوتی نے پچھلے سال جونیئر کیمرج میں ڈسٹنکشن (امتیاز) لی تھی اور میں نے اپنی......" وہ میں کی کہانی کئی گھنٹوں سنا سکتے ہیں۔

وہ سوچوں کو مات دیتا پھر سے جلتے چولہوں پہ دھرے پکوانوں سے الجھنے لگا۔

یہ سلسلہ بھی جانے کب شروع ہوا...... کب وہ ان نیلے پیلے شعلوں سے روشناس ہوا۔ ہاں یہ تب کی بات ہے جب ماں کا انتقال ہوا اور وہ گیارہ سال کی عمر میں پردیسی باپ سے مایوس ہو کر ننھیال چلا آیا۔ نانا حیات تھے، ماموں بیورو کریٹ۔ شروع میں وہ اپنی خالی خالی آنکھوں سے ہر شے کو تکتا رہتا۔ یونہی سال گزر گیا۔ تب گرمیاں تھیں اور ممانی کا کک اپنے گاؤں...... گندم کی کٹائی کو گیا مگر لوٹ کے نہ آیا۔ ممانی برتنوں پہ غصہ نکالتیں، جیسے تیسے کرتیں۔ ایک دن پچھلے صحن کی سیڑھیوں پہ کتاب پڑھتے رئیس سے بولیں۔

"دال اتار لینا اور بگھار کا مسالہ تیار کر دینا۔ دائیں والے کیبنٹ سے چاول بھی نکال دینا میں ماسٹر بی کی طرف سے ہو کر آئی۔"

وہ خود کو گھسیٹتا کچن میں لایا۔ سب آرام سے کیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ مسالوں کی دکانوں سی سوندھی سوندھی خوشبو۔ نرم گرم سا ماحول۔ اس کی آنکھیں رسنے لگیں۔

"مما......!" اسے وہ یاد آئیں جو کسی بچے کو کبھی نہیں بھولتیں۔ یہ ماحول سارے گھر سے جدا تھا۔ اپنا اپنا سا۔

وہ اٹھا اور چیزوں سے چھیڑ چھاڑ کے بعد ڈرتے ڈرتے چاول بنا ڈالے۔

سمیعہ ممانی آئیں تو سب کھانا کھا چکے تھے۔

پھر وقت کی بے قابو لہروں نے جانے کہاں کہاں سے راستے بناتے اسے یہاں لا پٹخا۔ اب گھر سے خانساماں کو رخصت ہوئے بھی آٹھ سال ہو چکے تھے۔ وہ ہر شے اس ہنر سے بناتا کہ...... کہ فرعون کے محل کے باورچی بھی اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں مگر نقل بھی نہ بنا پائیں۔ پہلے پہل تو ممانی نے سب کے سامنے تعریف میں کوئی کسر نہ چھوڑی...... مگر جیسے جیسے اس کی غیر معمولی مہارت اور لذت کا ڈنکا بجنے لگا سمیعہ ممانی نے مورچہ بدل لیا۔

"رئیس! ٹیبل لگانے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ ہر شے بنا کسی ترتیب کے۔ اگر آپ نے پڑھائی سے جان چھڑانے کو یہ تلوار ہمارے سروں پہ رکھی ہے تو پھر نبھانا تو خوش اسلوبی سے ہی چاہیے ورنہ لوگ تو ہمیں ہی الزام دیں گے کیوں منزقیوم؟" وہ جو کچھ پھلنے پھولنے لگا تھا...... واپس سمٹنے لگا۔

رفتہ رفتہ یہ بات ہر طرف تسلیم کی جانے لگی کہ وہ پڑھائی سے بچنے اور تعریفیں بٹورنے کو سب کرتا ہے۔ ماموں نے اسکول تبدیل کروادیا۔ ممانی نے ایک ڈائری تھمائی۔

"ہر دن کے خرچے کا لفظ لفظ گوشوارہ بنا کے رات کو دکھایا کرو۔"

"تمہارے دادا نے پاکٹ منی نہیں بھیجی؟ دراصل اس ماہ ہاتھ کچھ تنگ ہے تو......" ماہانہ فیس سے ہاتھ کھینچ لیا گیا۔

دادا نے پتا چلنے پہ رقم زیادہ بھیج دی تو......

"کیا ہر بات پہ لوگ مجھے کسی جادوگرنی کی طرح دیکھا کریں گے...... الزام دیا کریں گے مجھے جس نے اس کے سر پہ تب ہاتھ رکھا جب سگا باپ بھی اسے بھولے، دوسری شادی رچائے ورلڈ ٹور پہ تھا۔ کیا کہیں گے لوگ۔ سب کو جواب تو مجھے دینا ہے۔

خاندان میں مو تو مجھے کرنا ہے۔"

سمیعہ ممانی نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔ آواز بٹھا لی۔ نتیجتاً دادا کی نانا سے سخت بحث ہوئی۔ پیسے کم کرائے گئے۔ نانا نے اسے پیسے گنتے دیکھا تو اکڑے۔

"ظفر خانزادہ کا پوتا...... تڑپا تڑپا کے زندگی کے دن تھماؤں گا تمہیں جیسے میری بیٹی کو اس گھر میں ملے۔" وہ حیران رہ گیا۔ مگر وقت اسے حیران کرنے میں تیز رفتار نکلا اور وہ عادی ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

"کیوی میرا فوکس شاٹ لو ذرا۔ مسام زیادہ کھلے تو نہیں لگ رہے۔ دراصل کل مساج کے بعد مسام بند نہیں کروائے...... مصروفیت۔"

"شارلٹ تمہیں میں نے مواد کی نقل لانے کو کہا تھا تاکہ جلدی معائنہ کروانے کو۔" وہ قدرے بھاری آواز میں تحکم سے بولی۔ شارلٹ کیمرے، لائٹس کی تاروں سے الجھتی منزل کو پہنچی۔ وہ ہاتھوں کو بار بار مسلتی۔ زندگی نے اپنا دائرہ مکمل کر کے اسے وہاں پہنچایا تھا کہ حیران ہونے میں بھی وقت لگ رہا تھا۔ تین کافی کنگ اوپر تلے چڑھا کے بھی دماغ کی ٹیسیں کم نہیں ہو رہی تھیں۔ بہترین دوائیاں یوگا کے آسن بھی سرخ پپوٹوں کی سوجن سے مقابلے میں ناکام تھے۔

"نجانے کیوں کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ انسان ہونے سے زیادہ انسان رہنا مشکل ہے۔" پیپل کے پتوں سا بجتا دل لیے وہ قریب آتے لمحوں کو خوف سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

"دادا نے بتایا ابن خلدون نے افراد کو تین بڑے گروہوں، اشرافیہ اعتدالیہ اور غربا میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن دادا کے ناقص العقل پوتے نے یہ ڈھونڈا ہے کہ ایک اور بڑا گروہ بھی ہے "آرذالیہ" ایسے لوگ کچھ نہیں ہوتے۔ کسی گروہ میں سفر نہیں کرتے۔ معاشرے کے کسی درجے پہ نہیں پہنچتے۔"

اگر اس وقت یہاں دادا ہوتے تو کہتے۔

"ایسے لوگ ہی تاریخ کے زاویے درست کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی ہوتے ہیں جو غیر مرئی روشنائی سے تاریخ کائنات میں اپنا نام رقم کر جاتے ہیں۔"

دادا کو مجھ میں امید نامی بھوسا بھرنے کا شوق ہمیشہ سے ہی رہا ہے۔ ہے ناں؟"

وہ کھانے کو ڈش آؤٹ کر رہا تھا جبکہ سبز و خاکی لباس والا وجود کاؤنٹر پہ بیٹھا مسکرائے جاتا۔

"جب تم تھک جاتے ہو ناں رئیس خان زادہ! تو تمہیں دادا کا سارا فلسفہ کسی پیٹ بھرے کے سامنے دلیے کا پیالہ ہی لگتا ہے۔ امید کو خود سے باندھے رکھنے کا اجر تمہیں ہی ملے گا۔"

"اگر تم اپنے ہفتہ وار مونو راگ (ہم کلامی) سے فارغ ہو جاؤ تو ٹیبل لگانا شروع کر دو۔ مہمان انتظار میں ہیں۔" شاہ میر نے کچن کے دروازے میں خود کو بمشکل روک کر اس پر طنز کیا اور چل دیا۔ کاؤنٹر پہ بیٹھا وجود ٹھٹکا۔

"شاہ میر کو میں بھی نظر نہیں آتا۔" خالد کچن میں آیا۔ رئیس نے میز لگائی ہر شے میں ترتیب اور خوش اسلوبی کو نبھایا۔

ڈرائنگ روم میں جھانکا۔ ماموں زاد انابیہ اور اس کا شوہر اعزازی کرسیوں پہ بیٹھے محو گفتگو تھے۔ مصنوعی باتیں، مصنوعی مسکراہٹیں۔ ایلیٹ کلاس کی ایسی محفلوں میں بناوٹ سب سے آگے نظر آتی ہے کدورتیں اس کے پیچھے، جبکہ مسالہ دار غیبتیں سب سے پیچھے مگر سب سے زیادہ گھاتک۔

ممانی کو کھانا لگنے کا بتایا۔ مڑا تو دیکھا مسز کرنل کی آمد ہوئی۔ مسز کرنل ماموں آفتاب پراچہ کے کزن کی بیوی تھیں۔ بنگلہ اسی لین کے کونے پہ تھا۔ انسانوں کے ایسے گروہ سے تعلق رکھتی تھیں کہ جن کی کاملیت پسندی انہیں کسی حد تک نفسیاتی بیمار بنا چکی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اگر جنگل میں اکیلے بھی چھوڑ دیے جائیں تو وہ جنگلی حیات کو ڈسپلن کی کلاسیں دینا شروع کر دیں، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی سے ہاتھ بھی ملا لیں تو فوراً ٹشو پیپر سے صاف کریں گے۔

راتوں کو اٹھ اٹھ کر بستر ٹٹولتے اور اس میں کوئی کمی ڈھونڈھ کر رہتے اور رفع کرنے کے لیے کوارٹرز میں سوئے ملازموں کو زحمت دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ ایسے لوگ میز پہ چھری کانٹے کی ذرا سی ادل بدل پہ چونک چونک جائیں گے۔

"ہیلو رئیس......! کیسے ہو؟ میں لیٹ تو نہیں۔"

وہ رئیس پہ مہربان تھیں۔

"بالکل بھی نہیں مسز کرنل۔ آپ کیسی ہیں؟"

"فائن بیٹا...... اس سے ملو یہ میری پوتی ہے......"

"اسے کچھ کھانے کو دے دو تو مہربانی ہوگی۔" وہ لڑکی جسے مسز کرنل نے متعارف کروانے کی اپنی سی کوشش کی تھی، اس کی گود میں اپنی رشین بلی دے رہی تھی۔

رئیس نے اب کے لڑکی کو دیکھا۔ پنڈلیوں تک آتی جینز پہ گہرے رنگ کی، ہیلووین کی ٹی شرٹ۔ پاؤں میں جاگرز شکل سے امریکن لگتی۔ گہری سبز

آنکھیں برف سی شفاف رنگت۔ بے تحاشا گھنگھریالے بمشکل کندھوں تک آتے بال اور سرخ کانوں میں ہیڈفونز لگائے چیونگم چباتی وہ لڑکی جیسے مسز کرنل پہ احسان کر رہی تھی۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے مگر وہ پیروں کو جھلا کر اور منہ کو ہلا کر عجب بے نیازی سے صوفے پہ براجمان تھی۔

وہ مسکرا کے پلٹ گیا۔ نذیر کو بلا کر بلی کو کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد فرمائشی کافی کا دور چلا۔ وہ کافی سرو کر رہا تھا، وہاں عکاشہ بھی نظر آگئی۔ ماموں کی دختر نمبر دوم۔ کراچی میں رہتی تھی۔ دوسرے درجے کی اداکارہ تھی۔ آج کل کسی بڑے پروجیکٹ کے لیے کوشاں تھی۔ آج کی نسل کے اس گروہ سے تعلق رکھتی تھی جو میری زندگی میرے اصول کے موٹو پہ یقین رکھتے ہوئے بڑی سے بڑی غلطی بھی جسٹ ایڈونچر کے نام پر کر سکتے ہیں۔ فی الحال اس کی زندگی میری فٹنس سے شروع ہو کر میری اسٹائلنگ تک ہی محدود تھی۔ جب سترہ سال کی تھی تو کسی پہ کرش ہوا تھا۔ ناکامی بھی ہوئی۔ نتیجتاً خودکشی کی کوشش بھی کر لی۔ تب سے سب اس کی شخصیت سے گھبرا گئے تھے۔

''مائے گاڈ...... آئی ہیو لاسٹ مائے نیکلس اوور ہیئر۔'' (میرے خدا۔ میں نے اپنا ہیروں کا ہار یہاں گم کر دیا) یہ انابیہ کی روہانسی پکار تھی۔ سب بوکھلائے۔ مختلف آوازیں گونجنے لگیں۔

''رئیس! ادھر دیکھو ذرا۔'' اشارہ صوفے کے نیچے تھا۔ سب اپنی جگہوں سے کھڑے ادھر ادھر جھانکنے لگے صرف وہ لڑکی بیٹھی پیر جھلاتی رہی۔

''وہ میرا ویڈنگ گفٹ تھا...... حسن کی امی نار وے سے لائی تھیں۔'' انابیہ کی آواز نم تھی۔

وقت گزرنے لگا۔ نیکلس ہنوز گم شدہ است۔ انابیہ کا شوہر اسے تسلیاں دے رہا ہے۔ وہ بے آواز آنسوؤں سے رو رہی ہے۔ سمیعہ آنٹی کا بی پی لمحہ بہ لمحہ اوپر اٹھ رہا ہے۔ رات تیسرے پہر میں داخل ہوئی تو سمیعہ آنٹی سب سے معذرت کرنے لگیں سب اجازت چاہنے لگے۔ مسز کرنل نے بمشکل ماتھے کے تیور درست کیے اور اٹھیں۔

''او کے سمیعہ...... ہم چلتے ہیں۔ کرنل صاحب ڈنر سے آکے سو بھی گئے ہوں گے۔ پریشان مت ہو۔ انابیہ سے کوئی لاپروائی ہوئی ہے۔ یہیں کہیں ہوگا نیکلس مل جائے گا۔ او کے انابیہ! اب رونا تو بند کرو۔''

مسز کرنل کی پوتی شرٹ ٹھیک کرتی اٹھی اور رئیس کی نگاہیں برف ہوئیں۔ مسز کرنل کی پوتی کی جینز کے آخری کونے سے جھانکتا نیکلس۔

مسز کرنل لاعلمی سے نیکلس مل جانے کی دعائیں دے رہی ہیں۔ پوتی نیکلس لیے نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے اور رئیس ابھی تک برف کا ہوا کھڑا ہے۔ یہ ان کا پہلا تعارف تھا۔

☆☆☆

اس دن اسکول میں میری استاد نے ہمیں ملٹن (Milton) پڑھایا تھا اور ملٹن کی شاعری میں کسی لیواتھن (Leviathan) نامی بلا کا ذکر ہوا بہت بڑی سمندری بلا......

اس وقت میں تکونی شیشے کی ہی کھڑکی سے ناک چپکائے، بالائی منزل پر بنے اپنے کمرے سے، سڑک پہ بھکاریوں سے گھومتے جھومتے اندھیرے کے سمندر، میں اس بلا کو ڈھونڈنے میں سرگرداں تھی۔ نچلی منزل سے دیواروں، راہداریوں میں دراڑیں ڈالتی آوازیں سارے میں گونج رہی تھیں۔

آتش دان میں پڑی لکڑیاں تک آواز سے ہول رہی تھیں۔ دائیں جانب بنے اوپن کچن کے چولہے پہ دھری چائے اب افریقا کے کالے جادو سا رنگ بدل چکی تھی۔ آوازیں مسلسل اور پرزور تھیں۔ باہر اندھیرے کے سمندر میں لیواتھن اپنی دیو قامت پونچھ، سارے بنگلوں کی کھڑکیوں پہ مارتا پھر میری کھڑکی میں آکے چنگھاڑتا۔

''ہاں ہاں...... ذلیل عورت! جب قسمت میں کالک ہی لکھی تھی تو پھر بھرے نیویارک میں مجھے روشنی کہاں نظر آتی...... اگر آجاتی تو میں تم پہ تھوکتا بھی ناں۔''

"ہونہہ...... بے غیرت گیدڑ تم صرف عورتوں کے پیچھے دم ہی ہلا سکتے ہو یا زیادہ سے زیادہ زبان...... تھوکنے کی ہمت تو تمہیں اس زندگی میں کبھی نصیب نہ ہوگی۔" وقت کسی بدمزہ فلم کے دوران جیسا...... سستی دکھاتا، خراماں خراماں سرکتا۔

"جب اس چکاچوند نیویارک میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے تو وہ میں ہی تھی جس نے یہ غلاظت بخوشی اپنی جھولی میں سمیٹی۔"

آوازیں مزید کریہہ ہوگئیں۔ لیوا تھن مسلسل ڈکراتے ہوئے، پہلو بدلتا میری کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے دیکھنا چاہا۔ جلا ہوا...... ادھڑا ہوا، کٹا پھٹا بدن۔ کسی خونخوار ڈریگن سا دھڑ، کسی اژدھے سی دم اور آواز...... اف۔ یہ مسلسل ہتھوڑا ہوتی آوازیں۔

"تمہارے اس عاشق ..کے ساتھ گزارے ــــ لمحات میں نے ہی اپ لوڈ کیے تھے۔ آخر کو دنیا بھی جان لے میرا ظرف...... صبر کی انتہا۔"

سامنے والی کھڑکی کھلی اور ایک چہرہ ہیری پورٹر کا شاندار پریمیئر دیکھ لینے سا تجسس لیے لان کی جانب کھلی کھڑکی پر نگاہیں جما بیٹھا۔ لیوا تھن دانت نکوسنے لگا۔

"اور تمہاری ہیلن آف ٹرائے کا بوٹاکس سیشن میں نے ہی اسپائل کیا۔ اب پھرے گی چھ ماہ تک ٹیڑھے ہونٹ اور اکڑی بھنویں لے کر۔"

اب کھڑکی میں فٹ ہوکے بیٹھا وجود، ٹیبلٹ کھڑکی سے باہر کیے مناظر قید کرنے لگا۔ لیوا تھن جیسے دھمال ڈالنے لگا۔

"تم کتیا۔"

"تم کمینے......" لیوا تھن وجد میں آکے میری کھڑکی میں گھس آیا۔ میرے ننگے پاؤں لکڑی کے فرش پر پسینے کے نشان چھوڑتے آگے بڑھے۔ سیڑھیوں کی ریلنگ سے نیچے جھانکنا، مجھے برج خلیفہ سے فلپائنی گھاٹی میں جھانکنے جیسا ہی لگا تھا۔

"آہ......" ممی نے شیشے کا گلدان ڈیڈی کے سر پہ مارا تھا...... اوہ کتنا نفیس اور مہنگا گلدان تھا وہ۔

لیوانتھن میری پشت پہ پھنکارنے لگا یوں کہ اس کی شعلے سی سانسیں میری پشت چھیدنے لگیں۔خوف نے کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح مجھ میں جگہ بنائی۔

پھرڈیڈی نے...... ڈیڈ نے پودوں کی کانٹ چھانٹ والی قینچی سے ممی کے ڈیڑھ بالشت جتنے بال کاٹ ڈالے...... اف۔چھوٹے بالوں میں ممی بالکل اچھی نہیں دکھتیں۔لیوانتھن کہیں غائب ہوا۔فضا پرسکون ہوگئی۔میں واپس مڑی۔نرم گلابی لحاف کوخود پہ طاری کیے میں نے مخصوص سائرن کا انتظار بڑے دل سے کیا۔طویل وقفے کے بعد لوسی آنٹی میرے کمرے میں آئیں۔مجھے یہ اطلاع دینے کہ آج کی شب وہ میرے ہمراہ رہیں گی...... کیوں؟ یہ میں جانتی تھی۔وہ فون پہ مصروف ہوئیں۔

"اب دونوں کو علیحدہ ہوجانا چاہیے...... آخر کب تک میٹروپولیس کے دفتر میں راتیں گزاریں گے۔" اداسے بال سہلاتیں تو ہیرے کی انگوٹھی چمکتی۔ نیند دماغ کے خانوں کو تالے ڈالنے لگی۔

اگلے دن سہ پہر میں ممی اپنا سامان اٹھائے،میرا بازو دبوچے ڈیڈی کو اپنے جانے کا بتا رہی تھیں تب لوسی آنٹی اپنی انگوٹھی ڈھونڈنے کے واسطے اس بکھرے ہوئے گھر کو مزید بکھیر رہی تھیں۔

میں پرسکون تھی کہ میرے گلابی چھوٹے کراس بیگ میں ایک چمکتی شے کا مزید اضافہ ہوچکا تھا۔اس اضافے کو گنتی میں اپنی زندگی میں در آنے والی کمی کو محسوس نہ کرپائی۔

☆☆☆

اسے ذائقوں سے کھیلنے میں مزہ آتا تھا۔پہلے پہل جو کام وہ مجبوری سے کرتا تھا۔اب وہ اس کام کے ہاتھوں مجبور تھا۔وہ دنیا کی ہر ترکیب آزمانے کو تیار رہتا۔خراب ہونے پر نام بدل کے موجد کا روپ دھار لیتا۔جیسے رس ملائی گھل گئی تو کسٹرڈ میں ملاکر الگ ڈیزرٹ بنالیا۔وقت گزرا...... چاکلیٹ چپس اور فروٹ کیک کی ٹاپنگ کردی پھر ڈرائی فروٹ ملایا تو وہ ذائقے کی حسوں کو چونکا دینے والی ترکیب بن گئی۔

ہائی کورٹ کے جج، ماموں کے کلاس فیلو، تشریف لائے۔ڈیزرٹ کے ایسے عاشق ہوئے کہ اگلے دن خانساماں کو سیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ایسے میں مسکراہٹ ابھی دل میں گھمن گھیریاں ہی ڈال رہی ہوتی کہ سمیعہ آنٹی میٹھا سا بول جاتیں۔

"چلو کسی کام کا تو ہے۔"

کچھ جملے بولنے میں کتنے ہلکے کیوں نہ ہوں...... سینے میں موت جیسے ہوتے ہیں۔وہ بھی ایسے جملوں سے گھٹنے لگا دن بہ دن...... تھوڑا تھوڑا۔

خیر...... ماموں کے چھوٹے بیٹے اذہان کو ہر ممی ڈیڈی میٹریل کی طرح چاکلیٹ پسند تھی۔

رئیس، سمیعہ آنٹی کی مسکراہٹ کے لیے کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد آلمنڈ چاکلیٹ بنا پایا۔ ثابت بادام کے اوپر ایک انچ چاکلیٹ کی تہہ۔اذہان اس دن صوفے پہ قلابازیاں کھاتا رہا۔شاہ میر بھی ذرا متاثر ہوا۔ماں بولی۔

"چاکلیٹ اوورگولڈ (زیادہ پکی ہوئی) لگتی ہے۔"

بچے کیا؟" والے انداز میں دیکھنے لگے۔پھر ہر ماہ اذہان کے لیے دو کلو بادام چاکلیٹ بننے لگی۔زندگی تھکن سمیٹنے میں جیسے جت گئی۔

شاہ میر کو سوشی پسند تھی تو وہ جھینگوں کو سیدھا کرنے کے جتنوں میں لگا رہتا۔عکاشہ ڈائٹ کونشئس تھی تو وہ ڈائٹ سوپ اور سلاد کو لذیذ سے لذیذ تر کردینا چاہتا۔او لیولز میں بمشکل چارسوتیئس نمبر کا ٹیلا بنا سکا۔

سمیعہ آنٹی نے دیکھا میں نہ کہتی تھی کہہ کر ہاتھ جھاڑ لیے۔

"نانا نے...... نسل ہی ایسی ہے۔" کہہ کر جان چھڑالی۔

"ماموں نے...... دیکھ لو آگے کیا کرنا ہے۔" بول کر ذمہ داری نبھالی۔

اور وہ ایک بار پھر اسٹور روم میں بچھے سنگل بیڈ پہ سر جھکائے بیٹھا ایڑیوں کے تلووں سے اٹھتے درد کو

دباتا رہا۔
"آہ، یہ تھکن......"

☆☆☆

"سب متوجہ ہوں...... تیس سیکنڈز میں ہم آن ایئر جانے والے ہیں۔" شارلٹ نے تالی بجا کر سب کو چوکنا کیا۔

مہمان بے ساختہ اپنا ہاتھ ٹائی تک لے گیا اسے ڈھیلا کیا۔ پھر وہ ہاتھ منرل واٹر کی بوتل تک گیا ہے۔ میزبان ہلکی کپکپاتی آواز کے ساتھ ابتدائی الفاظ بول رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ "زمین" نامی سہارے کا ہر حصہ پکے پھل کی طرح خلا میں جھڑ گیا ہے۔ صرف یہی منظر بچا ہے کہ جس میں دو کرسیوں کے درمیان سیپیوں سے بنا میز، ایش ٹرے، کانسی کا مدھر مجسمہ یہی ایک حصہ سو کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے گھوم رہا ہے ایسے جھکڑ کی صورت جو کچھ بھائی نہیں دینے دیتا۔

میزبان اعتماد کو سمیٹتے ہوئے اس کی کامیابیوں کی فہرست درجہ بدرجہ بمع تواریخ سب کو ازبر کرانا چاہتی ہے۔ گھوڑے کے الگ دو اٹھے پیروں میں پھنسے طویل قامت گھڑیال نے الگ اپنا راگ بھیروی چھیڑ رکھا ہے...... ٹک ٹک ٹک زمین اس حصے کو اٹھائے گھوم رہی ہے۔ گھڑیال بھی مستقل مزاج ٹک ٹک ٹک اب وہ دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے خود کو اس چکر کے سپرد کر دینے والے ہیں۔

یہ وقت میں چاہے آگے لے جائے چاہے پیچھے۔

☆☆☆

"تم زندگی میں غلطیاں کرنے سے ہمیشہ ڈرتے ہو اور غلطیاں دہرانے سے تو قطعی طور پہ...... پھر اس لڑکی کے لیے اپنے اصول توڑنے کا مطلب؟ پچھلی بار کا بھول گئے؟"

ڈرائی فروٹس کی چوپنگ کرتے رئیس کے ہاتھ تھمے۔

"خدارا کچھ دیر کے لیے چپ رہو۔ تمہیں خبر ہونی چاہیے کہ میں جلدی میں ہوں۔ مجھے یہ ڈیزرٹ آنٹی کی دوست کو بھجوانا ہے۔ پھر ماہا انتظار کر رہی ہوگی اور وہ جلد ناراض ہونے والوں میں سے ہے۔" آئس کریم باؤل میں تہہ جماتے وہ جھنجلا بھی رہا تھا۔

"ایسی جلدی تم نے اپنے اندر بھی مچا رکھی ہے رئیس خان زادہ...... کچھ دیر کو تھم کیوں نہیں جاتے۔ اس ماہا کے علاوہ کوئی اور انتخاب بھی رکھ سکتے ہو نظر میں۔"

رئیس نے چونک کر کاؤنٹر پہ جمے اس بے نیاز بارہ تیرہ سالہ وجود کو دیکھا جو پچھلے کچن میں کھلتی کھڑکی کو ترچھی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ رئیس نے اس کی نظر کی پیروی کی۔ کرنل صاحب کی پوتی، املی کے درخت سے لٹکے ٹائر پہ سر نیچے کیے ٹانگیں اوپر دھیرے، دھیرے دھیرے جھول رہی تھی۔

رئیس نے سر جھٹکا۔ وقت اس کے گرد گھوما۔ کسی ماہر بیرے کی طرح ایک منظر سامنے لا دھرا۔

اس دن دعوت پہ...... اس نے دیکھا، اتنا بیبہ کا نیکلس...... جانے کیوں وہ چپ رہا۔ اسے اس لڑکی سے خوف آیا۔

دو دن بعد...... گملوں کی ہفتہ وار صفائی کے دوران۔ اس نے سنی پیادہ فوجوں کے پیروں کی سی دھمک اور افراتفری۔ وہ اوپر کو بھاگا۔ مسز کرنل زرد ہوئی ٹیرس کو دیکھتیں۔ ملازم بھاگ رہے تھے کرنل صاحب دھاڑ رہے تھے۔ گہری سبز آنکھوں اور اسپگیٹی سے سرخ بالوں والی خوب صورت لڑکی اپنی کٹی پھٹی جینز اور کھلے گلے والی شرٹ میں بازو کھولے ٹیرس پہ کھڑی تھی۔

"یہ تو کیٹ سے بھی اوپر کی چیز ہے باس۔ ٹائی ٹینک والوں سے مجرمانہ غلطی ہوئی ہے۔ اسے نہ لے کر۔"

اذہان کی آواز کہیں سے کان میں آئی۔ اور وہ خوب صورت چہرے والی نے خود کو ٹیرس سے نیچے لڑھکا دیا۔

سب نے چیخنا چاہا اور کامیاب ہوئے۔ ہوا میں لڑکی کے وجود نے زاویہ بدلا اور دائیں طرف کے سوئمنگ پول میں جا گری۔

سب کی سانس بحال ہوہی جاتی گر وہ سطح آب پہ آجاتی۔ وہ پیندے میں پڑی تھی۔ ملازم پھر سے

متحرک ہوئے۔ لڑکی کے ہونٹ نیلے ہوئے۔ ہاتھ پاؤں حرکت میں آئے۔ ملازموں نے بمشکل باہر نکالا۔ تو کیا یہ خودکشی کی کوشش تھی؟ مگر کیوں؟

بھلا اتنی اچھی شکلیں، ماں باپ کی بے تحاشا دولت بھی مرنے دیتی ہے۔ ہر کوئی اپنی راہ چل دیا۔

ساری لین کے ملازموں نے اجلاس کیے۔ چٹخارے بھی لیے۔ بیگمات کے لیے اتنی کشش نہ تھی۔ توجہ بٹورنے کے نوجوانوں کے طریقے۔"

وہ سب چونکیں جب اگلے ہفتے وہ جنت سے نکالی گئی حور سی لڑکی، ٹیرس کی ریلنگ میں پاؤں پھنسا کر سر نیچے لٹکائے مرنے کے قریب ہوگئی۔ آنکھیں خون رنگ ...... چہرہ خون جمنے سے داغ زدہ۔ پچیس منٹ تک وہ یونہی لٹکی رہی تھی مزید لٹکی رہتی اگر ملازم نہ دیکھ لیتا۔ رئیس کو اس سے مزید خوف آیا۔ "کوئی اتنا بہادر بھی ہوسکتا ہے؟ بے وقوفی کی حد تک ...... بہادر۔"

رئیس سر جھٹک کے "حال" میں لوٹا۔ ہولے سے بڑبڑایا۔

"کوئی اور چوائس؟ دادا کہتے ہیں کہ کم از کم محبت کرتے ہوئے انسانوں کی طرح چوائس نہ دیکھو...... صرف تکمیل کرو اور اس ۔ کے معجزے دیکھو۔ فرشتوں کی طرح۔ ویسے بھی وقت میرے لیے چوائس تو رکھتا ہی نہیں۔"

"تو رئیس خان زادہ کے مطابق اسے ماہا ادریس سے محبت ہے۔" کاؤنٹر سے چھلانگ مار کر وہ اس کے پہلو میں آن رکا۔

"کم از کم آثار تو یہی ہیں۔" رئیس نے گردن ڈھلکا کر تنقیدی نظروں سے ڈیزرٹ باؤل کو دیکھا۔ پھر چاکلیٹ کو کیز کی ترتیب جمانے لگا۔ خالد آ گیا۔

"رئیس بھائی! بیگم صاحبہ گاڑی میں بیٹھ گئی ہیں۔"

رئیس جلدی سے ہاتھ چلاتا۔ ڈیزرٹ کینٹینر میں رکھنے لگا۔ صفدر کو روانہ کیا۔ بچے ہوئے آمیزے سے ماہا کے لیے باؤل تیار کرنے لگا۔ وہ سرور آگیں آواز میں قرآن پڑھنے لگا۔ باؤل پکڑ کے جانے کو مڑا...... قدم رکے نگاہ مڑی اور دکھ سے بھر گئی۔

لڑکی کا ٹائر سے نیچے لٹکا سر، سارا خون آنکھوں میں دھکیل بیٹھا تھا۔ اتنی اذیت پسندی وہ منجمد ہوگیا۔ کون سا دکھ ہے جو اس کی نسیں چھید رہا ہے؟ کون سا لمحہ ہے جو اسے جینے نہیں دیتا؟ وہ سبز پوشاک اوڑھے بزرگ سے املی کے درخت کی طرف بڑھتے اپنے قدم روک نہ پایا۔

"السلام علیکم مس ہالہ......!" وہ جھٹکے سے اٹھی...... آواز اسے پاگل کرتے شور کی دنیا سے غلام کر کے واپس لائی تھی۔ گہری خاموشی ...... پرندوں کی سرگوشیاں پتوں کا سفر ......خزاں جوبن پہ تھی۔ ہر جگہ پتے اور ٹہنیاں ہوا کے عشق میں پاگل اس کی پیروی پہ قائم۔

سیاہ ٹراؤزر گرے فل سلیو شرٹ ...... سیاہ سویٹر چہرہ بھی لباس سا...... یعنی عام۔

"وہ میں یہ آپ کے لیے لایا تھا۔ میٹھے میں شفا ہے۔ یہ دل کو سکون دیتا ہے تب ہی اللہ نے جنت کی سب سوغاتیں میٹھی رکھی ہیں۔ یہ آپ کو یقیناً اچھا لگے گا۔"

ہالہ اسے دیکھتی رہی۔ "کون ہو تم؟" الفاظ سانپ کی سرسراتی پھنکار سے، آنکھیں سرد خانے میں دھری لاش ہی...... یعنی منتظر۔

رئیس خان زادہ لفظی تیر اندازی کا مشّاق تو کبھی نہ رہا تھا۔ اب تو مقابل بھی تقریباً بہرہ تھا۔

"جی ...... وہ، وہ میں۔" ہونٹ چپک چپک گئے کہ وہ تو کچھ نہ تھا۔

"جاؤ، یہاں سے بدتہذیب انسان!" فرعون سا لہجہ...... وہ پلٹ گیا۔ املی کے تنے کے ساتھ باؤل دھرا تھا اور جھولا پھر سے رواں تھا...... سبک سا۔

☆☆☆

اس دن میں امریکن سٹی سنٹر اسکول کی عالی شان پتھریلی عمارت کے ستون سے ٹیک لگائے، اپنا گلابی بیگ گود میں دبوچے بیٹھی تھی کہ نخریلے امیر زادوں کا ٹولہ قہقہے لگاتا میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑا ہوگیا۔ اور ان سب کا باپ......

"دوستو...... ویڈیو تو تم لوگ دیکھ ہی چکے۔ اب

بتاؤ اس "ممی کم ڈومبی" سے تعزیت کی جائے...... یا تعزیت ہی کی جائے۔" ٹیڑھے میڑھے ہیر اسٹائلز، آدھے ادھورے لباس والے "ہالی ووڈ پیسز" قہقہے لگانے لگے۔

"چہ چہ چہ...... مجھے ہمدردی ہے تم سے اور تمہارے ابنارمل والدین سے بھی۔" میں خود کو دیکھ نہیں سکتی تھی مگر یہ محسوس کر رہی تھی کہ میرے بدن کا سارا خون ہولے ہولے میرے چہرے پر جمع ہو رہا ہے۔

"اچھا کیا تھا وہ...... ہم م م م...... ذلیل عورت آہ...... آؤچ۔" وہ اداکاری کرتا اس کے قریب سیڑھیوں پہ ڈھیر ہوا۔ اپنے اسنیکرز سے اس کی پنڈلی مس کی۔ وہ سمٹی۔

"اب میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ کل کون سا منہ لے کر آفس جانا۔" ہاتھوں کی ملامتی قینچی سے اس کے سرخ گھنگھریالے بال کاٹنے لگا اور قینچی اس کے بالوں میں پھنسا بیٹھا۔ نکالنے کے چکروں میں اس کے بال بری طرح بکھرے۔ اس کے دوستوں کے قہقہے بھی۔ مجھے لگا میری پتھر آنکھیں پھوٹ پڑیں۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دو...... ڈینی۔" میں پنجوں پہ زور دے کے اٹھی۔ ننھا گلابی بیگ اس کی گرفت میں آ گیا۔

"ڈینئیل کلارتھ کہو...... اسنو وائٹ۔ ابھی ہم اتنے بے تکلف نہیں۔"

"ڈینی ڈیئر...... اس کی مام کیسے جبڑے نچا نچا کر بولتی ہیں؟" سارہ پیٹرسن نے اس کی جیکٹ پہ انگلی پھیرتے، لاڈ سے فرمائش کی۔

"اوہ ہاں......" وہ بھی جوشیلا ہوا۔

"ڈیک کتے...... میں تمہاری اس بلی کو لے جا رہی ہوں۔ بھونکنے سے فارغ ہو جاؤ تو آ کر لے جانا ورنہ کسی گاڑی کے نیچے دے ڈالوں گی اسے۔"

وہ ممی سے بھی زیادہ ممی لگا تھا مجھے۔ میں آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ڈھانپتی اندھا دھند بھاگی۔ گلابی بیگ...... میرا خزانہ اس شیطان کی ہتھیلیوں میں دبا رہ گیا۔ رات میں کلارا کے سامنے ڈٹ گئی۔

"میں اب اس اسکول کبھی نہیں جاؤں گی۔"

گھٹنوں تک آتی اسکرٹ پہنے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے گردن اکڑائے نیوزی لینڈ کی مہنگی ترین کافی کے کپ چڑھاتے اپنے ٹوٹے رشتے کا سوگ مناتی کلارا ڈیک نے مجھے حیرانی سے دیکھا تھا۔

☆☆☆

سمیعہ کو اس کے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور نہ ہی رئیس سے دشمنی کی کوئی وجہ ہی نظر آتی...... مگر وہ رئیس کو دیکھتے ہی عجب تناؤ کا شکار ہوتیں اور یہ تناؤ وہ کسی بھی طرح رئیس میں بھرنا چاہتی تھیں۔

او لیولز کے بعد رئیس نے عام سے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور سادہ مضامین پڑھنے لگا۔ سمیعہ آنٹی نے ہر خاندانی تقریب میں پیشن گوئیاں داغنی شروع کر دیں۔ وہ کڑھنے لگا...... گھٹنے لگا۔

ایک دن آنٹی نے شاہ میر کے دوستوں کے سامنے، کان مروڑتے ہوئے اسے ڈرائنگ روم سے باہر نکالا اور سرونگ کا حکم دیا۔ وہ ٹوٹ گیا۔ اس ساری رات اسٹور روم میں سسکیاں گونجتی رہیں۔ اگلے دن دادا کو فون کر دیا۔

"مجھے آپ کے پاس آنا ہے دادا۔" دادا نے دوسری بات سننے سے پہلے فون بند کر دیا۔ اس نے پہلی بار بدمزہ کھانا بنایا۔

"کیا میں ابا کو کال کروں؟" وہ تین دن تک خود سے مباحثے کرتا رہا۔ پھر نانا اس کا ٹکٹ لے آئے جو دادا نے بھیجا تھا۔ وہ ہر دکھ بھول گیا۔ اذہان بولا۔

"کیا آپ اب بھی نہیں آؤ گے؟"

وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔ سب کے چہروں پہ طنز بکھرا اور وہ گاڑی میں جا بیٹھا۔

☆☆☆

اس کے سامنے بیٹھی وہ بڑے پروفیشنل انداز میں اس کی کامیابیوں کی فہرست گنوا رہی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھتا تھا۔ کندھوں تک آتے سنہرے سیدھے بال۔ نیلگوں آنکھیں۔ اٹھتے کناروں والے ہونٹ، فارمل ڈریس اپ۔ ہاتھ میں پکڑے پین کو ہیجانی انداز میں صوفے سے ٹکراتی وہ عوام کو اس کی زندگی

کے وہ گوشے بھی دکھا رہی تھی جو اس کی نظر سے بھی شاید ہی گزرے ہوں۔ وہ حیران ہوتا۔ کیا یہ سب واقعی وہ ہے؟

دنیا کے چند سوشل سائنٹسٹس میں سے ایک......

سماجی فلاسفر، مہنگا ترین پروفیسر، کامیاب بزنس مین۔ آہ...... آنکھوں میں چبھن ہونے لگی۔ تو بالآخر وہ ''کچھ'' ہے۔ وہ حال میں لوٹتا ہے روشنیاں ویسی ہی چکا چوند ہیں اردگرد لوگ ویسے ہی متحرک۔ وہ سامنے پڑے لیپ ٹاپ پہ انگلیاں چلاتے اب سوالات کی اجازت چاہ رہی تھی۔ پہلا سوال کرتی ہے۔

''اتنی کامیابیاں...... فلسفے میں اتنا نام، میٹافزکس میں شاندار کامیابی کیسا لگتا ہے؟''

''معذرت چاہتا ہوں مجھے کبھی نہیں لگا کہ میں کوئی نامی فلاسفر بن گیا ہوں۔''

فلاسفر کوئی بھی نہیں بننا چاہتا۔ آ۔ .دنیا کے ہر بچے سے پوچھ لیں کوئی ایک بھی نہیں ہے گا کہ وہ فلاسفر بننا چاہتا ہے...... تو پھر ایسے گمنام عہدے پہ زعم کیسا؟...... ہاں ''کچھ'' بننا ہمیشہ سے چاہا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو ناکام ہے تو اس بات نے میرے حوصلوں کو کھینچ کر مزید طول دیا۔''

وہ مسکرایا تو وہ بھی مسکرائی ...... لاجواب ہوئی پھر اگلا سوال پوچھا۔

''آپ ہمیشہ یہ کہتے نظر آئے کہ انسان کا سب سے بڑا سماجی مسئلہ ...... منطق اور معقولیت کی غلط پہچان ہے...... کیسے؟ وضاحت کریں گے؟''

ہوا کے سپرد ہوتی ان آوازوں سے دور کسی نے اس سوال کے جواب کو ''نتیجے'' کے ہیجان سا سنا تھا۔

☆☆☆

اس دن عکاشہ کی دوستیں آ گئیں۔ ایسی دوستیں جو دوست کا کھلا کھلا گلابی رنگ دیکھ کر بے ساختہ کہتی ہیں۔

''اوہ یار! کیا ہوا؟ تم اتنی پیلی پیلی سی کیوں ہو رہی ہو؟ ٹھیک تو ہو جانی؟''

اور دوست اچھی بھلی سے یرقان زدہ ہو جائے۔ ایسی دوستوں کے لیے کھانا بنا کے وہ ابھی اپنے ٹھکانے پر پہنچا ہی تھا کہ نانا چلے آئی۔

''اوئے کھوتیا۔ آج کل تو گھوڑا بننے کی تیاری کچھ زیادہ ہی نہیں کر رہا، میرے سارے جوتے مک (ختم) گئے۔ پالش تیرا پیو کرے گا یا دادا؟'' اس نے خود میں سانپ سی پھنکارتی تھکن کو صبر کی لاٹھی سے پیٹ کے نانا سے کہا۔

''میں قطعی بھول گیا تھا۔ معذرت چاہتا ہوں نانا۔ ابھی کر دیتا ہوں۔''

نانا ___ حسب روایت ''ہونہہ'' کہہ کر لان کی جانب چل دیے۔ اس نے جوتے اکٹھے کیے اور پچھلے صحن کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔

خزاں کا موسم آئے دو چاند ہو چکے تھے اور سرما ہلکی انگڑائیاں لیتا بیدار ہونے کو تھا۔ درخت پرانی پوشاکیں اتارنے کی تیاریوں میں تھے اور پودے ابھی مزاحمت دکھاتے تھے۔ وہ آلتی پالتی مارے جوتے چمکانے میں ساری توانائیاں لگا رہا تھا۔ لب حسب عادت خود کار طریقے سے ہلنے لگے۔

''تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا۔'' (الزلزلۃ آیت 8-7)

''کون ہو تم؟ اور یہ ابھی کیا بول رہے تھے؟'' مسز کرنل کی باڑھ کے پار وہ موتیے کی مورت نگاہیں مرکوز کیے کھڑی تھی۔

''میں بول نہیں رہا تھا۔ تلاوت کر رہا تھا قرآن کی۔'' رئیس نے دوسرے سوال کو پہلی ترجیح پر رکھا۔

''مسلمانوں کی پاک کتاب؟'' وہی امریکن لب ولہجہ۔ ہاتھ سے باڑھ ہٹا کے وہ چند قدم آگے آئی۔

''ٹھیک ہے، مگر اس کا مطلب کیا ہے؟'' وہ وضاحت کرنے لگا۔

جینز کی جیبوں میں ہاتھ گھمائے، جاگرز سے پتے مسلتی رہی۔ بنا کوئی تاثر دیے مگر وہ تندہی سے وضاحت کرتا رہا۔ شاہ میر ادھر آن نکلا۔

''رئیس...... او پیارے...... ذرا جان لگا مجھے

کیونکہ نہیں چمکتا کاربن سا جوتا پہننا اچھا لگتا ہے۔ سمجھ گیا اصغریٰ بیگم اور بھی وارڈروب کے پیندے بھی کھنگال لیا کرو ورنہ سمندری کائی لگ جاتی ہے وہاں تیری وجہ سے۔"

سکندر اعظم سی رعونت لیا لہجہ۔ وہ تھا بھی اتنا ہی شان دار۔ رب نے جس سانچے میں اسے بنایا تھا۔ وہ سانچہ تو پھر توڑ ہی ڈالا ہوگا تب ہی کوئی ایسا نہ دکھتا۔ سی ایے کے فائنل ایر میں تھا۔ ذہانت تو شخصیت کی دربان تھی۔

"میں...... کردوں گا۔" شاہ میر کی نظریں اٹک گئیں۔

"او ہیلو...... مس ہالہ کیسی ہیں؟" ہالہ نے قطبین سی سرد آنکھیں موڑیں۔

"یہ...... وہ شاہ میر......" رئیس نے تعارف چاہا۔

"میں تم سے کچھ کہہ رہی تھی۔" شاہ میر خفت سے پلٹ گیا۔

"مجھے یہ کہنا تھا کہ تمہاری آواز میں کچھ ہے...... کچھ ایسا جو بہت سی آوازوں میں مجھے چونکا گیا ہے...... جیسے جیسے...... مجھے نہیں معلوم......" وہ شہتوت اور سنبل کے پتوں پر پاؤں دھرتی واپس مڑ گئی۔ پتوں کے مسلنے سے آواز ابھری۔ سرگوشیوں سی آواز...... جیسی ہمالیہ کی کوکھ میں پلتی وادیوں میں قیامت خیز زلزلوں سے پہلے ابھرتی ہیں۔ سرگوشیاں ہوا کے ذروں کو پھلانگتے ہوئے اس تک آئیں۔ بانہیں اس کے گرد ڈالیں۔ بائیں جانب سے اس کی پشت پر لپٹ گئیں۔

ہونٹ اس کے کان سے لگائے۔

"خبردار رہنا...... خبردار......" وہ کندھے جھٹک کر سرگوشی سے آزاد ہوا۔ مڑ کر ساتھ بیٹھے وجود کو دیکھا۔

"میرے پاس تو کھونے کو کچھ بھی نہیں۔ پھر کیا خبردار رہنا۔" وجود میں ہنسی پھوٹی۔

"دادا کہتے ہیں ناں وقت کھونے کو کچھ نہ کچھ جھولی میں ڈالے ہی رکھتا، چاہے وہ کوئی تسلی...... کوئی دلاسا...... کوئی خواب ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے خود کو کبھی خالی ہاتھ نہ سمجھنا۔"

وہ مڑ کے اسے دیکھتا رہا۔ سنبل اور شہتوت کھونے کو نیا وجود تیار کرتے رہے...... نئے پتے......

☆☆☆

نیا اسکول، نئے چہرے...... سمجھو نئی ابتدا۔ سٹی سینٹرل کے شیطان اپنی شکلیں لیے گم ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ زندگی ایسی ہول ناک بھی نہ تھی، جتنی میں تصور کیے بیٹھی تھی۔ جتنا میں اسے محسوس کرتی تھی۔ میرا محسوس کرنا بھی عجیب تھا۔ مجھے بڑی بڑی باتیں محسوس نہ ہوتیں اور چھوٹی چھوٹی باتیں مجھ میں پیوست ہو کے رہ جاتیں۔

میں اپنے ماں باپ کی خودغرض بے حسی پر سر جھٹک کے ویڈیو گیم کھیل سکتی تھی مگر کھڑکی پر پنجے مارتی بھوکی بلی...... مجھے سرد ترین راتوں کو مرکزی دروازے سے باہر لا کھڑا کرتی۔ ویسے ہم سب انسان ہی ایسے واقع ہوئے ہیں۔ ہم اپنے کمرے کے سب سے ناقابل توجہ کونے میں پڑے بھدے اور بوسیدہ گل دان کا پانی جگہ سے ہلنا محسوس کرلیں گے مگر ایک ہول ناک رفتار سے حرکت کرتی زمین پر ہلکی سی توجہ بھی نہ دے پائیں گے۔

بہرحال مجھے زندہ ہونے کا احساس اپنے نئے اسکول میں ہوا جہاں مجھے زندگی کی پہلی دوست ملی۔ زونی سارو۔

اس دن اسکول میں رنگوں کا میلہ سجا تھا۔ کارنیوال کی طرز کا بڑا میلہ۔ ہر کوئی سولہویں صدی کا لباس پہنے۔ ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکریاں تھامے، خوش باش و بے فکر نظر آتا۔ ممی نے مجھے ہلکے گلابی رنگ کی بے تحاشا پھولی فراک دلائی۔ مجھے میرا گلابی بیگ یاد آیا۔ زندگی میں کچھ چیزیں جتنی غیر ضروری ہوں، اتنی اہم ہوتی ہیں۔

میں ہالیڈے گرامر اسکول کے سبز سنگی فرش کو اپنی فراک سے پونچھتی یہاں سے وہاں پھرتی۔

ستونوں کے پیچھے...... آبشار کے پاس...... اسٹریٹ ڈانس کرتے ایک گروپ کے گرد۔

مجھے اپنی ایڑیوں میں اٹھتے درد کی پروا نہ رہی۔ صرف خوشی تھی اس بات کی کہ اب میری بجی زندگی کی ویڈیوز اسکول کے ہر بچے کے ٹیبلٹ میں نہ ہوں گی۔ کوئی میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے مسل مسل کر سرخ کرتے ہوئے یہ نہ پوچھے گا کہ بولو سب کے سامنے کہ ہم دوست ہیں۔

''ہونہہ ڈینی...... !تم جہنم کے آخری کونے میں پڑے رہ گئے۔ اب دیکھو میری جنت کتنی خوب صورت ہے۔''

مجھے واقعی لگا کہ اس دن اگر میں اڑنا چاہتی تو اڑ بھی سکتی تھی۔ اس دن یقیناً ساؤتھ افریقا کے پہاڑ میری تسخیر کے منتظر ہوں گے۔

تھک گئی تو اوروں کو دیکھنے لگی۔ بھول گئی تھی کہ اکیلی نہیں ہوں۔ سب کے لباس شاہکار تھے مگر...... سامنے کھڑی سیاہ فام لڑکی کے کندھے کا بروچ۔ بہت نفیس، قیمتی سا بروچ۔

''بروچ...... تمہیں کسی فارمل ڈنر پر تھوڑی جانا ہے۔''

ممی کی آواز میرے سامنے تن کر آن کھڑی ہوئی۔ انکار کی چبھن کا فگار بڑا مہلک ہے۔ میرے قدم آواز کو چیرتے اس لڑکی کی طرف بڑھے۔

''ممی مجھے بروچ پسند ہیں۔ سمجھتی کیوں نہیں۔''

لڑکیوں کا گروپ جوش وخروش سے نظم گنگنا رہا تھا۔

میرے ہاتھ لڑکی کے کندھے پر ٹکے۔ انگلیوں کے ناخن بروچ کے پیندے سے مس ہوئے اور میں جھٹکے سے مڑی۔ نہیں مجھے موڑا گیا۔ گھبراہٹ سے میں یقیناً اس لڑکی کے لباس سی زرد ہوئی جو میرے سامنے مسکراہٹ لیے کھڑی تھی۔ سیاہی مائل رنگت، بالکل چھوٹے، دو انچ جتنے بال...... سر کی جلد تک نظر آتی ہوئی۔ بے تحاشا سوجے ہونٹوں پر سجا شاکنگ پنک گلوس، میں مسکرا بھی نہ سکی۔

''ہائے دوست۔ میں زونی سارو۔ تمہارے ہی بیج سے۔'' میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کو ہلکے سے مس کیا۔

''کیا تم میرے ساتھ انجوائے کر سکتی ہو؟''

میری مسکراہٹ پر اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ یوں زندگی سب سے بڑے بدلاؤ کی طرف بڑھ گئی۔

زونی نے مجھے اسکول کے وہ حصے بھی دکھا دیے جو میں سارا سیشن نہ دیکھ پائی۔ اپنے دوستوں سے ملوایا جو مجھے ڈینی کے دوستوں سے امیر اور شیطان لگے۔ اب وہ اسٹریٹ ڈانس گروپ کے ایک لڑکے کے ساتھ قدیم کا مبوڈانس کر رہی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار پچھلی داڑھوں کو روشنی دکھائی تھی۔ ایڑیوں پر اٹھ اٹھ کے تالیاں بجائیں۔ اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہوگی؟ جب ہم گھروں کو جانے کے لیے نکلے تو زونی نے میرا ہاتھ پکڑا۔ مڑنے پر بولی۔

''تم بہت خوب صورت ہو کیلے زیک! اتنی خوب صورت کہ لوگ تمہارے حسن پر سینکڑوں ایسے بروچ وارنے کو تیار ہیں۔ جسے تم چوری کرنے والی تھیں۔''

میں نے بے ہنگم سا دھک دھک کرتے دل سے، اس کے سگریٹ کے دھوئیں میں خود کو ختم ہوتے پایا۔ اس کا چہرہ دھوئیں سے اٹ گیا۔ شاید میرا بھی...... پھر اس دھوئیں نے میرا چہرہ بدل دیا۔

☆☆☆

وہ فرانس چلا آیا تھا۔ دادا کے پاس۔ دادا ایک وادی کی گود میں فخر سے سجے گاؤں 'نیں' میں رہتے تھے۔ گھر قدیم فرانسیسی گھروں سا مثلث نما تھا۔ پہاڑی ٹیلے سے دیکھنے پر، اپنی اخروٹی لکڑی کے ڈھانچے کی بنا پر آئس کریم کون سا دکھتا۔ تکونی چھت سے ڈھائی فٹ اونچی چمنی سے دھواں ہمہ وقت نکلتا۔

گھر کے سامنے، ربڑ کا سا برگد نما درخت تھا۔ آگے دادا کا انگوروں کا باغ، کنکریٹ کے مضبوط ستون اور کاپر کی تاروں پر لپٹی، کئی میل تک جھاگ سی پھیلی بیلیں۔

بیل دینے پر انتظار کرنا پڑا۔ دروازہ کھلا۔ پھر دادا گھیرے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس، ہاتھ میں پینٹ برش اور چہرے پر کئی دھبے لیے کھڑے تھے۔ اسے دیکھتے ہی خود سے لپٹا لیا۔ رئیس نے گہری سانس لی اور ایسے لگا۔ یہ سانس جانے کب سے اندر دہائیاں دیتی تھی اور اسے یہی گود چاہیے تھی اپنے اخراج کے لیے۔ ایسی سانسیں ہر کسی کے اندر ہوتی ہیں۔ کوئی ہمدرد تلاشتی۔

دادا اکیلے رہتے تھے۔ باغ کی رکھوالی کے لیے دو ملازم تھے۔ دادا کسی ترسی ماں کی طرح اس کے گرد چکر کاٹتے۔ اس کا چہرہ ٹٹولتے۔ زبردستی نوالے بنا بنا کے کھلاتے۔

''تھکن کا پہاڑ۔'' ہولے ہولے کم ہونے لگا تھا۔ رئیس بہت خوش تھا۔ وہ بات کم کرتا۔ دادا کو اچھا سامع میسر آ گیا۔ وہ دنیا کے ہر چھوٹے بڑے فلسفہ نگار اور اس کی تصنیف پر بول سکتے تھے اور بولتے بھی۔ اچھا کھانا پسند کرتے تھے۔ ان کی رسوئی کا ایندھن کبھی دھیما نہ پڑتا۔ رئیس کی وراثت تھا یہ شوق۔ وہ کافی کی مقدار جسم میں خون سے بھی زیادہ دیکھنا چاہتے۔ قدرت سے مقابلہ کرتے ہوئے کافی پیتے۔ ہاں مگر رئیس کو کچھ کھٹکتا۔ تیسرے دن دادا سے بولا۔

''دادا! جائے نماز کہاں ہے؟''

دادا نے چھلنی سے میکرونی چھانتے ہوئے گھوم کے اسے دیکھا۔

''تم نے میکاڈلے کا ریاستی نقشہ پڑھا؟ ایک شہزادے کو کیسا ہونا چاہیے؟ آؤ، میں تمہیں وہ کتاب دیتا ہوں۔ تم وہ پڑھو۔ تمہیں پتا ہے میرے پاس میکاڈلے کی سرکاری ''مہر'' کی ایک نقل بھی ہے۔ جن دنوں میں نے کیمبرج میں لیکچرز دیئے تھے تب حکومت برطانیہ نے مجھے اعزازیہ کے طور پر وہ مہر بھجوائی تھی۔''

رئیس خاموش رہا۔ بعد میں سارا گھر چھان مارا کوئی جائے نماز، قرآن کا نسخہ یا تسبیح نظر نہ آئی تو وہ حیران رہ گیا۔

☆☆☆

امریکہ کے امرا کی نگری۔ فیشن میں رنگ عروج سے جا ملے۔ سفید وردیوں والے ملازم روبوٹک انداز میں چلتے، آواز سرگوشی سے بلند نہ کرتے۔ جنت کا اکلوتا مالک نچلی منزل کے دائیں طرف والے آخری کمرے میں تھا۔ ڈیجیٹل لائبریری کی طرز پر بنا اسٹڈی روم۔ شاہانہ امارت۔ آرم وہ کرسی، سامنے میز پر دھری قانون کی کتابیں اور کھلا ہوا قلم۔

وہ تنہا وجود کونے میں مساج چیئر پر چت پڑا تھا۔ بند آنکھوں سے اندر اترتی شعاعوں کو محسوس کرتا اور کن پٹی کی پھڑکتی رگ کو بھی۔

اسے یاد آیا تھا کہ وہ اپنی بات کو معقول کہتا رہا اور وہ نامعقول۔ حالانکہ وہ منطق کی چھوٹ دینے کو تیار تھی اسے۔ اب سامنے اسکرین پر بولتا شخص اس سنہری سیدھے بالوں والی اینکر کو منطق اور معقولیت کا فرق بتا رہا تھا۔ کیسے کوئی سوچ منطقی ہو سکتی ہے اور معقول نہیں اور کیسے معقول پر...... غیر منطقی۔ ساری تباہیاں اسی فرق نے ہی تو پھیلائی تھیں۔

اس نے ریموٹ کا بٹن دبایا تو مساج چیئر آگے پیچھے جھولنے لگی۔ وہ مزید خود میں سمٹا۔ نیویارک کی شام، رات کی آغوش میں گرنے لگی۔

☆☆☆

''میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ سول سروسز کا امتحان پاس کر جاؤں۔ قائد اعظم لائبریری کے اخروٹی خانوں کی گرد تک میرے پوروں نے صاف کر ڈالی ہے۔ کتابوں کا ڈھیر مگر...... پڑھنے کے لیے وقت نہیں۔''

وہ رک کے ضبط کھوجتا رہا۔ وہ اپنی لین کے اختتام پر بنے پارک میں سنگی بنچ پر بیٹھا تھا۔ ماہا اور لیس اور رئیس خان زادہ کے درمیان کوکیز کا جار پڑا تھا۔ پاؤں جھلاتی لڑکی بسکٹ کتر رہی تھی۔ تب سہ پہر ڈھل کر شام ہونا چاہ رہی تھی۔ نومبر کی دھواں نما دھند ڈرڈر کر دھرتی پر اترتی، تکلف دکھاتی۔ وہ نیم دراز سا

بنچ پر سر ڈھلکائے سنبل پر بیٹھے بگلے دیکھتا۔

''تمہیں معلوم ہے ماہا! میں کتنا تھک جاتا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے......''

''مغیث! ٹھہرو...... گر جاؤ گے۔'' ماہا تیز اکتائی آواز میں چھ سالہ ماموں زاد کو ٹوکتی۔ گاؤں سے شہر، ننھیال میں تعلیم کے لیے آئی تھی وہ۔

''کیا کہہ رہے تھے تم؟'' بے دلی سے مڑی۔ رئیس نے پپوٹے دبائے۔

''کچھ نہیں...... تم پریشان ہو؟''

''کل رات میرا فون باتھ روم ٹب میں گر گیا۔ اوپر سے مامی کی صلواتیں۔ میرا سر پھٹ رہا ہے۔'' وہ سیدھا ہوا۔

''تم نے بتایا نہیں پہلے۔''

''کیا بتاتی؟'' وہ بے زار ہوئی۔

''اچھا، فکر مت کرو۔ کچھ کرتے ہیں۔''

''کیا کرلو گے؟ رہنے دو۔ تمہاری بھی تو ایک عدد مامی ہیں۔ ویسے بھی آج کل میں آئی فون ایٹ کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔''

وہ ناراض، انسان تھی...... ہر ایک سے اکتائی۔ کڑواہٹ کو منہ پر سجائے پھرتی۔ ہر کسی کو حصہ دار بھی بناتی۔

''میں کبیر سے بات کروں گا، وہ کرلے گا۔'' رئیس اکلوتے دوست کو بطور تسلی استعمال کرنے لگا۔ وہ جرمنی میں اچھا خاصا سیٹل تھا۔

''صحیح...... مان لیا۔ مغیث! چلو شام ہوگئی ہے۔'' وہ لٹھ مارتی اٹھی۔

''تمہاری کوکیز اچھی لگیں۔ بادام فلیور اور کے لگا۔'' جار مغیث کی بغل میں پھنسا کے وہ اسے ہانکتی لے گئی۔ نجانے کتنی دیر وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں دبائے، اندھیروں میں تیرتا رہا۔ سیدھا ہوا تو دوسرے کونے پر بیٹھے تیرہ سالہ وجود کو دیکھ کے گہرا سانس لیتا رہ گیا۔

''کیا تمہیں نہیں لگتا کہ میں اب ناکام ہونے لگا ہوں۔ بہت تھکنے لگا ہوں۔'' سنبل کا اک پتا ٹوٹا، اس کی گود میں گرا۔ وہ پتے کی سلوٹیں ہاتھ سے سہلانے لگا۔

''اک بات یاد رکھنا رئیس خان زادہ! جیسے پانی کی اہمیت پیاسا ہی جانتا ہے، ٹھیک اسی طرح زندگی کی لذت کا اندازہ صرف ناکام لوگ ہی جانتے ہیں۔ زندگی کی کوکھ میں کامیابیاں ہمیشہ ''ڈھیٹ'' اور ناکام لوگوں کے لیے ہی پلتی ہیں۔''

''آہ...... شاید ایسا ہی ہو بلکہ کاش ایسا ہی ہو۔'' ہوائیں افسردہ ہوکر اس کے گھٹنوں سے آلگیں۔ درختوں نے زور زور سے جھول کر اس افسردگی کے خلاف احتجاج کیا۔ تب ہی ایک آواز پکارتی اس کی سمت آئی۔

''رئیس...... رئیس برو! ایک کام تھا تم سے۔'' اذہان دھپ سے اس کے قریب بیٹھا۔

''اس لڑکی سے میرا تعارف کروادو۔ میں صرف اس کی آواز سننا چاہتا ہوں۔'' رئیس چونک کے مڑا۔ ذرا فاصلے پر وہ حنوط شدہ لاش سی لڑکی ٹانگ پر ٹانگ جمائے، گردن ڈھلکائے، ایک ہی نقطے پر نظریں جمائے جانے کب سے بیٹھی تھی۔

''اذہان یار! میری تو خود ابھی رسمی سی ملاقات ہوئی ہے، میں بھلا کیا کرسکتا ہوں۔''

''شاہ میر نے خود تمہیں اس سے گپ شپ کرتے......'' الفاظ کی ترتیب کہیں منہ میں ہی دب گئی کہ وہ دونوں کے سر پر کھڑی تھی۔

''کیا تمہارے پاس اسکیٹ شوز ہیں چھوٹے لڑکے۔ اور ہاں...... ہائے...... تم دونوں کو۔ میں ام ہالہ! ہیں......؟ اسکیٹ شوز؟''

اذہان پر جیسے شادیٔ مرگ طاری ہوا۔ رئیس نے کو بغور دیکھا۔

''میرے پاپا برانڈڈ لائے تھے ناروے سے۔ ویسے اس کے علاوہ بھی ہیں۔'' وہ قدموں میں لڑکھڑاہٹ لیے ''ہالہ'' کے ساتھ جا رہا تھا۔

اذہان ایسا ہی تھا۔ جب تیرہ سال کا تھا تو دبئی میں ون ڈائریکشن کا لائیو کنسرٹ دیکھنے کے بعد گئی

دن تک وہ اندھوں کی طرح دیواروں، ستونوں اور سیڑھیوں سے بھڑتا رہا تھا۔ آسٹریلیا میں اپنے ماموں کے توسط سے رونالڈو کا آٹوگراف والا فٹ بال اسے پانچ دن تک بخار میں جھلساتا رہا تھا۔

ابھی کچھ دن پہلے تک وہ ایونجرز کی سپر لیڈی ”اسکارلٹ جوہانسن“ کا ٹیٹو کھدوانے کے درپے تھا۔ شاید یہ عمر ہی ایسی تھی۔ درختوں کے پتے ابھی بھی فلمی سانزول دکھارہے تھے۔

رئیس سر جھکا کے مسکرانے لگا۔ اسے یاد آیا کبیر کو فون کرنا تھا۔ وہ مسڈ بیل دینے لگا۔

”رئیس خانزادہ! جو بات میں منہ سے نکالنا نہیں چاہتا، وہ خود سمجھ جاؤ تو بہتر ہے۔“

اس نے ساتھ بیٹھے وجود کو ان سنا کرتے ہوئے دوست کو رات فون کرنے کا پیغام لکھا۔ پھر گھاس پر لڑھکتے کھاتے پتوں میں منظر ابھرنا شروع ہوئے۔ ایک منظر باقی کو مات دیتا واضح ہوا۔ وہ ربڑ کے درخت کے چوڑے، چھدرے پتوں والا منظر...... منظر میں داخل ہوں تو پتوں کے نیچے کا منظر کچھ یوں تھا۔ ربڑ کی جھولتی شاخوں کو نیچے بے ترتیب وار کاٹا گیا تھا۔ نیچے میز پر چیس کی بازی جمی تھی۔

دو کرسیوں پر وہ دادا پوتا بیٹھے تھے۔ فارم کے رکھوالے جان کی بیوی لارا کوئی خوب صورت فرانسیسی نظم گنگناتی اپنے گوشت بھرے وجود کو بخوشی گھر کے اندر باہر اٹھائے گھومتی اور میز کھانوں سے بھرے رکھتی۔

”تمہارا باپ اور اس کا باپ کبھی صبر والے نہ رہے۔ میں تو حد درجہ حریص رہا ہوں۔ گرمیوں میں اماں آم اور سیب کا مربہ بنایا کرتیں تو گرم شیرے میں انگلی ڈبو ڈبو کر چاٹتا رہتا۔ یہاں تک کہ انگلی پر پڑا آبلہ مزید عیاشی سے روک دیتا۔“ وہ بے توقیر کر دینے والی ہنسی ہنسے۔

”یوں ایک دفعہ دادی جان نے مجھے تحفہ دیا۔ مٹی کا گلک۔ شاید صبر سینچنا چاہتی تھیں مجھ میں۔ مگر اس تھراپی کا الٹ اثر ہوا مجھ پر۔ میں مزید بے صبرا اور حریص ہوگیا۔ ہر اس ذریعہ کو لالچی نظروں سے دیکھنے لگا جس سے رقم ملنے کا کم سے کم بھی امکان ہو۔ اپنی یونیورسٹی کے دور میں بھی شاید سب سے کم ظرف میں ہی رہا۔ پڑھانے نکلا تو سب کچھ ابھی کی چاہ میں ایک یونیورسٹی چھوڑ۔ دوسری پکڑتا۔

پھر تمہارے باپ کی باری آئی۔ وہ مجھ سے دو ہاتھ آگے نکلا۔ وہ عورت اور دولت دونوں کے معاملوں میں بے صبرا تھا۔ پہلی بستر مرگ پر تھی، وہ دوسری لے آیا۔

رئیس کو چیس میں سے اپنی ماں کی ابکائیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ان ابکائیوں کے ساتھ چوڑیوں، زیورات کی چھن چھن...... اپنا رونا...... دادا کا چلانا...... پاپا کا تغافل۔ یوں اس کی ماں مرگئی۔

”خیر، اسے کون سا دکھ تھا۔ اس بدبخت نے اسے چھوڑا...... میری زمینیں بیچیں، چلا گیا ٹورنٹو، تب مجھے اپنی نسل، اپنے خون کے بے وقعت جوش کا اندازہ ہو پایا۔ پھر اگلی نسل آئی اور صبر بھی آگیا۔“ وہ مسکرائے۔ ”میرے بچے تم میری نسل کا بہترین جین میوٹیشن (جنیاتی تبدیلی) ہو۔ میں پچھلے کئی سالوں سے ارتقاء کے اس ماڈل پر کام کررہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ انسانی نسل خودکار طریقہ سے تین نسلوں کے بعد ایک ”جدید“ انسان متعارف کرواتی ہے۔ جو پچھلوں سے بہتر ہوتا ہے۔“

اب وہ رئیس خان زادہ کی آنکھوں میں جھانکنے لگے تھے۔

”جو بہتر ہوتے ہیں اپنی خصوصیات میں، جو پچھلوں کی طرح حالات سے ”فرار“ نہیں ہوتے۔ ماضی کے غار کو پتھر رکھ کر عدم کرتے ہیں۔ حال کے سینے پر تلوار گاڑھ کے فاتح بنتے ہیں اور مستقبل کی تکمیل ہاتھوں سے ڈھیلی نہیں ہونے دیتے۔“

”میں اتنا بھی صبر والا نہیں دادا! واپسی کا راستہ ایسے قزاقوں سے عبارت ہے جو میری عزت نفس، میرے خواب لوٹ لیں گے۔“

خیر...... رئیس خان زادہ یہ الفاظ دادا سے کبھی

کہہ ہی نہیں پایا کہ وہ صبر کے ساتھ غیرت بھی رکھتا ہے۔ بولا تھا۔

"دادا! اگر بیٹا باپ ہی ہوتا تو انسان کی صدیاں آج بھی لمحوں جیسی ہوتیں۔ غاروں میں رلتیں اور کچے گوشت کے لیے جنگلوں پر منتج ہو جاتیں۔ میرے اللہ کو وقت کی رفتار متعین کرنے کے لیے متفرق دماغ بنانے پڑے۔"

دادا کی تیوری پر پڑے وہ غصیلے نقش، ریس نے پڑھ لیے۔

"دادا...... مجھے...... مجھے لگتا ہے جیسے...... جیسے اللہ اور آپ......"

"تم ابھی چھوٹے ہو۔ بہت چھوٹے......" دادا نے بات ہی ختم کر ڈالی اور بالآخر اس پر عیاں ہو گیا کہ نانا اسے ملحد نسل کیوں کہتے ہیں۔ ربڑ کے چتوں سے خاموشی ریت کے جیسے سرکنے لگی۔

وہ اسی بنچ پر واپس مڑ آیا۔ شام ڈھل کر رات میں بدلنے کو تھی۔ پارک کے لیمپ پوسٹ گواہی کو تھے۔ وہ گھر کو چل دیا۔ اذہان اور ہالہ اسکیٹ بورڈ میں مشغول تھے۔ ہالہ ہوا میں اچھلتی، زاویہ بدلتی اور گر جاتی۔ مگر مگن رہتی۔ وہ گھر کے داخلی دروازے پر کھڑا مسز کرنل کو سرخ چہرے کے ساتھ ہالہ کی طرف بڑھتا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

نیویارک میں سورج آج بھی زندگی پھونکنے میں ناکام رہا مگر رات ہمیشہ سی روشن ترین، آسمان سے دیکھو تو زمین کسی پری زادی کی سیاہ پوشاک دکھتی جو زرد اور نارنجی چمکیلے پھولوں سے آویزاں ہو۔ سڑکوں پر دیکھو تو گرم لبادوں میں ملفوف لوگ۔ یوں خوش مصروف اور پرجوش دکھتے کہ جیسے مسکرانے اور سڑکوں پر چہل قدمی کرنے کو ہی پیدا کیے گئے ہوں۔

دنیا کے چند بڑے خبر نامے کے اداروں میں سے ایک وہ تھا جس سے وہ دونوں آگے پیچھے باہر نکلے۔ یہ عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ انڈر گراؤنڈ پارکنگ کے سامنے کا حصہ...... دونوں سیاہ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔

لڑکی نے اپنے سنہری سیدھے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ آنکھیں سکوڑیں اور لیمپ پوسٹ کی روشنی میں سرخ ہوتی ناک کے ساتھ اپنے جوتے گھورتے لڑکے کو دیکھا۔ کیا کوئی "آہ" میں چھپی کہانی جان سکتا ہے۔ کوئی اس لڑکی کو دیکھتا تو جان لیتا۔ وہ لڑکی کہ جس کا دل پچھلے تین گھنٹوں سے حالت مرگ میں تھا۔ کبھی تیز رفتار سانسیں بھرتا تو کبھی یوں ڈوب جاتا کہ وہ خود کو بے ساختہ ٹٹولنے لگتی۔ "زندہ تو ہوں"۔

"بہت خوب دوست۔" بالآخر "آہ" نے شروعات کی۔ داستان نے چونک کر دیکھا۔ مسکرا نہ سکا۔ وہ مزید بولی۔

"آج سے بہت سالوں پہلے جب زندگی اپنے وجود کے بارے میں بہت فکر مند تھی۔ تب میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں تم سے یہ کہوں گی۔ جتنا میں نے جانا تم اتنے بھی بے کار نہ تھے۔" دونوں کے لب بھینچی سے مسکرائے۔

"یہی سب میری طرف سے بھی اپنی یادداشت میں محفوظ کر لو۔" آنکھ سے ادارے کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

"گویا آج بھی لفظوں کے معاملے میں کنجوس ہو۔"

"نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں۔ مگر حیرانی الفاظ کی ادائیگی میں تاخیر کا سبب ضرور ہے۔" دونوں خاموش رہے۔

"اور کیسا چل رہا ہے سب؟" اب کی بار لڑکے نے قفل کو چابی دکھائی۔

"پرسکون...... شاید یہ لفظ بہترین ہے۔ تم بتاؤ؟ کوئی ریسٹورنٹ نیویارک میں کھولنے کا ارادہ ہے؟ اگر ایسا ہے تو میرے بچے خوشی سے پاگل ہونے والے ہیں۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔ مقابل وہ بھی نہ کر سکا۔

"اوہ......" گردن کی لہر کو تندہی سے دبا کے

بولا۔

"تو بالآخر۔ خاندان بنا لیا تم نے۔" سردی سے سُن ہوتے ہاتھوں کو جھٹکا اور ناخنوں کو بغور پڑھا۔ یہ سب انتہائی ضروری کام نہ کرتا تو لڑکی کا چہرہ ہار مان لیتا۔ اپنی آہ کھول دیتا۔

"میرے بچوں...... بچوں سے ملنے ضرور آنا۔ ہم انتظار کریں گے۔ ایک کال کر لینا۔" وہ اپنا کارڈ تھما کے بولی۔

"ضرورت نہیں۔ ہم پہلی فلائٹ سے واپس جا رہے ہیں۔" کارڈ اپنے اسسٹنٹ کو پکڑاتے وہ چٹانوں سے لہجے میں بولا۔

پھر اس کی ہیل کی ٹک ٹک میں تیزی در آئی تھی۔

☆☆☆

روئی سارو کی دکھائی دنیا لطیف تھی۔ ابتدائی اندرونی مخالف لہروں کے بعد سب پرسکون ہو گیا۔ پہلے بے حس تھی پھر بے نیاز بھی ہو گئی۔ لباس بدلا۔ چہرے کو رعونت سے بھرا کچھ رنگ بھی بھرا اور لیجیے بن گئی اک نئی کیلازیک۔

ممی مطمئن ہوئیں اور اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں نئے آئے مارکیٹنگ منیجر سے شادی بھی رچا لی۔ پتا چلا کہ ڈیڈ تو نئی ممی کے ساتھ ہنی مون منانے مصر بھی چلے گئے۔

وقت کی رتھ بے لگام ہو گئی اور رتھ پر سوال سال تاریخ کی سڑک پر گرتے چلے گئے۔ میں زندگی کے بیسویں سال لگی ہی تھی کہ گھر میں پھر سے پتھروں کی بارشیں آن ٹھہریں۔ ممی اور اسٹیورٹ کی جھڑپیں۔ اسٹیورٹ اچھا تھا۔ کم از کم تب تک جب تک کہ میں جوان نہ ہو گئی۔ اس کے بعد وہ مزید اچھا ہونے لگا۔ اتنا کہ زہر لگنے لگا۔ غلیظ...... ہائی اسکول ختم ہوا اور یونیورسٹی شروع ہوئے بھی دوسرا سال تھا۔ اب لگتا اسٹیورٹ بدمست گینڈے سا، بس رسیاں تڑا ہی ڈالے گا۔

یہ بات مجھے خائف کرتی۔ ڈیڈ سے رابطے کی کوشش زور پکڑ گئی مگر وہ رہے ازل سے مسافر۔ ممی کی مجھ سے ماڈلنگ کرانے کی مانگ اور اسٹیورٹ کا میری تلاش میں رہنا یا شاید کسی اچھے وقت کی۔ جانے کیوں پر مجھے لگتا ڈیڈ ہی میرا واحد حل ہیں۔

اس رات اگست کی پہلی بارش ہوئی۔ ہلکی اور کم خطرناک۔ ممی شہر سے باہر تھیں اور اسٹیورٹ گھر کے اندر۔ میرا سکون جیسے کسی بے نام جزیرے پر رخصت ہو گیا۔ میں پھر ڈیڈ کا فون نمبر ملانے لگی شاید اس بار...... فون کا بل نہ بھرنے کی وجہ سے میں مزید کالز نہ کرنے کی مجاز ٹھہرائی گئی۔ میں نے اپنا کریڈٹ کارڈ جیکٹ کی جیب میں رکھا اور کچھ ضروری کام نمٹانے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

جب وہ کتابیں لیے قائد اعظم لائبریری سے نکلا تو شام کی سیاہی میں اضافہ ہونا شروع ہو چکا تھا۔ سمیعہ آنٹی کے بھائی کے گھر پر دعوت تھی۔ سب وہیں تھے۔ رئیس فراغت پا کے کرمنالوجی کی کتابیں لینے آ گیا۔ وہ کتابیں سینے سے لگائے۔ فون پر وقت دیکھنے کو جھکا کہ قیامت ٹوٹ پڑنے والی آواز کے ساتھ گاڑی کے چرچراتے ٹائر اس کے قریب رکے۔ وہ بدکا، فون نیچے گر گیا۔

"کیا گھر چلو گے؟" ہالہ نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔

"وہ میں......" وہ فون اٹھانے جھکا۔ اٹھا تو ٹریفک پولیس موبائلز سائرن بجاتی، گاڑی کی طرف آتی دیکھیں۔ اس نے شاید قانون توڑا تھا۔

ہالہ نے گالی دی اور ریورس گاڑی بھگانے لگی۔

سڑک پہ خاصا تماشا لگ گیا۔ تیز آواز میں بجتا انگریزی گانا، ہالہ کی ہاؤ ہو۔ لوگوں کا تجسس، رئیس کا چیخنا۔ وہ دوسری تنگ سمت کو جو جم خانہ لاہور کو مڑتی تھی، کو مڑ گئی تو رئیس تیز قدموں سے ادھر کو چلا۔ پھولی سانسوں کے ساتھ اس نے ہالہ کی گاڑی کو تقریباً دوسری دو گاڑیوں پر چڑھا ہوا پایا۔ خود وہ باہر نکل آئی تھی۔ لوگوں کا جمگھٹا بڑھ گیا۔ بالوں کا اونچا جوڑا، کئی

پھٹی جینز، سیاہ کھلی شرٹ کا گلا ڈھلکنے سے سپید کندھا برہنہ تھا۔ رئیس پھر دل گرفتہ ہوا۔ وہ ضدی بچی معمولی چاکلیٹ کے حصول کے لیے قیمتی ترین کھلونا توڑنے والی تھی۔

رئیس نے چاہا کہ اسے لوگوں کی موبائل اسکرینز سے دور کردے۔ مگر وہ سر جھٹک کر کرنل صاحب کو فون ملانے لگا۔

☆☆☆

رات کسی بھٹکے عامل کے جادو سی سیاہ تھی۔ رات کے کسی پہر برفانی طوفان کا بھی امکان تھا۔ ایسے میں ہر کوئی، خود کو گھر میں مقفل کر کے سونے کے کی تیاری کر رہا ہو گا اور میں سپر مارٹ تک آئی تھی۔ مارٹ بند ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا مفلر کسا۔ لاوارث بوتل کے ڈھکن کا نشانہ لیا اور آگے بڑھی۔ گھر جانے سے بہتر بیس منٹ کی مسافت پر موجود دوسری مارٹ تک جانا تھا۔ گھر ہر کسی کے لیے عافیت کدہ نہیں ہوتا۔ میرے لیے بھی نہیں تھا۔

سوچیں میرے ساتھ سفر کرتی۔ مرکزی مارکیٹ تک گئیں پھر وہاں سے رخصت ہو گئیں۔ اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ موبائل کا بل بھرنے اور کچھ چاکلیٹ خریدنے کے بعد میں باہر نکلی تو بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ میرے قدموں میں تیزی آئی۔ مرکزی سڑک سے ذیلی سڑک مڑتے مجھے میرے کانوں نے پیچھا کرتے قدموں کا خطرہ، دماغ تک پہنچا دیا اور مجھے رک جانے کا حکم ملا۔ جسم نے جھٹکا کھا کر عمل کیا۔

قدموں کی آہٹیں بے خوف سی آگے بڑھیں۔ اب صورت یہ تھی کہ سامنے کی سڑک خالی تھی۔ دکانوں کے شیشوں پر کلوزڈ کے بورڈ نظر آ رہے تھے۔ کچھ دور یعنی چند فرلانگ دور ایک بڑی سی گاڑی کھڑی تھی۔ اور ملگجا اندھیرا، سیاہ جھلی سا تنا، مزید کچھ دکھانے سے انکاری۔ وہ پیادہ فوج سا جتھا، خود کار طریقے سے میرے گرد گھیرا ڈال کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے آنکھیں میچیں، گہری سانس لی اور ہپی لڑکے کے کندھے سے پار چند فرلانگ دور کھڑی گاڑی کو پھر سے دیکھا اور ایک ہیولا سا نظر آیا۔ نیم تاریکی میں اس کا ایک کندھا دکھتا۔ کانوں پر سجے ہیڈ فونز اور چہرہ ڈھکا ہوا ہڈ بھی۔ مسلسل ٹانگیں ہلاتا، میوزک سنتا وہ ہیولا فون پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ مطلب مدد کا کوئی موقع نہیں ملنے والا تھا۔ تاریکی میں خوف رینگنے لگا۔

ہپی لڑکوں کے لہک لہک کے بے ہودہ نظم گنگنانے تک اپنا کراس بیگ ہتھیار کی طرح سنبھال لیا میں نے۔ فون جینز میں اٹکایا اور بیگ کھینچ کے ہپی کے منہ پر دے مارا۔ وہ شہتوت کی ٹہنی سا جھکا۔ میں نے بھاگنا چاہا مگر ایک کے ہاتھ مفلر کا کونا آ لگا اور اس نے کھینچنے میں جان لگا دی۔

میں اسپرنگ کی طرح دوبارہ اسی پوزیشن پر چلی گئی۔ سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

”میری مدد کرو۔“ میں حلق کے بل چلائی۔ ہیولے کی ٹانگ ویسے ہی تھرا تی رہی۔ میری جیکٹ پھٹنے کو تھی۔ میں اندھا دھند جاگرز چلا رہی تھی۔ اب حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ پانچوں شہ زور تھے، میں اکیلی اور دور کھڑا شخص غافل۔ میں چھوٹی موٹی چور تھی۔ کوئی رسل میپا کی گولڈ بیلٹ نہیں۔

عزت داؤ پر لگی تھی جس کی حفاظت کا عہد میں نے خود سے کر رکھا تھا۔ میں اس عہد میں ہمیشہ ایمان دار رہی۔ بالآخر میں نے آخری داؤ کھیلا۔

میرا ایک پاؤں نیگرو ہپی نے دبوچ رکھا تھا اور جینز کو تار تار کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا پاؤں میں نے ہوا میں بلند کر کے اس کے منہ پر مارا۔ نتیجتاً ہم دونوں منہ کے بل گرے۔

میں نے کراس بیگ اٹھایا اور پوری قوت سے اس دور کھڑے شخص کو دے مارا۔ لڑکے پھر سے کھینچا تانی کرنے لگے۔ میرے ناخن ان کے چہرے رنگین کرنے لگے تو میں نے دیکھا میرا بیگ اس کے قدموں سے چند قدم دور گرا مگر وہ چونکا۔ ہیڈ فونز اتار کے ادھر دیکھنے لگا۔

”میری مدد کرو پلیز۔“ وہ سیدھا ہوا۔ غیر معمولی

مضبوط جسم والا آدمی۔ اس کے ہونق پن پر میرے اعصاب کھنچے۔

''او نقلی ماچو مین کی اولاد۔ تم سے کہہ رہی ہوں۔ مدد کرو۔'' وہ بے ساختہ دو قدم آگے آیا۔ لڑکے غرائے۔ وہ واپس دو قدم ہو گیا۔ دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے۔

''یہ تو بڑا چکر ہے باس۔''

''تو پھر دفع ہو جاؤ جہنم میں، یعنی شخص۔'' دل چاہا انہیں چھوڑوں اور دو چار جھانپڑ اس سانڈ کو لگا کے آؤں۔ مگر یہ چھوڑتے تو......

میں نے لڑکے کے کندھے پر اس زور سے دانت گاڑے کہ اس کی چیخوں نے آس پاس کی دیواروں میں جیسے دراڑیں ڈال دیں۔ بالآخر جیکٹ کٹ پھٹ کے اتر ہی گیا۔ اب وہ شرٹ پہ جت گئے۔ میرے حوصلے ختم ہو گئے۔

''خدارا...... مجھے چھوڑ دو۔'' التجا نکلی۔ وہ نظم گنگنانے لگے۔ چرر کی آواز سے ایک لڑکے کی جلد کٹی اور خون کی ندی بہنے لگی۔ ہیولا ایک جیبی چاقو لیے آگے آیا۔

''سب چلتے بنو گے یا پھر سب کو ہی یادگاری نشانیاں دینی پڑیں گی۔''

میں دنگ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ بھلا شیطان بھی مدد کرتے ہیں۔ میرے گرد بھاگتے قدموں کی آوازیں گونجیں تو میں چونکی۔ وہ پیتل سی آنکھوں سے مسکراتا مجھے دیکھتا اور پہچانتا۔ میں نے مفلر ڈھونڈا، لپیٹا۔ بیگ پہنا اور شکریہ کہہ کر چل دی۔

''اوئے تم نے پہچانا نہیں دوست۔'' وہی شیطانی آواز۔

''میرا ارادہ تو تمہیں اپنا رین کوٹ دینے کا تھا۔ ویسے کافی بھی ہے میرے پاس اور تمہیں گھر تک چھوڑ بھی سکتا ہوں میں۔''

''اوہ...... واقعی؟ جیسے میں جانتی نہ ہوں کہ کافی کے لیے ایک پینی بھی نہیں تمہارے پاس۔ یہ جس گاڑی سے ٹیک لگائے امارت جھاڑ رہے ہو اس کا مالک کبھی بھی آ سکتا ہے۔ اور رہا رین کوٹ...... وہ تمہیں خود چاہیے ہوگا آخر اتنی دور چل کے جو جانا ہے۔''

جوابی جملوں نے مقابل پر واضح کر دیا کہ اس بار مقابلہ برابری کا ہوگا۔ وہ حقیقتاً حیران تھا۔

''واہ مزا آ گیا۔ اتنی مدت کہاں تھیں تم؟ زبان کی دھار تو خوب تیز کروالی۔ مگر یہ افریقی شتر مرغوں کا گھونسلہ۔ کیا یہ واقعی لاعلاج ہے؟'' ابرو سے بالوں کا اشارہ۔

وہ رک گئی۔ زہریلا سا مسکرائی۔

''ویسے جسم تو بڑا ہالی وڈ مارول ہیروز جیسا تراش لیا ہے۔ مگر یہ شیطانی لہریں پھیلاتی آنکھیں...... ان کا کچھ نہ بن سکا۔ نہ ہی منہ کی بدبو کا۔'' مقابل کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔

''پھر ملتا ہوں تم سے کیلہ زیک۔''

''کبھی نہیں ڈینگل کارتھ۔'' میری جلبلاہٹ پر وہ سینے پر ہاتھ رکھتا جھکا پھر تاریکی کی چادر ہم دونوں کے درمیان تن گئی۔

☆☆☆

وہ کاغذ پر بے ربط و بے ترتیب الفاظ لکھتا جاتا تھا۔ اسٹور روم کی دیواریں بے مصرف چیزوں سے بھری پڑی تھیں اور سنگل بیڈ کتابوں سے۔ کچھ وقت پہلے کی ہل چل دھول کی طرح تھک بیٹھی تھی اور خاموش ویرانی میدان میں اتر آئی۔

شاہ میر اور سمیعہ آنٹی ڈنمارک گئے تھے۔ اب سکون تھا۔ سکون...... چاہے لمحے کے لیے ہزارویں حصے کے لیے ہی ملے۔ ہمیشہ خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

''اوئے بے دینا، کدھر ہے تو۔'' قلم گرا۔ جنرل پھینک کر وہ تیزی سے دروازے تک آیا۔

''جی نانا۔'' کوئی فرماں روا بھی ایسی عقیدت سن لیتا تو سات پشتوں کو بخش کر امان دے دیتا۔ مگر وہ ہاشم کلیم تھے۔

''کاغذوں پر لفظ یوں بکھیرتا ہے جیسے فقہ کی ساری پرتیں کھول کے بیٹھا ہو۔ پر ہے تو اپنے دادے

جیسا بے دین ہی......"

اکثر ہی...... وہ کہنے کچھ آتے اور کہہ کچھ جاتے۔

"کوئی غلطی ہوگئی تو معذرت چاہتا ہوں نانا! آپ یہاں آئیں، بیٹھیں۔"

"او چل چل۔" ہاتھ جھلا کر خود سے دور رکھا اسے۔ "تیرا نسب گنوانے نہیں آیا بلکہ کہنے آیا ہوں کہ تو جو یہاں فراغت کی گود میں چڑھا بیٹھا ہے۔ میرے جوڑوں کے درد کی دوا ہی بنا دے۔ یہ جو تیری کاہلی ہے ناں۔ تیرے سارے گن کھا رہی ہے۔ ذرا جو وقت ملا، تو اینٹھ کے پڑ جاتا ہے اپنے اس اڑن کٹھولے پر۔ میرٹ ہے تمہیں۔ نوکری تو لگنے سے رہی۔ باندر دی اولاد۔"

وہ چپل گھساتا، اذیت حلق کے خلا میں دباتا، لان میں نکل گیا۔ تیز دھار چاقو سے ایلوویرا کاٹتے ہوئے، اس نے شبنم کے قطروں میں بے تحاشا سبزہ دیکھا۔ جدھر نظر اٹھاؤ، بس سبزہ۔

☆☆☆

چھوٹی واسکٹ اور ڈھیلی چمڑے کی پتلونوں والے گڈریے۔ اپنے سرخ گالوں اور پیلے دانتوں کا سنگم لیے، فرانسیسی لوک گیت گنگناتے۔

وہ دادا کے ساتھ قریبی گاؤں سے لوٹ رہا تھا۔ ہاتھ میں کوکو بیج تھے۔ آسمان نیلے اور اودھے رنگ کا جھلملاتا آنچل دکھاتا جو کسی ملکوتی وجود کو چھو کر گلال ہو گیا ہو۔ کالے انگوروں کی بیلیں اور کچے سیبوں کی ترش سی مہک۔ دادا کی سانسیں ڈھلوان کی چڑھائی کے دوران خاصی رفتار پکڑ چکی تھی۔ وہ اسے بتاتے کہ کوکو بیج کیسے سکھائے، پیسے اور استعمال کیے جاتے ہیں وہ سر ہلاتا۔

"تم ہاشم کی طرح سر ہلانے لگے ہو۔" وہ کچھ یاد کر کے مسکرائے۔

"وہ تھا تو جماعت کا نمبر ایک بدھو۔ مگر لیکچر کے دوران سر یوں ہلاتا گویا مجھے تو معلوم ہے۔ آگے بڑھیں، کہہ رہا ہو۔ پاس ہو جاتا ہر بار۔ میرے پوچھنے پر کہتا، اللہ عزت رکھنے والا ہے۔" وہ ہنسنے لگے۔ وہ مجل ہوا۔

"دادا! ایسے کیوں ہنستے ہیں؟ عقائد ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"ایسے ہی مطلب اندھے۔ پھر دیکھو...... نوکری نہیں ملی اسے۔ آبائی زمینوں کی آمدنی کھاتا ہے اور پنجابی میں گالیاں بکتا ہے۔ اس کے اللہ نے عیجہ مجھے کیوں...... اسے کیوں نہیں دی؟"

"کیونکہ اللہ انہیں اس اذیت سے بچانا چاہتا تھا جسے آپ نے شادی کے تیسرے سال ہی جھیلا۔ عیجہ دادی کی موت۔" دادا رک گئے۔ "اللہ نے حفاظت کی ان کی، ورنہ وہ بھی آج شاہ میر سے یہی کہہ رہے ہوتے۔ اس کا اللہ، اس کا رب۔ آپ کہاں آ گئے ہیں دادا! کیوں اپنے بے پناہ شعور کو بدگمانی کی چار دیواری میں جہالت کی میخیں گاڑ کے قید کر لیا ہے؟"

وہ ششدر سے رہ گئے، مڑے۔

"آپ کو میرے ساتھ گفتگو کرنی ہو گی دادا!"

"کیا بات کروں؟" وہ پھٹ پڑے۔ "اپنے گرد نظریں گھماؤ، تمہیں بے بسی ہی نظر آئے گی، اللہ کی رعایا میں۔"

"یہ بھی ناپختہ عقائد ہی کی بدولت ہے۔ کوئی یقین کے ساتھ پکارے تو۔" وہ دوبدو بولا۔ دادا دہکتی آگ سے جا لگے۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، اس سرکاری ہسپتال کے برف کوریڈور میں، میں نے رب کو پکارا نہ ہوگا۔ میں نے جو چار کتابیں تمہیں دیں، ان کو پڑھ کر تمہیں لگتا ہے کہ عالم بن گئے۔" وہ کراہ کے رہ گیا۔ آنکھیں پانیوں کی مکین ہو گئیں۔

"اللہ آپ کے شکوے دور کرے۔" دادا چلتے رہے۔ یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور ہر طرف سبزہ ہی رہ گیا۔ فرانسیسی گڈریے نے تان لگائی۔

"اور خداوند کی نعمتیں مشروط نہیں۔ وہ خلوص سے تمہیں سنتا ہے۔"

رئیس کی آنکھ کا پانی اور شبنم کا قطرہ سارا سبزہ چوس گئے۔ رئیس ایلوویرا کی ٹوکری اٹھائے کچن میں چلا گیا کیونکہ دنیا سب مشروط ہی دیتی ہے۔

☆☆☆

میں جلد ہی اس شیطان کو بھول گئی۔ زندگی مسائل سے بھری پڑی تھی۔ اسٹیورٹ مجھے دیکھتا تو مغلظات بکنے لگتا۔ ممی فراغت ملتے ہی مجھے کسی پراجیکٹ کا بتانے لگتیں۔ ایسے میں خاموشی اندر باہر گونجنے لگتی۔

اس روز بھی برف باری ڈھیٹ مہمان کی طرح اینٹھی پڑی تھی، جب یونیورسٹی سے واپسی پر کوئی بھاگ کے میرا اہم قدم ہوا۔

''ہائے۔'' میرے ماتھے پر بل پڑے۔ اودے رنگ کے ہڈ سے چہرہ ڈھکا ہوا تھا جبکہ ہیڈ فونز گردن میں جھول رہے تھے۔

''چونکہ ایک سوال مجھے خاصا بے چین کررہا تھا، سوچا پوچھ ہی لوں۔'' خواہ مخواہ فلمی سا وقفہ دیا۔

''کیا اب تمہارے گھر ویسا کچھ نہیں ہوتا جس کی ویڈیو وائرل ہو جائے اور تمہارے چہرے پر پہلے جیسی ہوائیاں اڑ سکیں؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''اگر میں کچھ ڈھونڈ لوں۔'' میرے قدم اب رکے تھے۔

''تو یقین جانو، میں کیمرے کے ساتھ ساتھ تمہارا منہ بھی توڑنے کی ہمت رکھتی ہوں اب۔''

''آہ...... یقین مانو مدت بعد کسی کا لہجہ اچھا لگ رہا ہے۔ تمہارے یہ جرأت کے مظاہرے مجھے اتنی خوشی دے رہے ہیں، جتنی میٹروپولیس کے چیف کو تمہارے ممی ڈیڈی کے گھر چھوڑ جانے کی ہوئی تھی۔ ویسے تو میری ممی اسٹیٹ اٹارنی کا الیکشن لڑنے والی ہیں اور مجھے ان کے سیکریٹری سے مصروفیات کم اور دوستیاں محدود کرنے کا حکم مل چکا ہے مگر تمہاری بات کچھ اور ہے۔ ہم تو بچپن کے دوست ہیں۔ آل رائٹ۔ تو میں تم سے کبھی کہیں بھی پھر ملوں گا۔''

میری کچکچاہٹ اس کی بک بک کھا گئی اور اب میں گلی میں تنہا کھڑی غصہ کھا رہی تھی۔

☆☆☆

اخروٹ کی لکڑی سے بنے گھر میں اس کی بے بسی گھومتی پھرتی، بے زاری کھیلتی کودتی اور کرب حکم چلاتا پھرتا۔ خود کار وہیل چیئر پر بیٹھا گم صم وجود ہر چبھن دیتے جذبے کی اجارہ داری دیکھتا اور اپنے بہت پیارے کو ہاتھ مسلتا بھی۔ ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہ مسلسل ٹانگ جھلاتا اور پیر کا انگوٹھا، ہاتھ کے انگوٹھے سے مسلتا۔

''آپ کو معلوم ہے، میں نے اس پندرہ روزہ سفر کے آخری بارہ گھنٹوں میں کیا کچھ جھیل لیا؟ کتنا کچھ سیکھ لیا؟'' گم صم وجود بغور سننا چاہتا۔ وہ وجہ جو اس مرد کی آنکھ میں کیل جیسی گڑی تھی۔

''مکان بدل لینے سے دکھوں کو آپ کا پتا نہیں بھولتا اور خوشیاں اکثر آپ کی دہلیز بھولی ہوتی ہیں۔''

''جانے مجھے کس شے نے تندور بنا رکھا ہے۔ مجھ سے یہ درد سہا نہیں جا رہا۔ آگ لگے ایسی کامیابیوں کو۔'' وہ عراقی نوحہ کناں عورت دکھتا۔

''غرق ہوں ایسے ایڈریس جس پر بلا کے وہ مجھے اپنے بچوں سے ملوائے گی۔ میں نیویارک کی برفیلی سڑکوں کو گواہ کر آیا ہوں کہ مجھے ماضی سے غرض نہیں کہ میری پوریں تو حال کو سہل کرنے میں ہی فگار رہتی ہیں۔ مجھے وقت سے کچھ واپس نہیں چاہیے۔''

وہ ایک اڑیل مہم جو لگتا۔ ایک ضدی سپہ سالار بھی......

☆☆☆

''تم نے زندگی سیکھنی ہے؟'' بالائی منزل سے دادا کی عجب اصطلاح سنائی دی۔ دادا کے فارم ہاؤس کا بوسیدہ گودام تھا یہ۔

''اوپر آؤ...... تمہیں زندگی دکھاتا ہوں۔'' وہ پرجوش ہوا۔ لکڑی کی ذرا چوڑی سیڑھی پر پاؤں دھرتا وہ جوں ہی بالائی منزل کے نزدیک ہوا، غلیظ بدبو نے نتھنے جلا ڈالے۔

دادا قہقہہ لگاتے، ہاتھ بڑھا کے اسے اوپر اٹھانے لگے۔ پلنگ جتنے بڑے لوہے کے برتن میں گلتے سڑتے کالے انگور، عمل تبخیر کے عمل سے شراب کشید کرنے کا طریقہ۔ وہ الجھ کے دادا کو دیکھنے لگے۔

''پچھلے سال میں نے تمہیں ڈارون کے ارتقائی عمل والی کتاب پڑھنے دی تھی۔''

''جی پڑھی تھی میں نے۔'' وہ ناک دباتا بولا۔

''لب لباب یہی تھا کہ قدرت کی طرف سے ایک ایسا نظام وضع کیا گیا ہے کہ جیسے جیسے وقت بدلتا ہے، مخلوقات میں کچھ تبدیلیاں رونما ہو کے انہیں وقت اور حالات کے مطابق موزوں کرتی رہتی ہیں۔''

''جی!'' وہ اکتا رہا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے میرے بچے! زرافہ پہلے چھوٹی گردن والا جانور تھا پھر......''

''معلوم ہے دادا۔ خوراک کی کمی نے اسے گردن اونچی کر کے درختوں کے پتے کھانے پر مجبور کیا یوں لمبی گردن والے جانور آگئے اور خوراک کی کمی سے چھوٹی گردن والے مرتے گئے۔'' وہ جلدی جلدی بتانے لگا۔

''یہ تو سائنسی کہانی ہے پوتے! زندگی کی کہانی میں چھوٹی گردن والے آسانی سے مر گئے؟ لمبی گردن والے آتے ہی خود کو منوا بیٹھے ہوں گے؟'' وہ رک گیا۔ دادا کو دیکھنے لگا۔ دل دھڑکا۔ کیا سمجھانے والے ہیں وہ۔

''یہ ہے زندگی کی کہانی میرے بچے۔'' دادا نے بانہیں پھیلا کر گلتے سڑتے انگوروں سے متعارف کروایا۔

''گلو سڑو! جیسے بھی مگر اپنی ہیئت بدلو۔ جیسے بھی ہو...... چاہے خود کو ختم کرنا پڑے کرو مگر ایک عمل سے خود کو باہر نکال کے مت بیٹھ جاؤ۔ ورنہ ان باہر پڑے اکا دکا انگوروں کی طرح کھال جلا کے ختم ہو جاؤ گے اور کچھ بھی نہ کہلاؤ گے۔'' وہ ساکت دادا کو دیکھتا رہا۔

''لمبی گردن والے زرافوں نے کیا کچھ نہ سہا ہوگا۔ وہ رد کیے جاتے ہوں گے، حملہ کیے جاتے ہوں گے۔ لطیفہ بنائے جاتے ہوں گے مگر وہ قائم رہے کیونکہ وہی فطری تھے۔ قائم رہنے کو بنائے گئے۔ جب مکمل قائم ہو گئے تو سب بھول گئے، کبھی پست گردن والے بھی ہوا کرتے تھے۔ اور یہی زندگی ہے ناں؟ تسلسل...... یہی تو زندگی ہے۔ ڈھٹائی یہی تو زینہ ہے زندگی کو فتح کرنے کا۔''

وہ چند قدم پیچھے ہوا۔ دادا پریشان ہو گئے۔

''لمبی گردن والے زرافے کا تجربہ غلط تھا۔ یہی تو ڈارون نے سمجھایا تھا دادا۔'' وہ تیزی سے سیڑھیاں اترا اور گودام میں سوکھتی گھاس کو پریشان کرتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ الجھے بالوں سے بولا۔

''مجھے واپس جانا ہے دادا۔''

''کیوں اتنی جلدی اکتا گئے دادا سے۔''

''نہیں، اکتایا نہیں۔ بس سیکھ گیا ہوں جو آپ نے کل سمجھایا تھا کہ سب میں رہوں ورنہ کھال سوکھ جائے گی اور بنے گا کچھ بھی نہیں پھر لمبی گردن والے زرافوں نے بھی تو تضحیک سن کے ہی خود کو منوایا ہوگا۔''

''رئیس میری جان...... میرا بیٹا......''

''میں ناراض نہیں ہوں دادا۔'' وہ تھک کے بیٹھ گیا اور دادا نے بات ختم کر دی۔

ہاشم ولا کی بیل دباتے وہ لمبی گردن والا زرافہ بن گیا۔ بے زبان...... اکیلا...... اداس آنکھوں والا زرافہ۔

☆☆☆

یونیورسٹی فیئر (میلے) میں رنگ گنتی پھر رہی تھی۔ رونی، ابراہام کے ساتھ مصروف تھی۔ ابراہام نے قدیم طرز کے بنے زیورات کا اسٹال لگایا تھا۔ یوں میں گھومنے کو اکیلی بچ گئی۔

بڑی بڑی کھڑکیوں، دروازوں اور روشن دانوں

والے برآمدوں سے گزرتے میں قہقہوں کے سیلاب کو شور مچاتا دیکھ رہی تھی مگر یادداشت کی مشین کی کھٹ کھٹ......اف۔

تنگ کرتی میشن کو کھولنا پڑا۔ اندر کل رات والا واقعہ پھنسا پڑا تھا۔ مشین کو صحیح چلنے نہ دیتا۔ میں واقعہ نکالنے لگی تو آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔

"یہ اٹھارہ سال کی پچھلے سال ہی ہوچکی ہے۔ چاہے ماڈلنگ کراؤ یا جاب، مجھے اس کی کمائی چاہیے بس۔ تم ماں بیٹی پر لٹا لٹا کے میں تھک گیا ہوں۔" اسٹیورٹ کی شکل میں لیو اتھن اب باقاعدہ میرے گھر آگیا تھا۔ میری ماں نے پوروں پر اپنی کمائی گنوائی تو بولا۔

"بس اب اپنی کمائی سے بیٹی کو گھر بھی خرید دو۔ اس ڈربے میں میری پرائیویسی بچی رہی ہی نہیں۔ میں اپنے کسی دوست کو نہیں بلاسکتا۔ پارٹی نہیں کرسکتا۔ پچھلی کرسمس پر بھی لوگوں کو وضاحتیں دیتے گلا سوکھ گیا کہ ہماری بیٹی کدھر غائب ہے۔" وہ بلبلائے، پلے کے جیسا گھٹنوں چلتا ہمیشہ۔

"میں ڈیک سے رابطہ کررہی ہوں اور......"

ممی نے تسلیم کرہی لیا کہ وہ مجھے مزید ڈھو نہیں سکتیں۔ یادداشت کی کمشین سے آوازیں آنا بند ہوئیں تو مگن سی چلنے لگی۔ "کام ڈھونڈنا ہوگا" اور پھر......

"ہاؤ......" دل زور سے دھڑکا تھا۔ خوف سے ترتیب بھول گیا۔

اسپائیڈر مین کا ماسک اتارتے ڈینی کو دیکھتے ہی میرے ہاتھوں میں خون نہیں جہنم سی آگ دوڑ گئی۔ یہ آنا فانا ہی ہوا تھا کہ میرے مکے نے ڈینی کو ناک پر ہاتھ رکھتے جھکا دیا۔ بھل بھل خون نکلا تو میرے حواس نے شرمندگی محسوس کی۔ پھر میں نے مدد کا مرحلہ پورا کیا۔ اب وہ اور میں قدرے تکلف سے گھاس پر بیٹھے تھے۔ کافی کی چسکیاں لیتا ڈینی مجھے دیکھتا تو کبھی ناک پر رکھے رومال کی جگہ بدلتا۔ خون رس رہا تھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ دراصل خوف نے مجھے کچھ سوچنے نہیں دیا۔"

"اوہ کوئی بات نہیں کیلہ ڈیر! میں بس تمہارے مردانہ وار کا معترف ہوا ہوں۔ کہاں لوہا کوٹتی رہی ہو؟"

مجھے نہ چاہتے بھی ہنسی آگئی اور یوں شیطان پری کا دوست بن گیا بالآخر۔ ہم سڑکوں، بازاروں، دکانوں میں ٹکراجاتے تو پھر گھومنے لگتے۔ پاپ کارن یا آئس کریم کھانے لگتے۔ اسکیٹ شوز پہن کے رستوں پر ادھم مچاتے۔ اک دوجے کو دھکے دیتے، منہ کے بل گراتے پھر اپنی جیکٹ مفلر سے دوجے کو جھاڑتے۔ بال سنوارتے۔ بے تکلفی نے دنوں میں سالوں جتنا سفر کرلیا پھر ایک دن......

"ڈینی! مجھے کوئی جاب چاہیے۔" آئس کریم کون کو اپنے منہ کے سامنے جما کے میں نے کہہ ہی دیا۔

"کوئی بھی چلے گی؟" میری ہلتی گردن نے تکلف کی آخری پرت کے پار کی دنیا بھی دیکھ لی۔ بےلوث دوستی کی دنیا۔

ڈینی نے تھیٹریکل ایجنسی میں جاب دلوائی۔ مختلف روپ دھارنے کا کام تھا، دلچسپ تھا اور رقم معقول۔ میں خوش ہوگئی۔ ڈینی کو خوشی میں ڈنر کروایا اور وہ لوکل میٹرو سے مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔

"وہ حرام زادی آدھی آدھی رات گھر سے باہر رہے اور میں باؤلا کتا ہوں جو بھونکتا رہوں یا رکھوالی کرتا ہوں۔" اسٹیورٹ لحاظ کھو چکا تھا۔

ڈینی نے مجھے دیکھا اور قہقہہ لگا کے ہنس دیا۔ جانے کیوں مجھے وہ قہقہہ برا نہ لگا۔ میں ہنس دی۔ قہقہے میں حوصلہ دلاتی تسلی جو تھی۔

"میں اپنا ٹیبلٹ لانا بھول گیا، پتا بھی تھا کہ تمہارے گھر جانا ہے۔" دونوں ہنسے۔

میں اندر کو بڑھنے لگی تو ڈینی نے میرا بیگ پیچھے سے تھام لیا۔ جیب سے پین نکالا اور بیگ پر کچھ لکھ دیا۔ پھر تیز قدموں سے واپس مڑ گیا۔ اس رات میں نے اسٹیورٹ کی گالیوں کو جا گرز تلے روند کر جلدی اوپر جانا

چاہا۔ بیگ کندھوں سے اتار کر سیدھا کیا تو......

"میکنم اسٹریٹ مکان نمبر 125، نیویارک۔"

سالوں بعد میری آنکھوں نے نمکین پانیوں کی نمی محسوس کی۔ ڈینی نے اس کی رہائش بھی دیکھ لی۔ وہ گھر سے نکالے جانے کے بعد اپنی رہائش پر رہنے کی دعوت لکھ گیا تھا۔ مجھے ڈینی پھر بھی شیطان نہیں لگا۔

☆☆☆

نومبر کا اختتام یقینی تھا۔ سمیعہ آنٹی اور شاہ میر کا ڈنمارک رئیس کی آزادی کا اقرار نامہ۔ وہ پارک چلا جاتا۔ لائبریری میں وقت گزارتا یا پھر اذہان کے ساتھ ویڈیو گیمز کھیلتا۔ دماغ زندہ تھا۔ روح پرسکون...... اور اک دھند زدہ شام کو وہ زیتون میں بنی اسٹیکس، لیے مسز کرنل سے ملنے جا پہنچا۔

وہ رئیس کا گال تھپتھپاتی فرمائش کرنے لگیں۔

"گارلک بریڈ ہی بنا جاؤ رئیس! تمہارے ہاتھ کی عمدہ اور خستہ بریڈ......"

وہ برتنوں میں مصروف ہو گیا تو آواز دب گئی۔ بریڈ کا آمیزہ اوون میں رکھا۔ وقت لگا کے کچن پیپر سے ہاتھ پونچھتا باہر نکل آیا۔

"یوں لگتا ہے مدت ہوئی سمیعہ کے گھر کھانا کھائے۔" کتاب بند کرتے چشمہ اتارتے، وہ گفتگو کے لیے تیار ہوئیں۔

"اس عمر میں آرام بھی تھکا دیتا ہے اور یہاں لاڈلے نے اپنی بگڑی کی ذمہ داری دے ڈالی ہے۔"

رئیس نے محتاط انداز میں دیکھا کہ وہ بگڑی بالائی منزل کے ستون سے لپٹی کھڑی ہے۔ مسز کرنل ایک خاندانی سامع کے سامنے فاش ہونے کو تیار تھیں۔

"وہ ہے کہ سنبھلتی ہی نہیں۔ روز نیا مسئلہ۔ روز نیا ذہنی کرب۔ ہمارا بیٹا تو کبھی ہمارا تھا ہی نہیں۔ ہم سمجھ بیٹھے تھے کہ اس کی بھی ہمارے طرح اولاد نہ ہو گی اور اب یہ ہالہ...... اف۔ رئیس میری نس پھٹ جائے گی اس کافر عورت کی اولاد کو جھیلتے جھیلتے۔"

رئیس خان زادہ شرمندہ سا ہوا تھا۔ موضوع بدلنے لگا۔

"آپ ڈاکٹر کو دکھا لیتیں۔" وہ انگریزی میں پھٹ پڑیں۔

"ارے کہاں لڑکے، ڈاکٹر کے پاس جاؤں یا اس نیم پاگل کی رکھوالی کروں۔ کرنل صاحب نے سختی سے منع کیا ہے، اسے گھر سے نکلنے کو اور مجھے اس کے ساتھ رہنا ہے۔ سچ پوچھو تو خوف آتا ہے اس سے۔ نیم مردہ لڑکی ہے۔ جانے کیسی کافر ماں ہے۔ جس نے نوچ کے پھینک ڈالا خود سے دور۔ نہ دین کا علم، نہ مذہب کی پہچان، یہ لڑکی......" بالائی منزل سے گرتے شیشے کے گل دان نے سارا فرش کانچ سے بھر دیا اور مسز کرنل کی حواس باختگی ابھر آئی۔

"میری ماں کافر نہیں ہے۔" وہ چیخی تھی۔ دھڑ دھڑ کرتی وہ نیچے اتری۔ جانے کیوں لگا کہ وہ یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی۔ وہ بولنا چاہتی تھی۔

"سمجھیں آپ......" وہ ہذیانی انداز میں اردگرد کی ہر شے تباہ کرنے لگی۔

"میری ماں کافر نہیں ہے...... آپ کا بیٹا کافر ہے۔ ہر وہ شخص کافر ہے جو دنیا کی کسی منڈی میں اولاد پر "برائے فروخت" لگا کے اسے تنہا چھوڑ جاتا ہے۔ ہر وہ شخص کافر ہے جس کی اولاد تاریکیوں میں ہچکیاں لیتی ہے اور وہ بے آرامی کی ایک کروٹ تک نہیں لیتا۔ ہر وہ شخص کافر ہے جو اولاد کو الف تک نہیں سکھاتا اور زندگی جیسے بڑے کمرہ امتحان میں دھکیل دیتا ہے۔ میری ماں کافر نہیں تھی...... بس وہ روپوں کے ڈھیر لاتی رہی اور میں کہیں نیچے ہی دب گئی۔ آپ مجھ سے کیوں نہیں پوچھتیں کہ کیا ہوا تھا؟"

وہ بلک بلک کے رو رہی تھی۔ تھک رہی تھی۔ جبکہ رئیس دم بخود کو بولتا سن رہا تھا، وہ رئیس ہی تو تھا۔

"آپ کو مجھ پر ترس کیوں نہیں آتا۔ پیار کیوں نہیں آتا۔ کچھ بھی کیوں نہیں آتا۔" اس کے گلے کی خراشیں، رئیس کو تکلیف دے رہی تھیں۔ اس کی زخمی انگلیاں مسز کرنل کو پتھر کر رہی تھیں۔ باہر بارش تیز تر تھی۔

اب ہالہ اپنی سہیلیاں تھامے زمین پر بیٹھی تھی۔ بول رہی تھی، رو رہی تھی اور پسلیوں پر ہاتھ رکھے کراہ

رہی تھی۔ مسز کرنل سر ہاتھوں پر گرائے رو رہی تھیں۔
تب رئیس خان زادہ کسی ماں سی بے آرامی میں مبتلا ہو کے اٹھا کہ جس کی اولاد ایڑیاں رگڑ رہی ہو۔

وہ چپکے سے ہالہ کے قریب جا بیٹھا تھا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔ ہالہ روتی رہی یہاں تک کہ نڈھال ہو گئی۔ وہ اسے ساتھ لگائے اٹھا اور مسز کرنل کے بیڈروم میں لے گیا۔ مسز کرنل اسے تھپکنے لگیں تو وہ بندھ آنکھوں سے بولی۔

''کون ہو تم؟'' وہ خاموشی سے کھڑا رہا۔

اب وہ مسز کرنل کے مقابل لاؤنج میں بیٹھا تھا۔

''میں اس کا علاج کروں گا اور آپ لوگ اس سے پیار۔ وہ کافر عورت کی بیٹی آپ کے وجود کا حصہ خود میں رکھتی۔ آج معلوم ہو گیا؟'' گھر سے جانے کتنے بلاوے آئے تھے۔ وہ فوراً پہنچا۔

''کرتا ہوں تیرا بھی کچھ۔'' نانا بڑبڑاتے پھر رہے تھے۔ وہ تھکن زدہ سا اکیلا کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

اس رات پورا نیویارک سٹی جل تھل تھا۔ ممی بھی اسٹیورٹ کی زبان سے لڑتے لڑتے بے دم ہو گئیں تو میں نے خاموش رہنا بے وقعت جانا۔

''کیا تم بتاؤ گے کہ مجھے مزید کیا کرنا ہو گا اس گھر میں رہنے کے لیے؟ کیونکہ کمائی تو کر ہی رہی ہوں۔'' اسٹیورٹ سمیت ممی بھی میرا طنز سمجھ گئیں اور ضرورت سے زیادہ زرد بھی ہو گئیں۔

''زبان چلاتی ہو۔'' اسٹیورٹ نے طمانچہ مارا۔

''چند ڈالرز کما کر مجھے چندہ دیتی ہو جو آج آنکھیں دکھا رہی ہو۔'' وہ مجھے لاؤنج میں گھسیٹنا چاہتا تھا شاید مگر میرے گھونسے نے اسے لڑکھڑا دیا۔

''زور بازو سے کماتی ہوں، تمہیں اس گھونسے سے اندازہ ہو ہی گیا ہو گا۔''

مجھ میں جیسے آفاقی قوتیں آن بسی تھیں، جو اسٹیورٹ چپکا بیٹھا رہا۔

''اور آپ......'' میں ممی سے مخاطب ہوئی۔

''آپ ڈھونڈ لیجیے گا ڈیڈی کو۔ میں آپ سے رابطے میں رہوں گی اور اب چھوڑ دیں اس شیطان کی پوجا۔''

اسٹیورٹ نشے میں نہ ہوتا تو یقیناً معاملہ طویل تر ہو جاتا۔ یوں میں میکنم اسٹریٹ کے مکان نمبر 125 کے سامنے کھڑی تھی۔ دروازہ الجھے بالوں والے لڑکے نے کھولا، خوب صورت بلا کو دیکھتے ہی جماہی جیسے جم ہی گئی۔ میں ساکت اسے بالوں میں انگلیاں چلاتے دیکھتی رہی۔ باہر بارش نامی پانی جانے کہاں سے آتا اور کہاں جاتا رہا۔

''جون تو سو گیا ہے۔'' وہ میرا سامان ملاحظہ کرتے کہنے لگا۔

''ڈینی کو بلاؤ۔'' بے تاثر ہی رہی۔ لڑکا بری طرح چونکا۔

''پہلے قسم کھاؤ کہ تم اس کی گرل فرینڈ نہیں ہو۔ ہے کرائسٹ یہ کس قسم کا مذاق ہے یار۔'' وہ اوپر دیکھتے شکوے کرنے لگا۔

''تم بلاتے ہو یا میں تمہیں بتا دوں کہ اس ہاتھ سے ابھی ابھی میں کسی کی ناک پھوڑ کر آ رہی ہوں۔''

''کیلہ! یہ تم ہو۔'' آواز ڈینی سے پہلے دروازے تک آئی۔ میرا سامان دیکھتے ہی وہ کھلکھلایا۔

''تم مجھے بلا لیتیں میں تمہیں لے آتا اور ایک عدد ویڈیو بھی۔ بچپن کی یاد تازہ ہو جاتی۔'' وہ میرا سامان اٹھاتا، آگے چلتا بولتا رہا۔

''خدا تمہیں پوچھے لوہے کے ٹیڈی بیئر۔'' الجھے بالوں والا بڑبڑاتا کمرے میں چلا گیا۔ اب ڈینی میری طرف مڑا۔ فکر مند دکھتا۔

''ٹھیک ہو؟'' اف میں کیوں اسے شیطان کہتی رہی۔

''میں نے اسٹیورٹ کی ناک پھوڑ دی۔'' میں نے ہاتھ آگے کیا جس پر خراش تھی۔

وہ خاموش رہا پھر کچن میں گیا۔ اپارٹمنٹ اپنے چار دوستوں کے ساتھ شیئر کرتا تھا وہ۔

وہی ہالی وڈ کے بگڑے رئیس زادے۔ کافی اور سینڈوچ کھانے کے بعد میں ڈینی کے کمرے میں اور وہ سیٹنگ روم میں سویا تھا۔ یوں میں چلتے چلتے ڈینئل

کلارتھ کے رحم و کرم پر آ گئی تھی۔ میں یعنی کیلہ ذیک......

☆☆☆

لاہور کی فضا میں کچھ اور سرد پن اتر آیا تھا۔ جب وہ املی کی ٹنڈ منڈ شاخوں والے درخت کے تنے کے پاس کھڑا کہتا تھا۔

"یہ کارن سوپ ہے۔ یہ تمہارا میٹابولزم بڑھا دے گا۔ یہ پی لو۔" ہالہ اسے گھورتی۔

"تم جاؤ، یہاں سے۔" اکتاتی۔

"تم نے مانا تھا کہ ہم دوست ہیں۔"

"ہم دوست نہیں ہیں۔ اب یہ مان لیا ہے پھر؟"

"تم مر رہی ہو۔ ٹھیک...... مرنا ہی ہے تو میرے تجربے میں کچھ مدد ہی کر جاؤ۔ میں دراصل خوراک سے ڈپریشن کا علاج ڈھونڈ رہا ہوں۔" وہ ہانکتا۔

"سب ایک ہی دوڑ میں لگے ہیں...... مطلب کی دوڑ میں۔"

"میں تمہیں مسلمانوں کی کتابیں سناؤں۔" وہ اس کھلونے کو تین دن سے بہلا رہا تھا۔

پہلے ہفتے زود ہضم خوراک...... دوسرے ہفتے تقویت بخش، تیسرے ہفتے صحت بخش اور آخری ہفتے صرف میٹھا۔ وہ سب کسی اندھے گداگر کی طرح نہیں بلکہ کسی دانا حکیم کی طرح کر رہا تھا۔ کتابیں، انٹرنیٹ اور مشورے وہ ہر مہارت سے لیس ہو کر باقاعدہ گوشوارے بنا کر اس میدان کو سر کرنے نکلا تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ کسی کام کے لیے پرجوش ہوا تھا۔ مگر وہ لڑکی کسی یونانی فلاسفر کی طرح ڈھیٹ تھی۔ اب وہ سورۃ مزمل مکمل لحن کے ساتھ تلاوت کر رہا ہے اور وہ لڑکی سوپ کا چمچ پرے رکھ کر پیالہ منہ کو لگا چکی تھی۔

رئیس خان زادہ دیکھ رہا تھا، خزاں سے لڑتی زمین سے اگتی ہوئی امید......

☆☆☆

"تم مجھے ایسے ناشتا کروانے والے ہو؟"

میرے انداز میں کچھ ایسی منہ پھٹ حیرت ضرور ہوگی کہ جس نے بٹوے میں سے پیسے نکال کر اسے پھینکتے ڈینی کو پلٹ جانے پر اکسایا تھا..

"نہیں یہ تو کم ہیں۔ ایک دو اور بٹوے دیکھنے ہوں گے۔ دراصل میں تمہیں بلٹن میں ناشتا کروا رہا ہوں محترمہ۔" اس نے کٹ لگا ابرو اچکا کے ادا سے کہا۔

"تم پاکٹ مار کے لوگوں کی...... مجھے بلٹن لے جا رہے تھے اوہ ڈینی تم نے تو میری نسلوں کو غلام کر لیا۔" کوئی شک نہیں کہ میں واقعی کچکچا رہی تھی۔

"یہ بات ہے تو مزید سنو۔ میں تمہارے لیے کوئی ہاسٹل یا اپارٹمنٹ دیکھ رہا ہوں اور یقیناً اس کے لیے ایڈوانس رقم بھی بھرنی ہوگی۔" اس نے قریب سے گزرتے امریکی کی قیمتی گھڑی یہی بات کہتے کہتے اڑائی تھی اور میرے سامنے اڑائی تھی۔

"تم......" میرا منہ کھل گیا۔

"تم یہ سب کرنا سیکھ لو میڈم۔ یا پھر کم از کم برداشت کرنا سیکھ لو کہ اب سے تم میرا دایاں بازو سمجھی جاؤ گی نیویارک میں۔"

تب میں تنتنا کے رہ گئی مگر پھر ہم گلیوں میں چلتے پھرتے اور وہ مجھے کو سکھا رہا ہوتا۔

"دیکھو دونوں انگلیوں کے سرے جیب میں جاتے ہی کھلیں۔ ٹارگٹ کو پکڑیں اور باہر آئیں مگر...... انگلیاں بے زبان ہونی چاہئیں۔ چلو اب میرا والٹ نکالو۔" وہ آگے چلنے لگتا۔

"تم مجھے گدگدی کر رہی ہو؟" وہ کبھی حقیقتاً کنفیوز سا پوچھتا اور کبھی دھاڑتا۔

پھر ایک دن جب اسے کسی کے والٹ سے چھ سو ڈالر ملے وہ یوں خوش ہوا کہ کیا ہی ارسطو، سکندر اعظم کی فتوحات سے خوش ہوا ہوگا۔

ڈینئل کلارتھ کی ماں، سارہ کلارتھ چوٹی کی وکیل تھی۔ اب کنیکٹی کٹ ریاست کی اٹارنی کا الیکشن لڑ رہی تھی۔ ڈینئل بھی Yale میں قانون پڑھتا تھا۔

چونکہ وہ Juvenile Justice (بچوں کے لیے انصاف) کے سبجیکٹ میں اسپیشلائزیشن کر رہا تھا۔ وہ بھی اپنے قانون دان خاندان کی خواہش اور مشورے کے خلاف۔ پس وہ خاندان بھر

میں ناپسند کیا جاتا۔ وہ من موجی تھا۔ کبھی تھیٹر کرتا۔ کبھی پر مشقت جم کر کے جسم بنا رہا ہوتا۔ کبھی ہالی وڈ میں اسسٹنٹ مین بنا ہوتا۔ تو کبھی ہائی پروفائل پارٹیز میں بن ٹھن کر جا رہا ہوتا اپنی لکس کیش کروانے……

میں خوش تھی ڈینی نے اپارٹمنٹ کرائے پر لے دیا جس میں دو اور لڑکیاں ہوتی جاب اچھی جا رہی تھی۔ عیش ہم اپنے طریقے سے پورے کر لیتے۔ زندگی سکون بھری اونگھ لے رہی تھی کہ جب مجھے لگنے لگا۔ ڈینی کو محبت ہے مجھ سے…… مجھے لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

''اداس ہو؟'' وہ میرے لیے متفکر ہوتا۔

''تم نے ابھی تک اپنا فرکوٹ نہیں خریدا؟'' وہ نچھاور ہوتی ماں بن جاتا۔

''رونی کا بوائے فرینڈ کوکین ڈیلر ہے نیو جرسی میں……'' گوسپ کرتی شرارتی دوست بن جاتا۔

''یہ مفلر یوں بھی پہنا جاسکتا ہے۔'' وہ برہنہ کندھے ڈھانپتا باپ محسوس ہوتا۔

''جرنلزم تمہارے جیسی پارہ صفت کے لیے پرکشش ہے۔'' وہ کیرئیر کونسلنگ کر رہا ہوتا۔ ہلٹن میں کھانا، بے فیئر اور ہالی وڈ کی سیاحت…… ڈینئل کلار تھا ایک شکنجہ تھا یقیناً اور میں…… جس کی پیدا کردہ تتنگا۔ تنہا…… بدحواس، روشنی کو ترستی مجھے ڈینی کے سوا کچھ نہ سوجھتا۔ وہ آنکھ سے محبت کرتا۔ امریکا میں ایسی مشرقی محبت نایاب ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' میرا دل یوں دھڑکتا جیسے اس کی آنکھ سے شرط لگا بیٹھا ہو۔

''تم موٹی ہو رہی ہو۔'' وہ منہ بسور کے کہتا اور اگلا ڈیڑھ گھنٹہ میں سنتی رہتی۔

پھر ایک وہ رات آئی تھی کہ جس سے ایک دن پہلے ڈینئل نے سینٹرل پارک میں اسکیٹنگ کرتے میرا ہاتھ تھاما۔ اپنی رفتار میری رفتار کے برابر کی اور بولا۔

''کل میری ایک پروفیشنل گیدرنگ ہے اور تم چل رہی ہو۔ ٹھیک آٹھ بجے میں تمہیں لینے آؤں گا۔ لباس سیاہ ہونا چاہیے۔'' میری جیکٹ کندھے سے جھٹکا دے کر اس نے رفتار بڑھا لی اور میں اوندھے منہ سڑک پر گری تھی۔ ٹخنے پر چوٹ آگئی۔ وہ شرمندہ ہوتا رہا اور میں پارٹی میں جانے کے لیے بے تاب…… بے چاری میں۔

☆☆☆

عکاشہ آئی تو ٹوک بیٹھی۔

''مسز کرنل آج کل کچھ زیادہ ہی فریفتہ نہیں تم پر؟ جب دیکھو تم ان کے بنگلے میں جب سنو ہالہ نامہ یاد رکھنا اس نیلے آسمان نے جانے کتنے بلند پرواز دیکھ رکھے ہوں۔ اسے نہ کسی کی لگن سے فرق پڑتا ہے نہ پروں کی چھوٹائی سے۔'' وہ لاؤنج میں تادیر بیٹھا عکاشہ کی بات سوچتا رہا۔

ٹھنڈ جوان ہوگئی اور سرما تند، وہ اور اذہان مونگ پھلی کھاتے اور ہالہ سے کبھی لمبی گفتگو کرتے۔ وہ اب بھی کبھی مسکرا دیتی…… کبھی کچھ بول بھی دیتی۔

ماما اور لیس کو اس کی ہنسی۔

''تم اسے گود کیوں نہیں لے لیتے۔'' وہ نہال ہوا۔

''دادا کہتے ہیں کہ جب کوئی تیسرا چبھنے لگے تو سمجھو ''دو'' کا ''سمجھوتا'' کوٹا اور محبت شروع ہوئی۔'' وہ ہونہہ کر کے رہ گئی۔

☆☆☆

وہ رات کو بے مقصد ٹہلتا تھا۔ بالکونیوں باغیچوں اور چھتوں پر۔ جیسے کوئی بے وزن برتن ہوا سے لڑھکتا پھرتا ہے۔ یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں۔

وہ ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ اڑسے…… سلیپرز پہنے بنا سوئیٹر پہنے چھت پر دائیں بائیں گھوم رہا ہے جب سوچتا ہے کہ گھٹن ضرور کسی تنہائی کی اولاد ہوگی۔ نسوں میں ہنگامہ کرتی تنہائی کی اولاد…… ویسی ہی سورش پسند…… شیطان کی پسندیدہ۔

''تمہیں معلوم ہے میں رات کے اس پہر بے آرام لوگوں کو انتہائی ناکام سمجھتی ہوں۔''

وہ مڑا، مسز کرنل کی چھت پر کھڑی وہ کافی کے

مگ سے ہونٹ لگائے سرد نگاہیں اس پر ٹکائے...... منتظر سی تھی۔ وہ مسکرا نہ سکا...... اپنی مریضہ کے سامنے۔

"بے سکونی صرف ناکام لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ ناکامی نا آشنائی نہیں ہے میرے لیے۔" منڈیر پر بیٹھ کے بولا۔ وہ کافی کا مگ درمیان میں رکھتی اچک کے بیٹھی۔

"کافی کی اجازت نہیں ہے تمہیں...... کم از کم اس ہفتے۔ یہ ڈی ہائیڈریٹ کرتی ہے اور ڈپریشن کے لیے ڈی ہائیڈریشن پہلا زہر ہے۔"

"کیا میرا ہی سوچتے رہتے ہو؟" وہ سرد سا اکتائی۔

"تمہارا نہیں اپنا، دادا کہتے ہیں زندگی میں ایک بار آپ کو خود کے ساتھ اچھا کرنے کا موقع بھی ملتا ہے کیونکہ ایک بار آپ کو اپنا آپ بھی ملتا ہے انسانوں کی بھیڑ میں۔"

"میں...... میں تم ہوں؟" خاموشی نے ہر شے کی زبان باندھ دی اور اندھیرا آنکھیں جھپک کے روشنی ڈھونڈنے لگا۔

"تم نے خود کو روتے نہیں دیکھا ناں...... وہ واویلا میرے دکھوں کا ہی تو خلاصہ تھا۔

وہ چیخیں میرے اندر ہی تو کرلاتی تھیں۔ میں نے خود ہی سنا۔ خود کو ہی دیکھا تھا تم میں۔"

ام ہالہ ذکریا نے لاہور کی سرد ترین رات میں اپنے آپ سے برف جھڑتے خود دیکھی۔ وہ برف تب تک جھڑتی رہی جب تک وہ لاوانہ ہوگئی۔

وہ بول بول کر تھک گیا تو ہولے سے کہہ گئی۔

"تمہیں پتا ہے۔ تم بالکل خوب صورت نہیں ہو۔"

وہ آنکھیں میچ کے مسکرایا۔

"یہ بھی بہترین ہوا۔ خوب صورت چہرے کے ساتھ ہانڈیاں پکاتا تو مر مر جاتا۔ اللہ بہترین منصوبہ ساز ہے۔ کوئی شک ہے؟" بے ریا سی مسکراہٹ پر وہ کھکھلائی اٹھی۔

یوں ام ہالہ جو دائرے میں گھومنا ہی جانتی تھی اس لڑکے کو اس دائرے کے عین درمیان میں کھڑا کر بیٹھی تھی۔ وہ پھر سے گھومنے لگی تھی۔ گول گول اپنے مدار میں۔

☆☆☆

مسز کرنل ہاتھ جھلا جھلا کے خوش ہوتیں۔

"رئیس...... ہالہ مجھے حیران کر رہی ہے۔ وہ زندہ لگنے لگی ہے۔ اف اور خوب صورت ہو رہی ہے۔"

کرنل صاحب اسے لاء فرم لے جاتے۔

"میری پوتی کا جرنلزم ــ میچور ہے بھئی مگر یہ تو قانون دان کو بے یقین کر دیتی ہے۔"

وہ قابل فخر ہونے لگی۔ رئیس کا سینہ پھولنے لگا۔

شاہ میر اور سمیعہ آنٹی آئے تو وہ محتاط ہو گیا۔ وہی پرانا معمول چل نکلا۔

درخت ٹنڈ منڈ ہوئے پڑے تھے۔ سرما قدرے سست ہو گیا تھا۔ وہ پارک میں بیٹھا دادا کی فلاسفیاں جھاڑ رہا تھا۔ وہ بغور سنتی رہی۔

"دادا کہتے ہیں کہ بچپن میں ان کی دادی نے انہیں ایک مٹی کا گلک خرید دیا۔ ان کی حرص کو اور بے مرے پن کو ختم کرنے کے لیے مگر کہتے ہیں کہ ان پر الٹا اثر ہوا۔ وہ مزید حیران ہو گئے۔ ہر وہ موقع ڈھونڈنے لگے جو گلے کو بھرنے میں مددگار ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر نفس ایک ہی جبلت پر پیدا نہیں ہوا۔ یہاں جھانکو اور اپنا راستہ ڈھونڈو۔" وہ دل کی طرف سے اشارہ کرنے لگا۔

"دیکھنا...... ماما کو لگ نہ جائے۔" وہ دل کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔ دونوں ہنسے، توقف لازم ہوا۔ پھر بولی۔

"مجھے تمہاری پسند پسند نہیں۔ وہ خوب صورت ہے مگر محبت کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ پتھر عورت ہے۔" برملا کہا۔

"ہالہ وہ گاؤں سے آئی تھی۔ یہاں...... اس بنچ پر بیٹھ کے رویا کرتی تھی۔ مجھے دکھ ہوتا پھر میں اسے

بہلانے کے طریقے ڈھونڈنے لگا اور بس......"

بڑی دیر بعد وہ بولی۔

"مجھے لگا یہ مہربانیاں صرف میرے لیے ہیں۔" وہ تلخ ہوئی۔ "تمہیں معلوم ہے تم سراسر خوب صورت نہیں ہو۔ ہاں مگر خوبرو ہو۔" وہ مسکرا دیا۔

"ایسی ہی مسکراہٹ...... تنا ہوا جسم اور قد کاٹھ...... آدھے گھنگھریالے بال...... مغرب میں لڑکیاں دیوانی ہیں۔" وہ حیران ہوا۔

"ایسا ہی معصوم بن کے دیکھنا۔ مصروفیت والی لک...... ہاتھوں کی ابھری رگیں اور......" وہ شرارتی سا بولتی ہی گئی۔

"خدارا بس کرو۔ بچے کی جان لو گی کیا؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"آج جانے کی ضد نہ کرو۔" وہ ٹھنکی۔

"اوئے یہ کیا؟" وہ مرنے کو ہو گیا۔

"دادا نے سکھایا ہے کچھ کچھ۔"

"رئیس خان زادہ آپ گھر کا رستہ بھول تو نہیں گئے آخر کو مسلسل تین گھنٹوں سے یہاں پڑے ہیں۔"

شاہ میر کے آنے پر وہ ایک لفظ مزید کہے بنا گھر کو چل دیا۔

☆☆☆

وقت کوئی برق سی بن گیا۔ ام ہالہ ذکریا نے مقامی فیشن میگزین میں جاب کر لی تھی جبکہ کسی مشہور چینل میں جگہ بنانا اس کے دادا کا خواب تھا۔ جو وہ پورا کرنے میں جتنے ہوئے تھے۔ سمعیہ آنٹی کی نواسی ہوئی تو بڑے پیمانے پر تقریب ہوئی۔

ہالہ نے خوب سج دھج کی۔ رئیس کہیں نہ دکھا۔ وہ ڈھونڈنے لگی۔ نیوی بلو شلوار سوٹ میں بال اچھے سے سیٹ کیے پشاوری چپل میں وہ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ ملازموں میں گھرا کھڑا۔

"وہ ٹراوزرز تو ماہا ادریس کی سوتن ہی تھے جیسے۔ آج اترے ہیں تو اپنا اپنا سا رئیس سامنے آیا ہے۔" وہ آنکھ دبا کے بولی۔

"تم بھی اچھی لگ رہی ہو۔" وہ نظریں نہ ملاتا۔ وہ ٹھنکی۔

"باہر کیوں نہیں آ رہے؟"

"ایسے ہی کام تھا۔" اس نے کہا تو وہ اسے کہنی سے کھینچنے لگی۔ وہ ہچکچایا پھر بے بسی سے بولا۔

"میں اللہ کا پسندیدہ رہا ہوں ہالہ۔ اللہ مجھے ڈھانپ لیتے ہیں جانے کیوں؟ میں ہر عید، ہر شادی پر شاہ میر کی اترن پہنتا ہوں۔ کسی کو معلوم تک نہیں پڑتا۔ شاہ میر کو بھی نہیں۔ مگر آج اس نے پہچان لیا ہے۔ اب وہ ماہا کے سامنے...... وہ واقعی موقع ڈھونڈے گا۔" وہ لب دبا کے رخ موڑ گیا۔

"تم کو معلوم ہے؟ تم بہت خوب صورت ہو رئیس خان زادہ" وہ شرارت سے کندھے کے قریب بولی تو وہ مڑا...... پر اعتماد سا۔

"بناؤ مت جل پری۔ دادا کہتے ہیں کہ میں بہترین جین میوٹیشن ہوں۔ مجھے فرق نہیں پڑتا کہ میں خوب صورت ہوں نہیں ہوں۔ امیر ہوں نہیں ہوں۔ پسندیدہ ہوں، نہیں ہوں۔ میں بس عام سا رئیس خان زادہ ہی ہوں۔"

"پہلی بار مجھے تمہارے دادا کے کسی 'کہنے' پر اعتراض ہے۔"

وہ باہر نکلے تو واقعی شاہ میر، ماہا ادریس کو گھیرے کھڑا تھا۔ ام ہالہ نے بے چارگی سے بدصورت سے خوبرو اور پھر خوب صورت کا درجہ پانے والے کو دیکھا جو اسے گھور رہا تھا۔

☆☆☆

وہ رات بہت خوب صورت سی تھی۔ کرسمس کی مناسبت سے سجا نیویارک، ڈینی کی ماں کی کلاس کے لوگ۔ خالصتاً قانون کی زبان بولتے لوگ۔ ڈینی نے مجھے مہنگا لباس خرید کر دیا تھا۔ سیاہ لبادہ مجھ پر اتنا جچ گیا کہ کئی گردنیں میری اور مڑتیں۔ میں سرخ ہوئی جاتی۔ جب کوئی گھمبیر سا بولا۔

"آج پچیس سال بعد میں نے گالوں کا یہ 'خالص' اناری رنگ دیکھا ہے۔ جان سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟" ادھیڑ عمر...... بلا کا اسمارٹ شخص۔

ڈینی مدد کو لپکا۔

"یہ میرے ساتھ ہیں سر، میں ڈینئل کلارتھ، یہ کیلہ ذیک میری دوست۔"

"کیا یہ ہمیشہ ایسے ہی مسکراتی ہے؟" وہ ڈینی کو دیکھتا تک نہیں۔

"پاگل ہے کیا؟" وہ گیا تو پھٹ پڑی۔

"پاگل...... بے وقوف جیوئل جسٹس میں دیوتا ہے۔ امریکا کی دنیا میں قانون کی سند سمجھا جاتا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں ہو رہا اس نے تم میں بھلا کیا دیکھ لیا۔" ڈینی اپنی جون میں لوٹا تو میرا منہ سوج گیا۔

واپسی صبح ساڑھے تین بجے ہوئی۔ سیونتھ اسٹریٹ ایونیو میں اکا دکا گاڑی گزرتی۔ سکون ہمارے ساتھ ساتھ چلتا۔ ہلکی گیلی سڑک پہ اوورکوٹ پہنے ہم دونوں فرصت سے تھے جب ڈینی نے اپنے فون پر "پرفیکٹ" لگایا اور مجھے ہاتھ بڑھا کے رقص کی دعوت دی۔ میں کھلکھلائی۔ پھر اس سکوت کو ترتیب سے اٹھتے پاؤں سے کم کرنے لگی۔ پھر یوں ہوا کہ دھڑکنوں نے اپنا شور کر دیا۔ روشنی، اندھیرا، خاموشی...... سب ناظرین ہو گئے۔ محویت سحر انگیزی اور خوشی ہم میں شمولیت کر گئے۔ 'پرفیکٹ' ختم ہوتے ہی ڈینی ویران سڑک پر گھٹنے کے بل بیٹھ گیا اور پھولی سانسوں میں بولا۔

"کوئی عورت مجھے یوں عقل سے محروم نہیں کر سکتی کہ میں اس کی ہنسی کے لیے تنہا سڑکوں پر ناچوں۔" میرا ہاتھ تھام لیا۔ جو گرم ہوتا جاتا۔

"ڈینئل کلارتھ کو کیلہ ذک چاہیے ہمیشہ کے لیے صرف اپنے لیے۔"

جیب تھپتھپا کے وہ انگوٹھی نکالتا بولا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے وہ ایسے ہی بولا تھا۔ میں سن کھڑی رہی اتنی خاموشی سے وہ گھبرایا تھا شاید۔

"کچھ تو بولو۔"

"دیکھ لو...... میں خاصی موٹی ہوں۔" میں نے ناک چڑھا کے کہا تو وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ انگوٹھی لینے میں، میں متامل تھی۔ جانے کیوں؟ مگر میں خوش تھی۔

"انگوٹھی مجھے پہناتے وہ بے تحاشا خوش تھا۔ پھر وہ میری پسند سے مجھے اسٹریٹ لائٹ کے کھمبے کے ساتھ پول ڈانس کر کے دکھانے لگا۔ میری فکریں۔ اندیشے، میرے قہقہوں سے خوف زدہ سے تھے۔ میں نے کہا۔

"ڈینی یہ انگوٹھی...... یہ لوسی آنٹی کی ہے۔ میرا پنک بیگ۔"

"مجھے لگا۔" یہ تمہاری ممی کی ہے اور تم خوش ہو گی۔" وہ محتاط ہوا۔

"میرا بیگ ابھی بھی ہے تمہارے پاس۔" ڈینی نے سر ہلایا تو میں نہال ہو گئی۔ وہ میرا بچپن سنبھالے بیٹھا تھا تو میں بڑھاپے سے بے فکر کیوں نہ ہو جاؤں۔ میں نے ڈینی کے حق میں فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

اتوار کے دن کی کچھ فرصتیں تھیں اور ہالہ کہہ بیٹھی۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے تمہارے دادا تمہیں معقول رقم بھیجتے ہیں ماہانہ۔ پھر ایسی غربت کیوں کہ تمہیں شاہ میر کی اترن پہننی پڑے۔"

وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کتنی ہی دیر ٹنڈ منڈ درختوں کو پرکھا۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کے ایک سفر پہ نکلا۔

شاہدرہ کی تنگ گلیوں والے گھر میں کہ جس میں ایک کمرہ ہی بیڈ روم، کچن اور باتھ روم تھا ام ہالہ ذکریا نے رئیس خان زادہ کو والہانہ تین معذور بچے نما لڑکوں کو چومتے دیکھا۔

مڑی ٹانگوں اور ابھرے سینوں والے وہ لڑکے 'غوں غوں' کرتے اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ بوڑھی ماں دروازے کو لپکی تو رئیس بول اٹھا۔

"اماں! میں پہلے کچھ کھاتا ہوں کیا؟ ہاں ساگ بنا ہے تو لے آئیں گرم کر کے، میں تندور سے روٹیاں لے آتا ہوں۔"

ہالہ بس ٹکر ٹکر دیکھتی۔ پھر وہ اسے ساگ سے روٹی کھاتے اور ان بچوں کو دلیہ کھلاتے دیکھتی رہی۔ واپسی کو مڑے تو خاتون نے دو سو کے دو نوٹ ہالہ کو پکڑا دیے۔ رئیس نے اعتراض کیا تو بولیں۔

''میری بہو پہلی بار گھر آئی ہے۔ خالی ہاتھ بھیجتے مجھے شرم آتی ہے۔'' رئیس بے طرح سٹپٹایا۔

''یہ میری دوست ہے اماں۔'' وہ زور دیتے ہوئے بولا۔ ہالہ کو اس کی سنجیدگی نے فکر مند کیا۔

''اچھا، اچھا معاف کرنا بیٹی۔'' وہ مسکرا کے اور کے کہنے لگی۔

''یہ تجھے بڑا سوہنا دیکھتی ہے رئیس، جیسے محبت کسی من چاہے کو دیکھتی ہوگی۔'' ہالہ نے قدم بڑھاتے ہی اس عورت کی سرگوشی سنی اور حیران ہوئی۔

میٹرو اسٹیشن تک پیدل چلتے وہ خود ہی بتانے لگا۔

''اماں، نانا کے جاننے والوں کے ہاں کام کرتی تھیں۔ جب میں ان سے ملا۔ معذور بچے اور غربت ان کا حوصلہ کھاتے جا رہے تھے جب میں نے ان کی مدد کا فیصلہ کر لیا۔ گھر کے اخراجات لڑکوں کی دوائی۔ مہنگا دلیہ...... پیمپرز، نیپکن، کپڑے، بس میں خود ہی جانتا گیا۔ رقم کچھ پھر بھی بچ جاتی تھی میرے پاس مگر پھر خالد (ملازم) کی والدہ کا بائی پاس کروانا پڑ گیا۔

خالد کی چھوٹی بہن ذہین بچی ہے۔ مجھے لگا ضائع ہو جائے گی تو اسے کوئین میری میں ایڈمیشن خود دلایا۔ وہ میڈیکل میں جائے گی تو کچھ نہ کچھ بچانا بھی ہوتا ہے اس کے لیے بس ایسے ہی چھوٹے موٹے خرچے۔''

''تم بہت خوب صورت ہو رئیس خان زادہ'' ٹھنڈی ہوا نے رئیس کے گال سن کیے۔

''دادا کہتے ہیں لڑکی کو کارنامہ سنانے لگو تو جان رکھو کہ اسے متاثر کرنے کی کوششوں میں ہو''

''تم اسی لیے اتنا سوچ رہے تھے یہاں آنے سے پہلے، رئیس...... تم بہت تھک جاتے ہو ناں؟''

وہ چونک کے ہالہ کو دیکھنے لگا۔ میٹرو اسٹیشن کا رش جیسے تھم گیا۔

''کون ہو تم یار؟'' ہالہ کو اپنے الفاظ یاد آئے تو دونوں مسکرا دیے۔

''رئیس! تم نے کبھی یہ کیوں نہ پوچھا کہ کون ہوں میں؟ کیسے پہنچی یہاں تک؟''

''کیونکہ میں جانتا تھا ایک دن میٹرو اسٹیشن میں بیٹھے تم مجھے خود بتاؤ گی۔''

''یوں لگا جیسے شاہدرہ کا میٹرو اسٹیشن نیویارک کا ٹائمز اسکوائر ہو گیا ہو۔ اور ام ہالہ ذکریا کیلہ زیک یا رئیس خان زادہ کو بچپن سے گھسیٹتی اپنی جوانی کے اس حصے تک لے آئی جہاں گھٹنوں پر بیٹھے ڈینئل کلارتھ نے اسے انگوٹھی سے باندھ لیا تھا اور وہ دنوں سرشار رہی تھی۔ پھر ایک دن......

☆☆☆

اس دن شدید برف باری ہوئی تھی۔ نیویارک میں آتش دان مسلسل مصروف تھے اور ہڈیاں پھر بھی چیخ رہی تھیں اور میں ڈینئل کلارتھ کو سن رہی تھی۔

''ہنی ...... صرف ایک رات'' وہ کوئی رات مانگ رہا تھا مجھ سے...... کسی اور کے لیے۔

''چپ رہو ڈینی۔'' میں سمجھتی جاتی کہ وہ بولتا رہے گا تو ہمارے بیچ سب ختم ہوتا رہے گا۔

''ہنی سمجھو ناں، ڈیوڈ کو کوئی والہانہ عشق نہیں ہوا تم سے۔ وقتی کشش ہے۔ اور ایسے ہزاروں میں اب تک ہو چکی ہے۔ کسی کے بال کسی کے گال۔ دیکھو...... میں اس کی لاء فرم میں انٹرنی ہوں تو میرا کیا لیول ہے۔ اگر مستقل ہو گیا تو سمجھو، کیا ہو جاؤں گا؟''

وہ بے صبرا تھا مجھے معلوم تھا...... بے غیرت ہوگا۔ شک ہی رہا۔

''ڈینی تمہیں معلوم ہے تم میری شنیل کی جیکٹ نہیں مانگ رہے، تمہیں یقین ہے تم کیا چاہ رہے ہو؟'' میں نے خود کو یقین دلانے کا سفر شروع کیا کہ ڈینی ایسا تو نہیں۔

''دیکھو کیلہ...... ! میں نے ہمیشہ تمہاری محبت میں تمہاری مدد کی۔ تمہارا ہر لمحے کا دکھ خود پر لے لیا تو کیا تم میرے لیے اتنا سا نہیں کر سکتیں۔'' اب وہ جھنجلایا۔

''نہیں کر سکتی تمہارا 'اتنا' سا کام، تم سنکی ہو؟ یہ میری آبرو۔ میری نسوانیت کا معاملہ ہے۔ کسی کو میری مسکراہٹ پسند آ گئی تو بیچ دو گے مجھے؟''

''حد ہے...... تمہیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں

آ رہی۔ رہنا تو مجھے ہی ہے ناں تمہارے ساتھ، تم ادھوری ملو یا مکمل، مجھے منظور ہے۔ اتنا نخرا کس بات کا۔ اپنی ماں کے ساتھ ہوتیں تو یہی کام بلا معاوضہ اسٹیورٹ کے لیے کر رہی ہوتیں اور......"

اور پھر یوں ہوا کہ میں نے پوری قوت سے ڈینی کے منہ پر گھونسا جڑ دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا۔

"اور یہ کہ میں یونہی اسٹیورٹ کا منہ توڑ کے آئی تھی اور تمہارا بھی توڑ دوں گی اور ہر کسی کا جس نے مجھ سے میرا اواحد فخر چھیننا چاہا۔"

ڈینی سیدھا ہوا اور اگلے لمحے اس نے ایک مردانہ طمانچہ میرے گال پر دیا تھا اور میں اوندھے گری تھی۔ گالیوں کے طوفان نے اس کے دو چار دوستوں کو کمروں سے نکال کے باہر کھڑا کیا تھا۔

ڈینی نے مجھے جیکٹ سے پکڑ کے گھسیٹا اور دروازے سے باہر نکال دیا۔

"اب میں دیکھتا ہوں میرے بغیر تم کیسے سروائیو کرو گی۔ انتظار کروں گا کہ جب تم اسی دروازے پر خود کو آگے پیش کرو گی۔"

"کیا یہ وہی ڈینی تھا جو میرے لیے سڑکوں پر ناچتا پھرتا تھا۔ مجھے ہلٹن میں ناشتا کرواتا۔ میرے ساتھ سڑکوں پر نوکری کے لیے دھکے کھاتا۔ کیا واقعی 'محفوظ مستقل' دنیا میں وہ بلا بن چکا جو ہر رشتے۔ ہر جذبے کو کھا گئی۔

آئندہ آنے والے پانچ گھنٹوں نے مجھ سے میرے بیس سالوں کا ہر بنا بنایا راستہ چھین لیا۔ ان پانچ گھنٹوں نے میرے اردگرد دیواریں کھینچ دیں۔ آسمان کو چھوتی۔ زمین کو محدود اور مسدود کرتی دیواریں۔

پہلے گھنٹے میں مجھے نوکری سے برخاستگی کا فون موصول ہوا۔ تب میں شدید ٹھنڈ میں اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں بینچ پر بیٹھی ابھی کچھ سوچ بھی نہ پائی تھی۔

اسی فون کال نے میری عزت نفس کو گھٹنوں کے بل گرا دیا۔ میرا پلیز پلیز کہنا اور مخاطب کا برائے نام اطلاع دے کر فون بند کر دینا۔ پھر میری روم میٹ کا فون آیا کہ اپنا سامان اٹھالوں اپارٹمنٹ سے، پہلے گھنٹے میں، میں بے بس ہو گئی۔

دوسرا گھنٹہ شروع ہوا تو میرا دماغ بھی کچھ شروع ہوا۔ میں نے اس دن پہلا فون رونی کو کیا تھا۔ اور وہ فون اٹھایا ہی نہ گیا۔ یونیورسٹی کے کچھ اور دوست۔

مجھے لگا ساری دنیا سو گئی ہے یا میں کسی جدید دور سے ماضی کا سفر کر آئی ہوں۔ جب دوسرا گھنٹہ ختم ہونے کو تھا تو میں نے اپنی ماں کو فون ملایا تھا۔

"ممی! مجھے گھر آنا ہے۔" میری ماں نے شاید اس ٹھنڈ کا تصور بھی نہ کیا ہوگا جو میری آواز میں تھی۔

"بے بی...... تم کہاں ہو؟" ہچکچاہٹ کو میں نے بھانپ ہی لیا۔

"ممی پلیز۔" میں بالآخر رو ہی دی۔

"بے بی...... اسٹیورٹ وہ گھر پر ہی ہے۔ اس دن تم نے اسے مارا نہ ہوتا تو......"

"خدا کے لیے ممی...... کبھی میری ماں بھی بن جایا کریں۔" میں چلائی۔

"یا تو میں سردی سے اکڑ کے مر جاؤں گی یا گینگ ریپ سے اور آپ بیٹھی رہیے گا اسٹورٹ کا گھٹنا سہلاتی۔"

"میں تمہیں ذیک کا نمبر دیتی ہوں۔" میں سن ہو گئی۔

کیا یہ واقعی میری ماں ہے؟ مجھے شک نہیں یقین ہوا کہ یہ میری ماں نہیں ہو سکتیں۔

"وہ مجھے چھوڑ چکے ہیں...... آپ نے مجھے چھوڑ دیا۔ ممی۔ بائے۔"

آنسو کبھی سرد جھیلوں سے جم جاتے۔ تو کبھی گرم سمندروں سے لہریں بناتے۔ یوں تین گھنٹے گزرے اور چوتھے گھنٹے میں جب میرے ہاتھ نیلے ہو گئے ایک فون کال آئی۔

"میرے زندگی کے تجربے نے یہ بات میرے کان میں ڈالی ہے کہ عورت جتنی حسین ہوگی۔ اتنی بے وقوف بھی ہوگی۔ مگر اتنی حسین عورت کو اتنا نڈر...... میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

بھاری مردانہ آواز...... ڈیوڈ ہالینڈ...... ایک اور

لیوا تھن۔

''اگر وہ لڑکا مجھے وقت نہ دیتا تو میں اسے باوقار انداز سمجھتا۔ مگر اب تو تم نے 'فخر' کو درمیان میں لا کر میری 'عزت' کی جان پر بنا دی ہے۔ مجھے یقین ہے تم سمجھ جاؤ گی کہ تم بہت بری طرح پھنس چکی ہو۔ میرا ڈرائیور تم سے کچھ ہی دور منتظر ہے۔ آجاؤ تمہیں یورپ کا ٹرپ لگا دوں گا۔''

''اور میں تمہیں پھانسی لگوا دوں گی مانسٹر، میرا فون ریکارڈنگ پر ہے۔ عیش کے چکروں میں عزت اور عبیدہ بھی جائیں گے۔ میں نڈر ہوں ناں۔'' میں جانتی تھی ڈر کو میری کپکپاہٹوں کی خبر ہو چکی۔ وہ بے طرح ہنسا۔

''پور چائلڈ بے بی میرا ڈرائیور کیا صرف گاڑی ڈرائیو کرتا ہوگا؟ تمہارا فون تو بحرالکاہل سے بھی ڈھونڈ لیا جائے تو میرے خلاف کچھ نہ ملے۔ ہاں ایک اچھی آڈیو ٹیپ میں اگلے آدھے گھنٹے میں نکلوا سکتا ہوں۔ تمہارے خلاف اور کیا یہ میرا ہی نمبر ہے؟ جس سے بات ہو رہی ہے اور تمہارے اپارٹمنٹ کی لڑکیاں کیا کرتی تھیں بھلا؟ کون مانے گا کہ تم بھی ان میں سے نہ تھیں۔ اور آخری بات سارے قانونی اور سیاسی پنڈت میرے ساتھ شام کی چائے پر یہ حماقت چسکیاں لے کر ڈسکس کریں گے اور مجھے تھپکی دے کر جائیں گے۔''

چوتھے گھنٹے کے ختم ہونے تک اس مرد نے ساری امیدیں بھی ختم کر دیں۔ کیا یہ واقعی ترقی کا عروج سمجھی جانے والی صدی تھی؟ مجھے شک نہیں یقین ہوا کہ انسان جتنا بھی 'معاشرتی' ہو جائے وہ رہے گا 'حیوان' ہی۔

اب یہ تھا کہ ڈیوڈ کے لوگ آس پاس ہی تھے۔ حکم کے منتظر، کوئی راہ نہ تھی۔ میں نے ہانپتے ہوئے اپنے باپ کو فون ملایا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ لوسی آنٹی کی انگوٹھی سے ابا قیمتی ہوتے ہیں۔ تو میں اس رات ابا چرا لیتی۔ کاش مجھے بھی اسٹیورٹ ملتا۔ نہ وہ ہی لڑکے...... نہ ڈینی...... نہ ڈیوڈ۔

اندھیرا...... تنہائی...... خوف...... سردی......

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈیڈی کو چوتھی کال ملائی۔ ڈیوڈ کے آدمی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے تھے سیدھے ہوئے۔ مجھے سڑک پار کرنا تھی اور گاڑی میں جا بیٹھنا تھا۔ اور بس۔

ڈیڈی کو بیل جا رہی تھی۔ اور بالآخر انہوں نے اٹھا ہی لیا۔

''ڈیڈی......'' میں سڑک کے بیچ کھڑی ہو گئی۔

ایک تیز رفتار ٹرک میری طرف آیا۔

''ہالہ...... یہ تم ہو؟ ہالہ'' ...... ڈیڈی وارفتہ سے بولے۔

''ڈیڈی...... اب تو مدد کی ضرورت بھی نہیں رہی۔'' ٹرک نے میری آواز بھی۔ روند دی۔

آنکھ کھلی تو ڈیڈی تھے۔ روتے، نادم، ممی تھیں شرمندہ۔ مگر میں وہ ہالہ تھی نہ کیلہ۔

ڈیڈی مجھے لے گئے۔ سائیکاٹرسٹ...... سائیکالوجسٹ کے پاس بھی۔ اور پھر ذکریا جنجوعہ کی بیٹی پاکستان بھیج دی گئی۔

اور یہاں مل گیا ایک مسیحا، جو کہتا...... 'میں تم ہوں۔'

وہ مسکرائی...... رئیس سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ رکا ہوا لمحہ...... رواں ہو گیا۔ ''مجھے اکھاڑ گیا...... پھر لگایا نہیں گیا۔ یوں ہوا جیسے کسی نے ڈونٹ پر حلیم ڈال دیا ہو۔ یا کڑاہی میں قورمہ اور اس میں فالودہ۔ جیسے جرابیں ہاتھوں پر چڑھالی ہوں اور......''

اور وہ ہنسنے لگی رئیس مسکرا بھی نہ سکا۔

''ارے میری زندگی میں آنے والے پہلے خوب صورت مرد! اب میں بہت آسودہ...... اور کچھ کچھ خوش بھی ہوں۔''

وہ آنکھ دبا کے بولی۔ وہ کالونی کے بلاکس میں چلتے گئے۔ ہالہ نے سرخ گچھوں سے نرم بال گردن سے اٹھائے اور رئیس کے برابر سے نکل کر سامنے آگئی۔ گردن پچھلی طرف سے آدھی اگلے حصے سے کٹی پھٹی تھی۔ یوں جیسے کسی نے گوشت کا قیمہ وہاں بھرا ہو

اور گہری لکیریں چھوڑ دی ہوں۔ رئیس کے چہرے کا رنگ معمول پہ نہ رہا۔

"میرا پورا جسم بھرا ہے ایسے ہی گلے سڑے قیمے نما گوشت سے۔" وہ شاید مسکرانا چاہتی تھی۔ بات مکمل کرنا چاہتی تھی۔

"اور میں کبھی فیملی نہیں بنا سکتی...... میں ماں ہی نہیں بن سکتی۔"

"اور...... یہ کہ مجھے بچپن سے جو بننا تھا...... وہ 'فیملی والی' ہی بننا تھا مجھے 'گھر' ہی تو کھینچتا رہا۔ یہاں سے وہاں۔" اب رئیس نے اپنا بازو اس کے کندھوں پر پھیلایا اور بس......

وہ سڑک پر چلتے جاتے اور اندھیرا گہرا ہوتا ان کے پیچھے پیچھے آتا جاتا جیسے ان کو جھپٹ لے گا...... اور پھر اس نے جھپٹ ہی لیا۔

☆☆☆

رئیس خان زادہ کو یکلخت ہی یہ لگنے لگا تھا کہ اس کی حس مزاح خاصی برق رفتار ہو گئی ہے۔ یہ دو جاڑوں بعد کی بات ہے۔

انتیس سالہ رئیس کو بالآخر ایک غیر سرکاری کالج میں لیکچرار کے طور پر تقرری کا اعزاز ملا تھا۔ مگر وہ تھکن زدہ لگتا۔ پارک کا ایک مخصوص گوشہ اب جیسے روزانہ ان کا منتظر رہتا یا پھر مسز کرنل کا لان یا سمیعہ آنٹی کا کچن۔

تب وہ پارک میں بیٹھے تھے درختوں پر ہریالی آنے میں ابھی دو ہفتے اور لگنے تھے۔

"جانتی ہو پرنسپل نے مجھ سے کیا کہا ہے؟ کہا کہ مستقل استاد چھٹی پر ہے اس لیے میری ضرورت ہے۔ وہ مستقل استاد اس دن میرے لیے ہی حاضر ہوئے تھے۔ بولے۔

عرفان صاحب اپنی سیلری میں سے دس ہزار آپ کو دیں گے۔ اور پانچ کالج فنڈ سے ملے گا۔ رئیس صاحب! آپ کو عرفان صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ اتنی رقم سے ہماری مدد کر رہے ہیں۔ ہالہ مجھے پہلی بار لگا کہ میں حق دار نہیں مستحق ہوں اور جہاں مجھے ایسا کچھ لگنے لگے میں تھک جاتا ہوں۔ میں عرفان صاحب کی مدد کو وہاں بلایا گیا تھا یا...... مجھے کبھی رویوں کی سمجھ میں نہیں آسکی۔ میں آخر کیا کر رہا ہوں؟ مجھے آخر کرنا کیا ہے؟ میرے ساتھی کب کے سیٹل ہو چکے اور میں......"

ہالہ نے اس کا کندھا تھپکا۔

"ہو سکتا ہے...... راہ کوئی اور ہو...... منزل کہیں اور سے ملنی ہو۔ چلنا تو مت چھوڑو۔" وہ گھبرا کے اٹھ گیا۔

پھر کئی دن بعد وہ ہنستے ہنستے ہالہ کو بتانے لگا......

تب وہ ڈنر بنا رہا تھا اور ہالہ پاس کھڑی تھی۔

"تم تیار رہنا اگلے ہفتے دادا آرہے ہیں ملتان۔ لاہور آئیں گے تو ملوانے لے جاؤں گا۔"

ہالہ نے پلیٹ منہ کے آگے کر لی۔

"کیا کر رہی ہو؟"

"شرما رہی ہوں۔" وہ ہنسا۔

"خوش فہمی اس پلیٹ جیسی ہو گی ناں؟"

دونوں مسکرائے اور دادا نے وہ کہہ دیا جو رئیس خان زادہ ہالہ سے کبھی نہ کہہ پاتا۔

☆☆☆

وہ شیخوپورہ سے ذرا ہی دور ایک فارم ہاؤس تھا۔ امارت چھلکاتی عمارت...... باوقار اور رعب دار دادا...... وہ سبز مشرقی لباس میں تھی۔ گھڑی گھڑی بال سنوارتی۔

"تمہاری گردن کا زخم کافی ہولناک دکھتا ہے۔" دادا شروع ہوئے۔ رئیس کہیں باہر ملازمین میں تھا۔

"مگر افسوس کہ یہ کریہہ زخم بھی تمہیں کچھ نہ سکھا سکا۔"

وہ زرد پڑنا شروع ہوئی۔

"تم آج بھی نڈر اور بے وقوف ہی ہو۔ خوب صورت بھی ہو اور ٹرک کے سامنے بھی کھڑی ہو۔ روندے جانے کے بعد تو تمہیں خود سے اٹھنا سیکھنا چاہیے تھا مگر تم نے رئیس کی شکل میں ایک اور ڈینی ڈھونڈ لیا میری بچی! جو تمہارے منہ میں لقمے ڈالتا۔ روتی کو بہلاتا۔ چیختی کو گلے لگاتا باپ لگتا ہے۔

"مگر کبھی یہ سوچا کہ کل کو وہ لڑکی ماما آئے گی تو رئیس کہاں ہو گا؟ اگر رئیس نہ ہوا تو تم کہاں ہو گی؟ تم

نے اپنے پر کھولنے تک نہیں سیکھے۔ اڑو گی کیسے؟"

وہ سفاک نہ تھے۔ لگ رہے تھے وہ ہولے ہولے صفر کی جانب دھکیلی گئی۔

"میرا پوتا تم سے کبھی شادی نہیں کرے گا ام ہالہ! کر ہی نہیں سکتا۔ وہ بہترین جین میوٹیشن ہے۔ ماہا سے بے وفائی...... وہ مر ہی تو جائے گا۔ کر بھی لے تو غیملی والا، ہونا تو اس کا خواب ہے۔ بے گھر، بچوں کا خواب تمہیں تو اچھی طرح علم ہوگا۔ اڑنا سیکھ لو میری بچی۔ اس سے زیادہ بے قوفی کے بعد تمہیں کوئی 'مسیحا' بھی نہ ملے گا۔" وہ 'علم والے' دادا سے اتنا ڈری جتنا موذی مرض والا ہر رات موت سے ڈرتا ہوگا۔

پھر وہ بول نہ سکی...... ہل نہ سکی...... بال سنوارنا تو دور......

"ماہا اور شاہ میر پچھلے چار ماہ سے ایک دوسرے کو ڈیٹ کر رہے ہیں۔"

واپسی میں وہ اتنا سرد ہوئی کہ رئیس برف کا مجسمہ ہوگیا۔

"یہ کیسا مذاق ہے؟" کتنی ہی دیر بعد اس کے منہ سے برف اڑ پائی۔

"تمہیں اس کے ہاتھ میں ڈھائی لاکھ کا فون نظر نہیں آیا کبھی۔ یا وہ فون شاہ میر کے ہاتھ میں نظر نہیں آیا پہلے کبھی؟"

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی۔ رئیس کا درد کیسے دیکھتی۔

"تمہیں یوں نہیں کہنا چاہیے۔" وہ کھائیوں جیسے لہجے میں بولا۔

"تمہارے دادا کو بھی یوں نہیں کہنا چاہیے۔" دل چیخا۔

گھر آنے تک بہت کچھ ڈھے چکا تھا۔ جوان دونوں میں تھا۔

☆☆☆

"میں نے رات تین بجے تمہیں کال کی تھی کہاں مصروف تھیں؟" اس نے اکڑے کندھوں سے پوچھا تو ماہا ادریس حیران ہوئی۔

"وہ...... میں میں، کیوں کی تھی کال؟" تیوری چڑھ ہی گئی۔

"یہ فون کب لیا تم نے بتایا ہی نہیں۔" اس نے اسی انداز میں پوچھا۔

"کیا ہوگیا رئیس؟ جان کو کیوں آجاتے ہو۔ کیا سننا چاہتے ہو؟"

"صرف سچ...... کیسا ہی ہو...... مگر سچ ہو۔" وہ اعتماد سے کہانی بننے لگی۔

"ہاں تو دنیا کے اکلوتے سچے شخص یہ فون مجھے شاہ میر نے دیا ہے اور میں مصروف بھی اس کے ساتھ تھی، پوچھو گے کیوں؟"

"نہیں۔" یک حرفی جواب۔ ماہا ادریس کی کہانی کو جھٹک کہ ایک طمانچہ سا اسے مارا۔

وہ اپنی جیکٹ سنبھالتا اٹھا۔

"سچ بولنے کا شکریہ...... احسان مند رہوں گا۔"

ماہا حیران ہوئی۔ تڑخ گئی۔

"ہونہہ...... واقعی احسان ہی ہوا۔ ام ہالہ سا مغربی جادو ہم نے ہی سونپ دیا تمہیں۔"

وہ چلتا ہی گیا۔ اور وہ جال بالکونی میں کھڑی ام ہالہ کو دہلا گئی۔ تھکن زدہ نہیں۔ شکست زدہ لگتا۔

"اتنے سالوں کا رشتہ...... رئیس جیسا ہیرا۔ لڑکی تم نے کیا کبھی سوچا بھی ہے؟" وہ ماہا سے بھڑ گئی۔

"اتنے سالوں سے سوچ ہی تو رہی تھی۔ کیا کروں گی رئیس کی مزیدار ہانڈیوں کا میں۔ تو اتنے سال شاہ میر کو ہی سوچا ہے میں نے۔"

"شاہ میر کی سوچ کا بھی سوچا ہے کبھی؟ وہ آسانی پسند نہیں رئیس جیسا۔ نہ ہی مستقل مزاج۔"

وہ پلیٹ آئی۔ اس عہد کے ساتھ کہ وہ ماہا ادریس کو لوٹا دے گی رئیس خان زادہ کی طرف۔

☆☆☆

بہار لاہور کو روشن کر رہی تھی اور پندرہ ہزار کماتا، احسان مند، سا رئیس خان زادہ روز کھانوں کی تراکیب بھول کر کوئی غلطی کر بیٹھتا۔ بالکونیوں، چھتوں پر ٹہلنا چھوٹ گیا۔ ہنسی پیچھے رہ گئی۔ خالد کی بہن کی سمسٹر فیس بھی رہ گئی۔

بالآخر پندرہ ہزار والی۔ 'باعزت' نوکری بھی گئی۔

وہ زیرو سے منفی زیرو ہو کر ناشتے، لنچ، ڈنر بناتا کھلاتا اور سوجاتا۔ نہیں شاید آنکھیں بند کر لیتا نیند تو نہ ہوئی۔

دادا ملتان وہاڑی زمینوں پر روانہ ہو گئے اور ادھر عکاشہ کراچی سے لوٹ آئی۔ زرد، فربہ اور ست، رئیس حتیٰ الامکان اس کا خیال رکھنے لگا مگر وہ بے زار انسان تھی۔

رات کے جانے کون سے پہر رئیس نے حملہ کرتی فوجوں سا شور سنا اور چوکنا ہوا۔ سمیعہ آنٹی کا چیخنا......شاہ میر کا دھاڑنا۔ نانا کی للکاریں اور ماموں کی خاموشی۔ وہ بستر پر لوٹ آیا۔ جہاں ایک نوعمر وجود خاکی وردی پہنے بیٹھا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے مجھے زبردستی گھریلو معاملات میں دخل دینا پسند نہیں۔" رئیس لیٹتے ہوئے مخاطب ہوا۔

"تو بالآخر ڈھائی سال بعد میں محترم ہو ہی گیا کہ تمہیں نظر بھی آ گیا۔" رئیس سر جھٹک کے رہ گیا۔

"ہالہ گئی تو ضرورت پڑ گئی میری؟"

"صرف ہالہ ہی نہیں...... اس بار تو ہمت بھی چلی گئی یارا۔

جانتے ہو...... ہماری ہمت کون ہوتا ہے؟ پہلا خواب...... پہلا رشتہ...... پہلا دوست اور پہلا قدم" وہ رکا رہا کافی دیر۔

"تم میرا پہلا خواب تھے یار...... کمیشن کا خواب، فوجی افسر بن کے مسافر ہونے کا خواب۔ مگر میں اپنے سخت جان ہاتھوں کی انگلیاں سیدھی نہ پیش کر پایا اور میڈیکل نے تمہیں مجھ سے چھین لیا۔ مگر تم ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ تھپکی دیتے رہے۔ ہر کسی کا پہلا خواب ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ اب تو سب چھوٹ گیا۔ خواب، رشتہ، دوستی، ہاں قدم رک ہی نہیں رہے۔"

وہ مضطرب سا لیٹا رہا۔ بالکونی میں جاتا تو ہالہ کا گھر نظر آتا۔ کسی کھڑکی چھت پر وہ نظر آتی تو اس کی شکست پڑھ لیتی۔ آوازیں آتی رہیں اور رات آگے بڑھتی رہی۔

☆☆☆

شاہ میر آج کل گھر پر نظر ہی نہ آتا۔ پورے گھر میں عجب وحشت ناچتی پھرتی۔ اذہان بوکھلایا سا کبھی اس کمرے میں جاتا کبھی اس، سمیعہ آنٹی نے عکاشہ کے کمرے میں جانے سے سب کو منع کر دیا۔ مگر اس کی دوائیوں کی تھیلیاں اور ڈاکٹر کے چکر بتاتے کہ وہ بیمار ہے۔ دن اتنے بے رونق کبھی نہ تھے اور راتیں اتنی طویل۔

ہالہ بھی اسے تلاشتی ادھر آتی تو جیسے زیادہ دیر رک نہ پاتی۔ وہ مسز کرنل کے ہاں جاتا تو بے دلی سے اٹھ آتا وہ یہ ماننا ہی نہ چاہتا کہ اگر ماہا کا شاہ میر میں دلچسپی لینا غلط تھا تو غیر شعوری طور پر وہ ماہا کو کب کا چھوڑ کر ہالہ کا ہاتھ تھام چکا تھا۔

وہ سبزیاں خرید کے گھر لوٹا تھا۔ ٹیکسی کو کرایہ تھما کے مڑا تو ماہا سرخ چہرہ لیے ـــــ کھڑی تھی۔

"کبھی غور سے دیکھا ہے تم نے خود کو؟ کیا ہو تم؟" رئیس بس خاموش رہا۔

"نہ خاندان، نہ گھر، نہ شکل، نہ بہترین مستقبل، کیا کرتی میں؟"

"تم نے جو کیا، بہترین کیا۔" وہ بول پڑا۔ ایک طرف سے گزرنے لگا۔

"میرے بہترین کو تم نے اپنے بدترین سے بدل لیا۔ تم اتنا کینہ چھپائے پھرتے ہو اور کہلاتے ہو سادھو۔ خود سے کچھ نہ ہو سکا تو تم نے یوں بزدلوں کی طرح انتقام لیا مجھ سے۔ تم نے اپنی دوست کو ہی چارہ بنا لیا میرے خلاف۔ تف ہے ہم سب پر جو تم کو فرشتہ سمجھتے رہے۔ تم نے حد ہی کر دی رئیس۔ وہ لڑکی میرے منہ پر کہہ گئی ہے کہ وہ شاہ میر کے ساتھ اس لیے ہے تاکہ میں تمہارے ساتھ ہو سکوں۔ اللہ تمہیں برباد کرے رئیس! تم نے یہ کیا کر دیا۔ میں نے کیا نہ کیا تھا شاہ میر کے لیے۔"

رئیس رکتا تو مر جاتا۔ گھر میں داخل ہوا تو جیسے کہانی کا انت ہی ہو گیا۔

تماشا لگا ہوا تھا۔ سارے کردار جمع تھے۔ سمیعہ آنٹی گرجیں۔

"اس کا کارنامہ دیکھیں اور اکڑ دیکھیں۔"

رئیس سبزیاں کچن میں رکھنے لگا اور معاملہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ سمیعہ آنٹی بولیں۔

"یہ دو ہفتے تو چھپالیا ہم نے۔ مزید دو ہفتے گزرے تو ہم اپنا منہ چھپاتے پھریں گے۔ بہت ہوگیا اب بس۔ انکل! آپ بات کریں ظفر صاحب سے۔ اسی ہفتے چھوٹی سی تقریب رکھ لیتے ہیں۔ رئیس اپنا ہی بچہ ہے اور کیا......"

رئیس ٹھٹک کے آگے بڑھا۔ اب وہ منظر میں تھا۔ عکاشہ نے ہتک سے دیکھا۔

"ممی! خدا کے لیے بند کریں یہ میلوڈراما۔ آپ کو سارے جہاں میں صرف یہ ناکارہ انسان ہی ملا ہے میرے لیے۔ میری طرف سے آج بھی نہ ہے اور ہر آنے والے کل میں بھی نہ ہی ہوگی۔"

رئیس کو بہت کچھ ایک ساتھ سمجھ میں آیا اور باقی بات نانا نے مکمل کردی۔

"یہ بھی خوب کہی تم نے بے حیا۔ یہ جو جسٹ انجوائمنٹ لیے گھوم رہی ہو، اس کو کس کا نام دوگی؟ کیا ہم سے یہ امید رکھتی ہو کہ ہم اس گناہ کو پالیں گے۔"

اس بات پر جہاں سب کی نظریں جھکی تھیں وہیں رئیس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

"دادا ابا! آپ ظفر انکل کو اطلاع دیں بس۔ اس کو لائن پر کیسے لانا ہے مجھ پر چھوڑ دیں۔" شاہ میر بولا۔ سارے فیصلے ہو رہے تھے اور وہ کہیں نہ تھا۔ وہ گونگا ہی تو ہوگیا، اپاہج بھی۔

"مما! مجھ سے غلطی ضرور ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں آپ لوگ اس عورت کے پلے باندھ دیں مجھے۔ خدارا کوئی مرد تو ڈھونڈا ہوتا۔" رئیس کا بہترین جین میوٹیشن والا ماسک تڑخ ہی گیا۔

"ایکسکیوزمی۔ آپ لوگ اپنی ہی غلط بیٹی کے غلط کام اور غلط فیصلے کے لیے مجھے کیوں بے عزت کروا رہے ہیں؟" وہ اتنا تو گرج کے بولا ہی کہ سب کو یک لخت چپ لگی۔

"اور تم......" وہ عکاشہ کی طرف مڑا۔

"تمہیں تو شرم سے گونگی ہو جانا چاہیے اگر مر نہیں سکتیں تو...... تم لگیں فیصلے کرنے۔"

وہ یقیناً رئیس نہ تھا۔ مضبوط دلائل...... اونچی آواز، اٹھے کندھے۔ کوئی پہاڑ بھی ہوتا تو وہ ریزہ کردیتا۔

"تمہیں یقین کیا شک بھی نہیں ہونا چاہیے کہ مجھ جیسا کورا اور کھرا شخص چارمنٹ بھی "تم جیسیوں" کے گرد کھڑا ہو سکتا ہے۔" وہ انسان ہی تھا۔ آج سب کو یقین ہوا مگر سمیعہ آنٹی بلبلائیں۔

"یہ تم کیا کہتے ہو لڑکے! یہ لہجہ...... یہ الفاظ۔ تمہیں ذرا لحاظ نہیں کہ اس گھر اور گھر والوں نے کیا نہیں دیا تمہیں۔ ساری زندگی کا لگاؤ ذرا حساب......"

"رہنے دیں مما!" شاہ میر سے چپ نہیں رہا گیا۔

"اسے اگر ابھی بھی کسی سے امید ہے تو یہ کہاں سنے گا کسی کی۔ دیکھ لے یہ بھی پر پھڑپھڑا کر۔ کچھ نہیں ہوگا اس کا۔"

شاہ میر کی آنکھوں نے اسے چیلنج کیا۔ اتنے دنوں...... کہنا چاہیے سالوں کی تھکان تھی، اب اعصاب چیخ ہی گئے۔

"اچھا...... تو تم دکھاؤ وہ سرخاب جن سے تمہیں کامیابی کی امیدیں ہیں؟" وہ شاہ میر کے سامنے تن گیا۔ "کیا کمی ہے مجھ میں؟ اگر میں اڑا نہیں تو مطلب یہ نہیں کہ بے پر ہوں بلکہ ایک غلط تھیوری تھی جس نے پر باندھ دیے۔

اور سمیعہ آنٹی! کیا دیا مجھے اس گھر اور گھر والوں نے؟ بتاؤں...... لگاؤں حساب......" وہ ہسٹریائی ہوا۔

"اس گھر نے مجھے محرومیاں، طعنے، ذلت، تنہائی اور تاریک مستقبل کے علاوہ صرف ایک اسٹور کا پلنگ ہی دیا ہے اور میں نے...... میں نے اس گھر کو مالی، چوکیدار، ٹیلر، شوفر، کک اور مینیجر دیا ہے۔ ان چھ عہدوں کی ماہانہ تنخواہ کم از کم دس ہزار بھی ہو تو مہینہ ساٹھ ہزار کے مقروض ہیں آپ لوگ میرے۔ پچھلے انیس سال کی تنخواہ کے بنے ایک کروڑ چھتیس لاکھ اسی ہزار۔ رہائش کا

پچتیس لاکھ رکھ بھی لیں تو ایک کروڑ کے مقروض ہیں میرے آپ لوگ۔ مجھے...... میری شخصیت کو تباہ کر دیا۔ میری انگلیاں کھانوں میں چمچ چلاتے ٹیڑھی ہو گئیں۔ مجھے فوج میں کمیشن نہ مل سکا۔ اتنی وفاداری اتنا جوکھم...... اتنی ریاضتیں...... رہا تو میں وہی ملحد نسل...... مجھے کچھ پسند آ گیا تو شاہ میر کا...... کچھ کو میں پسند آ گیا تو شاہ میر کا...... اور بالآخر پالنے کا احسان اور بدلا بھی کیسا اس لڑکی جیسا...... جس کی غلطی میرے ظرف سے بڑی ہرگز نہ تھی مگر جس کا غرور میری پہنچ سے بہت دور ہے۔ ہو گیا سب کا...... مجھے معاف کیجیے گا مگر مجھے بھی انسان سمجھنا شروع کر دیں۔"

وہ سانس لینے کو پچھلے صحن میں پہنچا۔ غصہ...... بے وقعتی...... کم مائیگی...... وہ ہانپتا رہا۔

"نازیہ رزاق کہتی ہے کہ محبت میں تغافل جنم لے لے تو تعلق بھی لاتعلقی کو آوازیں دینے لگتا ہے۔" ہالہ کی آواز پر وہ پلٹا۔ "تو آج سب معاملات برابر کر ہی دیے۔"

"محبت سانس لے تو ہی تغافل جنم لیتا ہے، یہ نہیں جانتی تمہاری نازیہ رزاق۔" وہ بھڑکا۔

"میں نے کبھی بھیک نہیں مانگی کسی سے۔ تم نے...... ہالہ نے میرے دو رشتوں کو بھیک بنا دیا میرے لیے۔ آخر سب کو میری زندگی میں خود ہی سب کچھ کرنے کی کیا پڑی ہے۔ تمہیں کیا ضرورت تھی شاہ میر سے تعلقات بنانے کی ام ہالہ! یہ تمہارا مغرب نہیں ہے اس سے توڑا...... اس سے جوڑا۔ اس سے واپسی پھر اس کی طرف......"

"رئیس......" ہالہ کو یقین نہ آیا کہ رئیس اسے ماضی کا طعنہ بھی دے سکتا ہے۔

"مجھے بخش دو ہالہ! نہیں چاہتا میں تمہیں، نہ ہی اس ماہا کو۔ کچھ نہیں چاہیے مجھے سوائے سکون کے۔" وہ چلانا بند ہوا تو بولی۔

"تم جانتے تھے، تمہارے دادا غلط کہتے ہیں۔ بہترین جین میوٹیشن کچھ نہیں ہوتی۔ جین میوٹیشن ہے ہی اک غلطی کا نام۔ تم غلطی ہو رئیس...... ہم سب کی......"

وہ روتی ہوئی پلٹی تھی۔ رئیس نے پتے اس کے پیروں سے لپٹتے خود دیکھے اور سب کچھ اس بہترین بنتے عام سے انسان نے خود ہی ختم کر دیا۔

☆☆☆

"آپ مجھے غلط سکھاتے رہے دادا!" وہ روتا تھا بے تحاشا۔

"آپ مجھے فرشتہ بناتے رہے اور میں نہ تھا۔ آپ نے مجھے سچ بولنا سکھایا اور بچوں کی طرح ڈٹ جانے سے منع کیا۔ آپ میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ دیکھتے رہے اور اونچی سے اونچی عمارت بناتے رہے میری۔ سمجھوتا، نقش کشی...... اور تھکن یہ کون سا سبق پڑھاتے رہے آپ مجھے۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنا تھا مگر آپ کی تھیوری...... زرافہ بن جاؤ۔ تفحیک سہو۔ چپ رہو۔ مجھے ماہا سے لگاؤ تھا، ہالہ سے محبت...... آپ نے یہ سکھا دیا بے وفا ہونا میرے جیسا مرتد ہونا ہے۔ میں ڈر گیا دادا! کاش آپ مجھے متاثر کرنے کے حربے نہ سکھاتے مگر عام انسان سا ترقی پسند ہونا سکھا دیتے۔ آپ مجھے بتا دیتے کہ ماہا اور لیس مجھے چھوڑنے کے لیے ہی میرے ساتھ بندھی تھی۔ آپ مجھے زہریلی امیدوں سے بھی واقف کرا دیتے۔ آپ مجھے بتا دیتے کہ صبر کے ساتھ ظرف کی وسعت کی بھی شرط ہے۔ جو آپ نہ ہو سکے۔ میرا باپ نہ ہو سکا۔ وہ مجھ میں کیسے ہوتا؟ دیکھیں، اب میں کیا ہو گیا ہوں۔ میں انتیس سال کا کھردرے چہرے اور تاریک مستقبل والا مرد بن گیا ہوں۔ جو اتنا احسان فراموش ہے کہ سسکتے ہوئے کو گلے لگانے والے ماموں کو حساب کتاب بتا کے انہیں اپنا مقروض کرا آیا ہوں۔ وہ ماہا اور لیس کہ جس کے پیچھے میرے بہترین چھ سال گئے، آج اسے خود کی نفرت میں مبتلا کر آیا ہوں۔ وہ ام ہالہ کہ جو میں خود تھا...... اس کے لیے میں خود کو غلطی کرا آیا ہوں۔ اپنی پندرہ ہزار کی اوقات کو صفر ہی کر آیا ہوں۔ دادا دیکھیں میں جیتے جیتے مر آیا ہوں۔ آپ مجھے اپنی تھیوری کا مفروضہ نہ بناتے، آپ مجھے زرافہ نہ بناتے...... خود سے لگا کے رکھتے اگر

میں خود آپ کے پاس گیا تھا تو...... میرا ماضی ٹھوکر تھا۔ حال بے حال اور مستقبل خاکستر ہو گیا ہے آپ کے تجربوں میں۔"

شیخوپورہ کا وہ فارم ہاؤس اس کی سسکیاں سنتا رہا۔

اس رات نیند کی گولی کھاتے ہی رئیس خان زادہ نے اپنے باپ رؤف خان زادہ کو پیغام لکھا تھا۔

"مجھے کینیڈا میں رہنا ہے۔ کاروبار کے لیے رقم میرے پراپرٹی میں حصے سے ایک ڈالر بھی کم نہ ہو۔"

ظفر خان زادہ اس کے دادا نے بھی فالج زدہ ہونے سے پہلے اپنی وصیت میں ساری جائیداد رئیس کے نام کی تھی اور اپنے بیٹے رؤوف کو رئیس کی بات ماننے کا کہا۔

جب وہ فالج زدہ...... وہیل چیئر پر بیٹھے دادا کو لے کر واریک شائر میں ہوٹل بنانے آیا تو دس سالوں نے اسے بہتر سے بہترین کر دیا۔

☆☆☆

اخروٹ سے بنے گھر میں کتنے ہی قدم دھمکے، کتنی ہی آوازیں گونجیں۔ ملازم ہر تاریک گوشے میں جگنو بھرتے پھرتے۔ وہ چھ بچے جو امریکہ سے بڑے بے نیاز سے آئے تھے۔ اب گھر کو روندتے جاتے، کھاتے، کھیلتے۔ ظفر خان زادہ کی آٹو وہیل چیئر ایک کونے میں اس عورت کے سامنے تھی، وہ کہہ رہے تھے۔

"میرا ماننا ہے کہ محبت کے اگر پاؤں ہوتے تو بلی کی خصلت کے ہوتے۔ حرکت کرتی چپ والے، بے خبری میں چاٹ جانے والے۔ رئیس خان زادہ بھی محبت کی بے آواز چال کو بروقت سن نہ سکا۔ کچھ میرے جیسے استاد نے اسے فلسفوں میں ایسا الجھایا کہ وہ مشکلوں کو پار نہیں بلکہ توڑ کر باہر نکلا۔ ہاں مگر میں گواہ ہوں اس کے ہر اطلاعی گھنٹی یا فون کی گھنٹی پر چونک جانے کا۔ کسی گھنگھریالے سرخ بالوں والی یا گہری سبز آنکھوں والی کو بار بار دیکھنا مجھے یاد ہے۔ مجھے خبر ہے اس کے روابط کی جو مسز کرنل سے کرنل صاحب تک ہی محدود رہ گئے۔

میں شاہد ہوں اپنے پوتے کی ویران زندگی کا۔

ام ہالہ! میں تم سے تمہیں مانگتا ہوں اپنے پوتے کے واسطے۔ وہ امریکہ سے لوٹا تو یقین مانو وہیں کہیں رہ گیا۔ اس کے اسسٹنٹ نے تمہارا کارڈ مجھے دیا اور کہا وہ سنہری بالوں والی لڑکی میں ہی کچھ راز ہے سر! جانے مجھے کیوں لگا کہ زندگی ہمیں ہالہ سے دوبارہ ملوانے والی لگی ہے اور اس بار میں خود اس سے یہ کہنے والا ہوں کہ میرا پوتا تمہارے علاوہ کسی اور کا نہ ہو سکے گا۔"

ہالہ بس دیکھتی رہی اس بوڑھے شخص کا چہرہ۔ وہ دفتر سے لوٹا تو چہل پہل نے خاصا متاثر کیا۔ سیاہ و سفید فام چھ بچے۔ ڈرائنگ روم کی دہلیز پر وہ لاہور میں ارزاں ہوتا رئیس ہو گیا کہ سامنے والے کی مسکراہٹ فقیر کر دے۔

چیری کے پودے پر چھوٹی چھوٹی مصنوعی روشنیاں بندھی تھیں۔ بچے مختلف ڈیزرٹ چکھتے اور کچھ دادا کو چکھاتے۔

"ہالہ! تم اس عمر میں...... شتر مرغ کے گھونسلے سے بال لیے اگر کبھی کو شادی کے لیے منا بھی لو گی تو تمہارے یہ چھ بمبار اس بے چارے کی ہاں حلق میں ہی دبا کے منہ چاکلیٹ سے بھر دیں گے۔ تم کوئی ایسا ڈھونڈو، جوان بچوں کا منہ ہی بھرا رکھے۔"

وہ سرگوشیاں کرتا، ہالہ مسکراتی۔

"تمہیں معلوم ہے رئیس! تم تین بار باتوں ہی باتوں میں مجھے پروپوز کر چکے ہو۔"

"تو تم ہاں جو نہیں کرتیں۔ ویسے یہ بال کب رنگ بدل کے اصل رنگ میں لوٹیں گے؟"

ہاں اس نے ابھی بھی نہیں کی کیونکہ اسے یقین تھا کہ رئیس جانتا ہے، ناں کبھی بھی نہیں تھی۔ ان تینوں نفوس نے زندگی سے اپنے حصے کا سبق سیکھ لیا تھا۔

ہالہ نے مرتے مرتے جینے کا...... رئیس نے انسان ہونے کا اور ظفر خان زادہ نے بندگی کا۔

فضا میں دھند اٹھ رہی تھی اور ظفر خان زادہ کے کمرے سے سورۃ رحمٰن کی قرأت بھی۔

☆

فائزہ ثمرین

رقصِ شرر

بیلا نے سنگنگ کمپٹیشن میں حصہ لیا اور جیت گئی۔ وہ جس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی وہاں اس کی اجازت نہ تھی۔ اپنے نانا کا خواب پورا کرنے کے لیے وہ اس میں حصہ لیتی ہے۔ جب ان کو پتا چلتا ہے تو وہ اپنی بیٹی کا سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک مشہور موسیقار ہیں۔

قاری عبدالوہاب صاحب ملک گیر شہرت کے حامل تھے انہیں قاری عبدالباسط کا شاگرد ہونے کی وجہ سے مصر میں بھی پذیرائی حاصل تھی۔

مایا بیلا کے گھر فون کر کے بتا دیتی کہ اس نے موسیقی کے پروگرام میں حصہ لیا ہے۔ اس کے گھر میں بھونچال

آجاتا ہے لیکن ابا بہت خوش ہوتے ہیں۔
بیلا کی خالہ اور کزن بیشا بھی بہت خوش ہوتے ہیں وہ خود بھی موسیقی کی دنیا سے وابستہ ہیں۔
تقسیم سے پہلے تارا سنگھ اور امانت علی کے گھر آمنے سامنے ہوتے ہیں دونوں کو موسیقی ۔ سے لگاؤ ہے۔ دونوں گھرانوں کے لوگ مغل دربار میں گا کر داد وصول کرتے تھے۔
تارا سنگھ اور امانت علی کے درمیان گائیکی کا مقابلہ ہونا ہے دونوں اس کی تیاری کرتے ہیں۔

1947 میں ساون کا مہینہ تھا، دونوں کے مقابلے کی گونج دور تک تھی مقابلے کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ یہ مسلم اور غیر مسلم موسیقار کا مقابلہ بن گیا۔ جگجیت خبر دیتا ہے کہ انہیں مارنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ امانت پاکستان جانے سے انکار کرتا ہے لیکن۔

گھر والے پاکستان چلے جاتے ہیں امانت چھپ جاتا ہے گھر کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ وہ بھی ایک قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچ جاتا ہے۔

بیلا مقابلے میں اس راگ کو گاتی ہے جو امانت علی نے سالوں سے اپنے دل میں چھپا رکھا ہوتا ہے۔

بیلا پھپھو کے گھران کے بیٹے عاطف کے لیپ ٹاپ سے دادا جی سے بات کرتی ہے ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے وہ سب ایمر جنسی میں پاکستان آتے ہیں۔

افنان اسے اسٹیج پر پرپوز کرتا ہے۔ بیلا جواب دیے بغیر آگے بڑھ جاتی ہے۔

تیسری قسط

انہوں نے امانت کو بچانے کے لیے لائحہ عمل تو تیار کر لیا تھا مگر جوں جوں وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اور پھر یہ اتفاق ہی تھا کہ پریم چند اور امانت علی اس راستے پر جا نکلے جہاں یہ جیتندر بیٹھا تھا۔ پندرہ سالہ جیتندر ویسے ہی تھوڑے دل کا تھا لیکن جب شرپسندوں کے جتھے نے امانت علی اور پریم چند کو پیٹنا شروع کیا تو وہ بالکل ہی بدحواس ہو گیا اور خود بھی مارنے والوں میں شامل ہو گیا تھا مگر یہ امانت علی کا خون آلود چہرہ اور بے ہوش وجود تھا جس نے اس کی کھوئی ہوئی ہمت بحال کی اور وہ چلا چلا کر کہنے لگا۔

”استاد جگجیت نے کہا تھا، امانت کو مارنا نہیں، وہ اس کا راگ سن کر اسے مکتی دیں گے۔“

اس کی بات سن کر بپھرے ہوئے وہ لوگ کہاں رکنے والے تھے۔ اس نے امانت پر گر کر، اپنے سارے وجود سے اسے ڈھانپ کر اور بار بار اپنی بات دہرا کر بمشکل امانت اور پریم چند کی جان بچائی تھی اور انہیں کرتار اور جگجیت سنگھ تک پہنچایا تھا۔

پریم چند کو اس کے گھر پہنچا کر وہ امانت علی کو اپنے گھر لے آئے تھے اور اس کے خون آلود وجود کی مرہم پٹی کرتے وہ خون کے آنسو روئے تھے۔ امانت زخمی تھا، بے ہوش تھا اور ادھر شرپسندوں کا اسے مارنے کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔ آخر انہوں نے اسے کرتار سنگھ کے ایک دوسرے گودام میں بنے تہہ خانے میں چھپا دیا۔ بے ہوشی کے دوران اس کی بڑبڑاہٹوں سے وہ جان چکے تھے کہ امانت ان سے بدگمان ہو چکا ہے مگر یہ وقت اس کی بدگمانی دور کرنے کا نہیں تھا سو جیسے ہی انہیں بلوچ رجمنٹ کے زیر نگرانی ایک قافلے کے جانے کی خبر ہوئی، وہ انہیں بے ہوشی کی حالت میں ہی اس قافلے کے حوالے کر گئے اور اگر وہ بے ہوش نہ بھی ہوتے تو ان کے سر پر وار کر کے انہیں دوبارہ بے ہوش کرنے کا ارادہ تھا کیونکہ ہوش میں آتے ہی امانت علی چیخ چیخ کر انہیں گالیاں دیتے تھے یا پھر اپنے والدین اور بہنوں کا پوچھتے تھے۔

جگہ جگہ سکھوں کی ٹولیاں ان کی بو سونگھتی پھر رہی تھیں۔ تہہ خانے کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر راستے میں ان کا چلانا ایک مسئلہ بن جاتا۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ عرصہ بعد جب حالات معمول پر آ میں گے تو یہ بدگمانی بھی ڈھل جائے گی۔

وہ یہ جان ہی نہیں سکے تھے کہ ان کے امانت علی کے سر پر وار کرنے والی بات نہ صرف امانت علی نے اپنے پورے ہوش و حواس میں سنی تھی بلکہ ان کے دل میں جو تھوڑا بہت شک تھا اس پر تصدیق کی مہر لگ گئی تھی۔

امانت علی کو پاکستان روانہ کرتے وقت وہ بے حد پرامید تھے کہ اچھے دن لوٹ آئیں گے اور ان کا رابطہ پھر سے بحال ہو جائے گا مگر کیا خبر تھی کہ تیرہ سالہ امانت علی اور پندرہ سالہ تارا سنگھ کے درمیان پیدا ہونے والی بدگمانی دور ہونے میں تریسٹھ برس کا عرصہ حائل ہو جائے گا۔

بیلا چپ ہوئی تو دم سادھ کر یہ داستان سنتی وہ سب جیسے خواب سے جاگی تھیں

''او مائی گاڈ۔ تو بیلا! جو مقابلہ تم جیت کر آئی ہو، قدرت نے وہ اتنے برس پہلے شروع کروا دیا تھا۔'' یہ نیا تھی۔

''امیزنگ۔ اس کہانی کے کردار اگر زندہ نہ ہوتے تو میں کبھی بھی اس پر یقین نہ کرتی۔'' فی بی جیسے ابھی تک خواب میں تھی۔

بیلا کو پاکستان آئے ڈیڑھ ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا اور اپنے انٹرویوز اور دیگر پروگراموں سے وہ بمشکل آج کچھ فارغ ہوئی تو وہ سب بیلا سے ملنے اس کے گھر چلی آئی تھیں۔ ماہا کو پتا چلا تو وہ بھی آ گئی تھی اور پھر یوں ہی باتوں باتوں میں اس نے ماضی کی وہ داستان چھیڑ دی تھی۔ دراصل اسے تجسس تھا کہ کرتار سنگھ اور امانت سر کے درمیان دوبارہ دوستی کیسے ہوئی کیونکہ میڈیا میں تارا سنگھ کے پاکستان امانت علی کے پاس آنے کی خبریں گرم تھیں۔

پھر نیا، بیا اور فی بی کا تجسس دیکھتے ہوئے بیلا نے انہیں شروع سے ساری داستان کہہ سنائی اور وہ سب جیسے دنگ رہ گئی تھیں۔

''ویسے بیلا! کرتار سر اور تمہارے نانا جی کے درمیان غلط فہمی دور ہونے میں ساٹھ، پینسٹھ برس لگ گئے۔ تمہارے اور افنان کے درمیان بدگمانی دور ہونے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ اتنا وقت نہ لگا دینا، بوڑھی ہو جاؤ گی۔'' بات کرتے ہوئے آخر میں بیا کا لہجہ شرارتی ہو گیا تھا۔

''کیا مطلب...... کون سی بدگمانی؟'' بیلا گڑبڑائی تھی۔

''اوہو، بنومت اب۔ جیسے تمہیں تو پتا ہی نہیں، ویسے تم نے بے چارے کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ لائیو انسلٹ، وہ کلپ ملینز ویوز لے چکی ہے۔'' ماہا نے بظاہر افسوس سے سر ہلایا تھا مگر آنکھوں سے شرارت صاف جھلکتی تھی۔

''شٹ اپ۔'' بیلا سرخ پڑ گئی تھی۔

''اس کے اپنے لوگوں نے کون سا اس کے ساتھ اچھا کیا ہے۔ پتھراؤ تک تو کیا ہے اس کے گھر پر۔ سوشل میڈیا پر جو طوفان اٹھا ہوا ہے وہ الگ۔'' فی بی بولتے بولتے ایک پل کو رکی۔

''خیر...... بیلا تمہیں اس کے لیے وہ والا گانا تو گا ہی دینا چاہیے تھا۔''

''کون سا...... کون سا؟'' بیلا سے پہلے ان تینوں کو تجسس ہوا تھا۔

''کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو۔'' فی بی کا گنگنانا اور ان کے قہقہے بے ساختہ تھے۔ بیلا نے بے ساختہ کشن اٹھا کر فی بی پر برسانا شروع کیے تھے۔

''بیلا! اس نے پھر اس معاملے میں کوئی پیش رفت کی۔ آئی مین......'' قہقہوں کا طوفان کچھ تھما تو بیا نے کچھ سنجیدہ سے انداز میں کہا۔ بیلا ساکت رہ گئی تھی۔

کیا وہ انہیں بتا دے کہ کرتار جی کے ذریعے وہ نانا جی سے بات کر کے انہیں اپنا ہم نوا بنا چکا ہے اور کرتار سنگھ کا پاکستان آنا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے والدین بھی پاکستان آنا چاہتے ہیں مگر بیلا اور اس کے والدین کی رضا ہے۔

اس نے ایک پل ان سب کے پرتجسس چہروں کو دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' عبدالرحمٰن، مریم کے مسلسل انکار پر جھنجلا گئے تھے۔

''وہ ہماری ساری شرائط ماننے کو تیار ہیں اور اگر تم افنان کے انڈین ہونے کی وجہ سے انکاری ہو تو

وہ برٹش نیشنلٹی بھی رکھتا ہے۔ انگلینڈ شفٹ ہونے کا کہہ رہا ہے۔ انڈیا میں بیلا کو نہیں رکھے گا وہ۔"

وہ اب بے حد ضبط سے ایک بار پھر مریم کو سمجھا رہے تھے۔ انہیں افنان ہر لحاظ سے پسند آیا تھا۔ ہینڈسم، مؤدب اور ذہین۔ پھر ایسے مشہور سنگر اور ایکٹریس کا بیٹا جن کے وہ خود بھی فین رہ چکے تھے۔ افنان سے شادی کر کے بیلا کہاں سے کہاں پہنچ سکتی تھی اور وہ خود...... بیلا کے والدین کی حیثیت سے وہ خود بھی تو لائم لائٹ میں آجاتے مگر یہ سب وہ وجوہات نہیں تھیں جن کی وجہ سے وہ بیلا کی شادی افنان سے کرنے پر تلے تھے۔ یہ افنان اور بیلا کے بیچ محبت تھی جو انہیں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ محبت اگر افنان کی زبان سے بول رہی تھی تو بیلا کی بے بسی بھری خاموشی سے بھی صاف جھلکتی تھی۔ ان کی بیٹی اگر سارا اختیار انہیں سونپ کر خاموش تھی تو وہ بھی اس کا مان رکھنا چاہتے تھے مگر مریم......

انہوں نے تھک کر مریم کو دیکھا جن کے چہرے پر صاف انکار لکھا تھا۔

"وجہ افنان کا انڈین ہونا نہیں ہے۔ وہ انڈیا نہ چھوڑے مگر آج سنگنگ چھوڑنے کا اعلان کر دے تو میں آج بیلا کا رشتہ اسے دینے کو تیار ہوں۔" آخر مریم نے بلی تھیلے سے باہر نکالی تھی۔

"مجھے کبھی کبھی شک گزرتا ہے، کیا واقعی تم استاد امانت علی کی بیٹی ہو۔"

مریم کی بات سن کر عبدالرحمٰن تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولے تھے۔

"شک تو پھر مجھے بھی ہونا چاہیے کہ کیا آپ واقعی قاری عبدالوہاب کے بیٹے ہیں۔"

مریم نے بھی دو بدو جواب دیا تھا اور عبدالرحمٰن ہر معاملے میں اپنا ساتھ دینے والی مریم کی اس ہٹ دھرمی پر دنگ رہ گئے تھے۔ وہ ان کی کچھ سننے پر تیار ہی نہیں تھیں۔

"ساری زندگی گلوکاروں اور موسیقاروں کے درمیان رہنے کے باوجود تمہیں وہ اتنے برے لگتے ہیں کہ آج اپنی بیٹی کا رشتہ تم ایک گلوکار کو دینے پر تیار نہیں۔ کیا تم آج غرور کے اسی مقام پر نہیں ہو، جہاں کبھی قاری صاحب کھڑے تھے۔ تمہیں صرف موسیقار کی بیٹی ہونے کی وجہ سے میری زندگی میں لانے سے انکار کرتے۔" عبدالرحمٰن نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"بات میری پسند ناپسند کی کہاں رہی ہے۔ بات تو اللہ کی ماننے یا انکار کرنے پر آ گئی ہے۔ یہ غرور نہیں ہے جو مجھے افنان کا رشتہ قبول کرنے سے روک رہا ہے اور نہ اباجی کے انکار میں غرور تھا۔ یہ اللہ کا ڈر ہے جو اس وقت انہیں اور آج مجھے انکار کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔" مریم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"اور اگر آج اباجی ہاسپٹلائزڈ نہ ہوتے تو...... یا پھر بھی آپ کا فیصلہ یہی ہوتا۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ بیلا کی گلوکاری کی وجہ سے ہی وہ اس حال میں پہنچے ہیں اور......"

"بس......" عبدالرحمٰن صاحب نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"تم ہو یا قاری صاحب، تم لوگ اپنی زندگی، اپنی مرضی سے گزار چکے ہو۔ اب میری بیٹی کی زندگی کا معاملہ ہے تو مرضی بھی اس کی چلے گی۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھے اور کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

"اپنی مرضی......" مریم بڑبڑائی تھیں۔

"اپنی مرضی کہاں، اس دنیا میں انسان اپنی مرضی چلانے کہاں آیا ہے۔ وہ تو اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گزارنے آیا ہے۔" مریم نے کہنا چاہا مگر عبدالرحمٰن سننے کے لیے رکے نہیں تھے۔

☆☆☆

مریم بے حد بے بسی کے عالم میں قاری عبدالوہاب صاحب کا ہاتھ پکڑے بیٹھی تھیں۔

"آپ ایسے وقت میں ہم سے دور ہوئے ہیں، جب مجھے اور بیلا کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔

جو ہو رہا ہے، جو ہونے جا رہا ہے، میں اسے روک نہیں پا رہی مگر...... آپ ہوتے تو شاید روک ہی لیتے۔"

آنکھوں میں آنسو لیے، ہسپتال کے اس کمرے میں بیٹھی مریم شاید زندگی میں پہلی بار ان سے یوں بے تکلفی سے بات کرنے کی جرأت کر رہی تھیں۔ اور یہ جرأت بھی ان میں اس لیے آئی تھی کہ قاری صاحب ان سے کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھے اور ان کی وہ آنکھیں جن میں مریم کو دیکھتے ہی ناگواری آجاتی تھی، بند تھیں۔

"بیلا کی شادی ہو رہی ہے۔" ان کی آواز کپکپائی تھی۔ "اور پتا ہے کس سے؟ وہ گلوکار ہے۔ ایک انڈین گلوکار ہے۔ اور...... بیلا خوش ہے اور عبدالرحمٰن...... وہ مان گئے ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، کاش آپ اسی وقت بیلا کو روک لیتے۔ آپ نے اسے کیوں جانے دیا۔" وہ سسکی تھیں۔

"وہ رک جاتی آپ کے روکنے سے مگر......"

مریم کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو قاری صاحب کا ہاتھ تر کر رہے تھے اور وہ ساکن تھے، کسی مجسمے کی طرح۔

"آپ بڑی زیادتی کر گئے اباجی! میری بچی کو جس سوال کا جواب لانے کے لیے آپ نے بھیجا تھا وہ اسے خاردار راستوں پر چلائے گا۔ وہ بچ نہیں پائے گی...... زخم زخم ہو جائے گی......

اور...... کیا پتا وہ راستہ ہی بھٹک جائے۔ جواب لانا ہی بھول جائے۔ واپس پلٹ ہی نہ سکے پھر......"

مریم جیسے خود کلامی کر رہی تھیں۔ پتا نہیں قاری صاحب تک ان کی آواز پہنچ بھی پا رہی تھی یا نہیں۔ وہ تو یہاں بس اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے چلی آئی تھیں۔

نہ وہ افنان اور اس کے والدین کو پاکستان آنے سے روک پائیں اور نہ ہی افنان کی والدہ کی آنکھوں سے جھلکتی ناگواری اور ناپسندیدگی کو بنیاد بنا کر بیلا اور عبدالرحمٰن سے انکار کروا پائی تھیں۔

وہ چپ چاپ اپنے لوگوں کو ان کا والہانہ استقبال کرتے، ان کے اعزاز میں عشائیہ دیتے اور ٹی وی پر انٹرویو دیتے دیکھتی رہی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بہت خوش قسمت ہیں کہ ان کی بیٹی کی ایسی جگہ شادی ہو رہی ہے۔ ان کی بیٹی بے حد خوش قسمت ہے کہ انہیں ایسا چاہنے والا مل رہا ہے۔ اور وہ چاہ کر بھی اپنی لاڈلی کو بدقسمت نہ کہہ پائی تھیں اور اب تو شاید کچھ کر گزرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔

بیلا کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی۔ کچھ دن گزرتے پھر شادی کی تقریبات کے لیے ان سب نے اٹلی چلے جانا تھا۔ شادی کی تقریبات، انڈیا اور پاکستان کے بجائے وہیں ہونا تھیں۔ کیونکہ بیلا اور افنان دونوں ہی اب سیلبریٹی بن چکے تھے، تقریبات اگر پاکستان میں کی جاتیں تو فینز نے ناطقہ بند کر دینا تھا اور اگر انڈیا میں کی جاتیں تو فینز کے ساتھ ساتھ شرپسند عناصر سے بھی خطرہ تھا۔ کیونکہ ایک مسلمان پاکستانی لڑکی سے افنان کی شادی کو وہاں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جا رہا تھا۔

جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے، مریم کے دل کی بے قراری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ یہ شادی رکوانے کے لیے بیلا کے ددھیال سے بھی کوشش ہوئی تھی، مگر وہ بھی کچھ نہیں کر پائے تھے۔ عبدالرحمٰن کسی کی سننے پہ تیار ہی نہیں تھے۔ آخر انہوں نے شادی کا ہی بائیکاٹ کر دیا تھا اور کسی بھی تقریب میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔

ان ہی بے بسی بھرے دنوں میں مریم کراچی آئی تھیں۔ عبدالوہاب صاحب کی جتنی کمی انہیں اب محسوس ہو رہی تھی، پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ عبدالرحمٰن اور رابیل جتنی محبت ان سے کرتے تھے۔ شاید وہ انہیں اس شادی سے روک ہی لیتے مگر اب......

اب تو وہ ہاسپٹل کے کمرے میں، اپنے بیڈ پر کسی مجسمے کی طرح ساکن پڑے تھے اور مریم بے حد بے بسی کے عالم میں ان کا ہاتھ پکڑے روتی ہی جا رہی تھیں۔ ڈھیر سارا رو چکنے کے بعد وہ خود ہی چپ ہو

گئیں۔ ایک صبر سا آ گیا تھا خود ہی۔ آنسوؤں کو دونوں ہتھیلیوں سے صاف کرتی، وہ بیگ سنبھالتی اٹھیں اور مڑ کے دیکھے بنا نکلتی چلی گئیں۔ مڑ کر دیکھتیں تو شاید جان ہی لیتیں کہ قاری صاحب کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں کچھ لمحوں کے لیے کپکپائی تھیں۔

تو کیا وہ ہوش میں آ رہے تھے؟

☆☆☆

منظر رات کا تھا۔ آدھے چاند کی رات اور تاروں بھرا آسمان، مقام انڈونیشیا کا کوئی گمنام جزیرہ تھا اور اس کے پانیوں پہ تیرتی وہ پھولوں سے بھری کشتی تھی۔ جس پہ وہ دو محبت کرنے والے متوالے سوار تھے۔ سفید کشتی پانیوں کے تقریباً درمیان میں تھی۔ انجن بند تھا اور وہ دھیرے دھیرے پانی پہ ڈول رہی تھی اور اس کشتی پہ پھول تھے ہر طرف پھول ہی پھول۔ ہر رنگ کے پھول، گلابی، پیلا، اودا، سفید، عرشے پر نیچے فرش پر ہر طرف......

ان کی خوشبو شامِ جاں کو معطر کر رہی تھی اور ان پھولوں پہ وہ کھڑی تھی کسی شہزادی کی طرح، سر پہ ہیروں کا تاج سجائے، پیروں کو چھوتی سفید میکسی میں بال کھولے وہ ایک اپسرا تھی، افنان بالکل اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا اور گلاب کا پھول اس کی طرف بڑھا دیا۔ بیلا نے مسکراتے ہوئے گلاب کا پھول تھام لیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک شرارت تھی۔ کسی شگفتہ یاد نے گلابی ہونٹوں میں مسکان بھر دی تھی۔ وہ شادی کے بعد ورلڈ ٹور پہ نکلے ہوئے تھے اور آج کی رات انہوں نے کھلے آسمان تلے اس بوٹ پہ گزارنی تھی۔ ان کے سیکورٹی گارڈز کی بوٹس ان سے اتنے فاصلے پہ تھیں کہ ان کی دور سے جھلملاتی لائٹس ہی نظر آ رہی تھیں۔

افنان گہرا سانس لے کر اٹھا، اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

''اگر میں یہ پھول اب بھی تم سے نہ لیتی تو......'' بیلا لب دانتوں تلے دبائے، ہنسی روکتی اس سے پوچھ رہی تھی۔

''ارے کیوں نہ لیتیں۔ تمہیں یہ پھول دینے کے لیے ہی تو میں نے اتنی لمبی چوڑی پلاننگ کی ہے۔''

افنان بگڑا تھا۔ بیلا کی ہنسی نے اسے اپنی وہ تاریخی بے عزتی یاد دلا دی تھی جس کی ویڈیو ابھی بھی یوٹیوب پہ موجود تھی۔

''اچھا، اسی لیے اس ڈریس پہ اصرار کر رہے تھے۔'' بیلا میکسی کے گھیر کو چٹکی سے پکڑے ذرا سا گھومی۔

''بالکل۔'' افنان مسکرایا تھا۔

''ویسے افنان! تم نے کیا سوچ کر اتنے سارے کیمروں کے سامنے مجھے لائیو پرپوز کیا تھا۔'' بیلا نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔

''یار! میں سمجھا کہ سب کے سامنے کم از کم عزت تو رکھ ہی لو گی، مگر بڑی ظالم شے ہو تم، قسم سے، بڑی انسلٹ ہوئی تھی اس دن میری اور میں نے بھی سوچ لیا تھا، شادی کرنی ہے تو اسی مغرور لڑکی سے کرنی ہے۔'' بیلا کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

''اچھا تو محبت نہیں تھی، ضد میں کی ہے یہ شادی......'' وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑ رہی تھی۔

''محبت ہی تو ہے بیلا! محبت ہی تو ہے جس کے لیے فیملی کو بھی ناراض کیا۔ ملک بھی چھوڑ دیا، محبت ہی تو کرواتی ہے یہ۔ ضد میں انسان اپنا دیش کہاں چھوڑتا ہے۔ پتا ہے بیلا! جہاں پہ انسان جنم لیتا ہے ناں، اس کی محبت انسان کے اندر بہت گہری ہوتی ہے۔ بہت اندر تک ہوتی ہے۔ اسے چھوڑنا آسان نہیں ہوتا مگر، تمہارے لیے وہ بھی چھوڑ دیا......''

افنان اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔ شادی کے بعد پتا نہیں یہ کون سی دفعہ تھا جب وہ بیلا سے اپنی بے تحاشا محبت کا اظہار کر رہا تھا اور ہر دفعہ بیلا ایک نئے احساس سے دوچار ہوتی تھی۔ اسے لگتا افنان نے آج ہی تو اس سے محبت کا اظہار کیا ہے، ہر بار ایک الگ ہی طرح کی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ

مسکراتے ہوئے افنان کو دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں جگنوؤں سے چمک رہے تھے۔

"میری سب سے بڑی خواہش پتا ہے کیا ہے۔" افنان نے بیلا کے ہاتھوں کو ہلکے سے دبا کر اسے اپنے قریب کیا۔

"کیا......؟" بیلا نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"کہ تم اور میں ایک ڈوئیٹ گائیں۔ محبت بھری دھن میں، محبت کا گیت؟ کیا تم گاؤ گی......؟"

افنان آنکھوں میں امید بھرے اسے دیکھ رہا تھا تو وہ انکار کر سکتی تھی بھلا۔

"ہاں۔"

سب کچھ بھلائے وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

☆☆☆

تین سال بعد......

موبائل کی مدھر گھنٹیوں جیسی رنگ ٹون کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ بیلا نے مندی مندی آنکھوں سے اردگرد دیکھا۔ کمرے میں صرف نائٹ بلب کی نیلی خوابناک سی روشنی تھی اور اس میں سائیڈ ٹیبل پہ پڑی موبائل کی روشن اسکرین صاف نظر آ رہی تھی۔ کسلمندی سے اٹھ کر موبائل اٹھانے سے پہلے اس نے سرسری سی نظر میں اپنے وسیع و عریض بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ افنان کہیں نہیں تھا۔ وہ ابھی کل ہی انڈیا سے مختلف ایوارڈ شوز میں شرکت کر کے آئے تھے۔ ہر ایوارڈ شو میں بیسٹ سنگر کا ایوارڈ لینے کا مزہ اپنی جگہ، مگر وہ تھک بھی خوب گئے تھے اور ایک ہفتہ تو انہوں نے آرام کرتے ہی گزارنا تھا مگر افنان......

پتا نہیں اسے چین کیوں نہیں تھا، ان تین سالوں میں ایک سے بڑھ کر ایک کامیابی سمیٹی تھی انہوں نے مگر اس کے آگے ہی آگے بڑھنے کی پیاس ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔ جتنا وہ شہرت کی بلندیوں پہ جا رہے تھے، اتنا ہی اس کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ شہرت بیلا کی بھی خواہش تھی مگر، اب اس کا ساتھ دیتے وہ تھکنے لگی تھی، ایک گہرا سانس لیتے اس نے موبائل کو دیکھا۔ وہ اب بجتا بند ہو چکا تھا۔ اس نے بے دلی سے موبائل اٹھا کر اس کی اسکرین پہ نظر ڈالی۔ مگر پھر اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔ مما کی پانچ مس کالز تھیں۔ اتنی صبح صبح تو وہ کبھی فون نہیں کرتی تھیں اور اب، ایک نہ دو پانچ مس کالز تھیں۔

"اللہ خیر کرے......" دھڑکتے دل سے اس نے انہیں کال بیک کی...... مریم نے فوراً ہی کال ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم......"

"وعلیکم السلام مما خیریت، اتنی صبح آپ کی کال......؟" بیلا نے چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔

"صبح؟ تمہاری یہ صبح ہے، میں نے تو ٹائم دیکھ کر کال کی تھی، نو تو بج ہی رہے ہوں گے تمہاری طرف۔" مریم کا مسکراتا لہجہ بتاتا تھا کہ سب خیریت ہے۔

"ہاں بس، انڈیا سے کل ہی واپس پہنچے ہیں اور ادھر کی مصروفیت کا تو پتا ہے آپ کو، خیر! آپ بتایئے، آپ نے کال کیوں کی تھی؟ خیریت ہے ناں؟" بیلا کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"ہاں، رانیہ کے ٹوئنز بے بی ہوئے ہیں۔ دونوں بیٹے ہیں ماشاء اللہ، اسی لیے کال کر رہی تھی، ابھی ہاسپٹل سے گھر پہنچی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پھر چلی جاؤں گی، سوچا تمہیں بتا دوں۔"

مریم کی آواز سے خوشی چھلک رہی تھی۔

"ٹوئنز......" بیلا خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

"اس کی شادی کو تو ابھی سال بھی نہیں ہوا ناں؟ اور ایک نہیں دو، دو بے بیز، کمینی نے ابھی لاسٹ ویک ہی بات ہوئی ہے تب بھی نہیں بتایا کہ ٹوئنز ہیں، ویسے مما بڑی جلدی نہیں ہو گیا سب، مطلب......"

وہ ہنسی تھی، اور بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"ہاں نیکسٹ منتھ کی پندرہ کو ایک سال ہو جائے گا اس کی شادی کو...... خیر! تمہاری طرف سے کب مل رہی ہے کوئی خوش خبری۔ تین سال سے اوپر ہی ہو گئے ہیں تمہاری شادی کو، ابھی تک تو کوئی

آثار ہی نہیں ہیں۔"
"اف......" بیلا نے سر تھام لیا تھا۔ مریم نے بات شروع کی تھی تو اب ان کی سوئی یہیں اٹک جانی تھی۔
"بتایا تو تھا مما! افنان ابھی کیریئر پہ فوکس کرنا چاہتا ہے۔ ایسی کوئی خواہش نہیں ہے ابھی اسے۔" بیلا کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔
"اور تم......؟ تمہیں بھی ایسی کوئی خواہش نہیں ہے؟" مریم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جب افنان ہی ابھی فیملی بڑھانا نہیں چاہتا۔" دھیرے دھیرے لب چباتی وہ الجھی الجھی سی تھی، ایک دم ہی بے چینی سی ہوئی تھی۔ وہ بیڈ سے اٹھی، اور کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ مریم کہہ رہی تھیں۔
"تو کیا اس نے تمہارے ساتھ ڈوئیٹ گانے کے لیے شادی کی تھی۔" ان کا انداز تیکھا تھا۔
"تم خود فورس کرو اسے، اور سنگر بننے کا تمہارا شوق تو پورا ہو ہی گیا ہے۔ شہرت بھی مل گئی۔ اب چھوڑ دو یہ پروفیشن بیلا! ایک مسلمان لڑکی کو یہ کہاں زیب دیتا ہے کہ ناکافی لباس پہن کر محبت بھرے گیت گاتی پھرے، بھلے اپنے شوہر کے ساتھ ہی ہو۔"
مریم کا معمول کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔
بیلا نے بے ساختہ گہرا سانس لیا۔ وہ اس موضوع پہ شروع ہوئی تھیں تو کم از کم آدھا گھنٹہ تو کہیں نہیں گیا تھا۔ تین سال ہو گئے تھے اس کی شادی کو اور تقریباً اتنا ہی عرصہ گلوکاری کو کیریئر بنائے گزرا تھا۔ مگر مریم ...... وہ ابھی تک اس گلوکاری کو پروفیشن بنانے کو تسلیم نہیں کر پائی تھیں، وقتاً فوقتاً اسے سمجھاتی ہی رہتی تھیں یہ اور بات کہ بیلا فی الحال سمجھنے سمجھانے کی سرحدوں سے کافی دور تھی، وہ شہرت کی بلندیوں پہ تھی، اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کسی کی نصیحت پتھر کی طرح لگتی ہے، اسے بھی مریم کی باتیں چبھ رہی تھیں۔
نائٹ گاؤن کی ڈوریاں کستی وہ بے ارادہ بیڈ روم سے باہر نکلی اور وہی ہوا جو اس نے سوچا تھا۔ لاؤنج میں بیٹھی روبی فوراً اس کی طرف لپکی تھی۔
"میم ......ایگزیکیوزمی میم......"
"ایک منٹ مما! آپ ہولڈ کریں میں آپ سے بات کرتی ہوں ابھی......" مما کو ہولڈ کروا کر وہ فوراً روبی کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔
"آج دو بجے تک آپ کو ایک چیریٹی پروگرام میں شرکت کرنی ہے، سر تاکید کر گئے تھے۔"
"اور افنان، وہ نہیں جائے گا، اس کی کیا روٹین رہے گی۔"
"وہ ایک کنسرٹ میں جائیں گے، ڈنر پہ وہ آپ کو جوائن کریں گے اور میم۔" وہ ایک پل کو رکی۔
"ابھی آپ بریک فاسٹ لے لیں، تو دس بجے تک جین اور الزبتھ آ جائیں گی۔"
ہونٹوں پہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجاتے اس نے بیلا کی میک اپ آرٹسٹ اور ہیر اسٹائلسٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔
"اوکے......" بیلا اثبات میں سر ہلاتی آگے بڑھ گئی تھی، اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔
"سوری مما، جی اب بتائیے، آپ کیا کہہ رہی تھیں۔" وہ اب مریم سے مخاطب تھی۔
"کچھ نہیں......" مریم نے بددلی سے کہا۔
"بیلا......میری دعائیں تو خیر بے اثر ہیں، مگر کیا دو ڈھائی سو نوجوانوں کی سوسائیڈ (خودکشی) بھی تم سے گلوکاری نہیں چھڑوا سکتی۔"
مریم نے کال کاٹ دی تھی، مگر موبائل کان سے لگائے بیلا وہیں کھڑکی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وسیع و عریض ڈائننگ ٹیبل پہ پڑے انواع و اقسام کے کھانے بھی بیلا کی اشتہا بڑھانے میں ناکام ہوئے تھے۔ بددلی سے پلیٹ میں پڑے تھوڑے سے چاولوں اور سلاد کو چمچے کی مدد سے ادھر ادھر ہلاتے وہ جیسے قریب بیٹھے افنان سے بھی بے خبر تھی۔ افنان نے بغور اسے دیکھا مگر اس کی توجہ حاصل کرنے

میں ناکام رہا۔

''کیا ہوا؟ موڈ کیوں آف ہے تمہارا؟'' اس نے بیلا کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''ہوں۔'' بیلا چونکی تھی۔ ''کیا کہا......؟''

وہ اس پل افنان کو خود سے بہت دور محسوس ہوئی، وہ اس کے ساتھ اس کی بیوی کی حیثیت سے بیٹھی تھی مگر دھیان کے دھاگے کہیں اور الجھے تھے۔ اس نے بمشکل خود پہ ضبط کرتے ہوئے سوال دوہرایا۔

''موڈ کیوں آف ہے، کیا ہوا ہے......؟''

''نہیں موڈ کیوں آف ہونا ہے بس......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی پھر ایک دم بات بدل دی۔

''رانیہ کے بیٹے ہوئے ہیں ٹوئنز۔ پاکستان جانا ہوگا کچھ دن کے لیے۔''

''گریٹ۔'' افنان نے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''تو اتنی اچھی خبر اتنے آف موڈ کے ساتھ کیوں دے رہی ہو، وائٹ لیسٹ مسکرانا تو بنتا تھا۔'' وہ اب مسکرا رہا تھا۔

''رانیہ کی شادی کو ابھی سال بھی نہیں ہوا۔'' بیلا سپاٹ چہرے کے ساتھ بولی تو افنان کی مسکراہٹ ایک دم سمٹی تھی۔

''تو......؟'' وہ اب سوالیہ انداز میں بیلا کو دیکھ رہا تھا۔

''تو یہ کہ ہماری شادی کو تین سال ہو گئے ہیں۔ میں اب فیملی بڑھانا چاہتی ہوں افنان۔'' بیلا نے ملتجی انداز میں اسے دیکھا۔

''مگر......ابھی تو ہمارے کیریر کی شروعات ہے۔ ابھی سے اگر ہم اس چکر میں پڑ گئے تو......'' وہ ایک پل کو رکا۔

''اور ہمارے سونگز کے ساتھ ساتھ، ہماری ویڈیوز کی بھی ڈیمانڈ ہے، ہمارے فینز ہمارے سونگز کی ویڈیوز میں ''ایز آ کپل'' ہمیں ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے میں تمہاری یہ خواہش......؟ اور ابھی تو تم خود بے بی ہو، چھوٹی سی، کیا ایج ہے تمہاری، تئیس چوبیس سال، اس ایج کی لڑکیاں تو خود بچی بنی پھرتی ہیں اور تم ماں بننا چاہ رہی ہو۔'' آخر میں اس کا لہجہ ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔

''بٹ، افنان......'' بیلا نے خود کو بے بس محسوس کیا، وہ اس کی فیلنگز سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

''میں تھک گئی ہوں۔ فیڈ اپ ہو گئی ہوں۔ اس سارے چکر سے، مجھے اب اسپیس چاہیے تھوڑا۔ تین سال میں پانچ البمز، بالی وڈ فلمز، برٹش اور امریکن میوزک کمپنیز سے کانٹریکٹ، دو انگلش نمبرز، مجھے جتنی شہرت چاہیے تھی، اس سے زیادہ پا چکی ہوں میں، مزید کی خواہش نہیں ہے مجھے اب، میں، مجھے ریسٹ چاہیے، کچھ عرصے کے لیے میں اس سب سے دور ہونا چاہتی ہوں پلیز......''

وہ بولتے ہوئے روہانسی سی ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کتنے دنوں کا غبار تھا۔ جو آج افنان کے ساتھ بالکل اکیلے بیٹھے اس نے نکالا تھا۔ ورنہ تو کتنا عرصہ ہوا وہ یوں وقت نکال کر اکٹھے بیٹھے ہی نہیں تھے۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا، جو ان کے اردگرد اکٹھا ہوتا تھا۔ ہنی مون کے فوراً بعد ہی ان کے گانوں کی ریکارڈنگ اسٹارٹ ہو گئی تھی اور افنان کے کہنے پہ ان کی ویڈیوز میں بھی وہ اور افنان ہی آتے تھے۔ ایک کے بعد ایک ہٹ البم دیتے وہ کب ایک دوسرے کے ساتھ وقت بتانا بھولے، خبر ہی نہیں ہوئی۔ بیلا کو تو ہنی مون میں گزارے وہ تین ماہ خواب ہی لگتے تھے۔ جب صرف وہ تھی اور افنان ...... اور دنیا بھر کے حسین مناظر ان کے قدموں تلے ہوتے تھے۔

''اوکے، اوکے......'' اس کے روہانسے چہرے کو دیکھتے افنان فوراً نرم پڑا تھا۔

''ایز یو وش......'' وہ اب اس کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔

''ویسے ہو سخت ناشکری تم۔ اتنی سی عمر میں اتنی شہرت اور اتنے فینز کا لوگ صرف خواب دیکھتے ہیں۔ پتا بھی ہے، پوری دنیا میں کتنے فینز ہیں تمہارے، کتنے

دیوانے ہیں تمہاری آواز اور انداز کے، تمہارے اس خوب صورت چہرے کے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔
بیلا کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ چمکی...... مگر وہ مسکراہٹ صرف ایک پل کے لیے ہی تھی۔
"فینز ہیں، تو نا پسند کرنے والوں کی بھی تو کمی نہیں ہے۔" جانے کیسا خیال تھا جس پہ اس کی مسکراہٹ سمٹی اور چہرے پہ یاسیت چھا گئی تھی۔
"سوسائیڈ اسکینڈل کا کیا بنا، کیس کی نیکسٹ ہیئرنگ کب ہوگی؟" افنان سے وہ سوال کرتے اس کی آواز ہلکی سی کپکپائی تھی۔
"اوہ......اف۔" افنان نے جیسے سر پکڑ لیا تھا۔
"یار، یہ سارے مسئلے تم نے ڈائننگ ٹیبل پہ ہی ڈسکس کرنے تھے، ہو جائے گا کچھ نہ کچھ، کوئی دم ہی نہیں ہے کیس میں، کروڑوں لوگوں نے وہ سونگ سینکڑوں بار سنا ہے۔ ہٹ سونگ ہے اگر پوری دنیا میں سے صرف دو، ڈھائی سو نوجوانوں نے وہ گانا سنتے ہوئے سوسائیڈ کی ہے۔ تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ اپنا کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے ان کا، کوئی بھی ریزن ہو سکتا ہے، اگر گانے میں کوئی مسئلہ ہے تو باقی کروڑوں لوگوں کا کیا......"
"مگر افنان، یہ بیک ٹریکنگ کیا ہے؟ نیوز میں بھی بار بار کہا جا رہا ہے اور پھر ان کے پیرنٹس کے کیے گئے وکیل، وہ کیوں یہ بات کہہ رہے ہیں بار بار، کیا واقعی بیک ٹریکنگ ہوتی ہے۔ کوئی خفیہ پیغام، جو گانوں میں چھپائے جاتے ہیں۔"
"یار! خدا کا نام لو، یہ، یہ میرے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھو۔" افنان نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔
"تم خود گائیک خاندان کا حصہ ہو۔ موسیقی کا علم تمہیں مجھ سے زیادہ ہی ہوگا، تم بھی یہ سوال پوچھ رہی ہو، اتنے بڑے کمپوزر اور میوزیشن کی نواسی اور اتنی بڑی سنگر کی بھانجی ہو، کبھی تم نے دیکھا ہے سرا امانت یا نیلم آنٹی کو یہ تکنیک استعمال کرتے۔"
"نہیں مگر......" بیلا نے تذبذب سے اسے دیکھا۔
"اپنے ننھے سے دماغ پہ اتنا زور مت دو مائی لو...... تم بس آنے والے بے بی کے بارے میں سوچو، بلکہ میرا خیال ہے، تم بھی رانیہ کی طرح ٹوئنز کا سوچو، ایک ہی بار میں دو بے بیز مل جائیں گے، ویسے بھی بچے دو ہی اچھے بار بار کی تکلیف سے بھی بچ جاؤ گی۔" وہ اسے آنکھ مارتے ہوئے چھیڑ رہا تھا۔
"شٹ اپ......" بیلا نے چہرہ پلیٹ پر جھکا لیا تھا۔
"تم کبھی سوچ کر مت بولنا۔" وہ سرخ پڑ گئی تھی۔
"تو غلط کیا ہے۔" افنان نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"چپ کر کے کھانا کھاؤ، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" بیلا نے اس کا دھیان کھانے کی طرف مبذول کروایا تھا۔
"بڑی جلدی خیال آ گیا۔" اس نے آنکھیں سکوڑتے کچھ طنزیہ انداز میں بیلا کو دیکھا اور اسے مسکراتے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ شکر کہ وہ اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اب رغبت سے کھانا کھا رہی تھی۔ وہ بھی سر جھٹکتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"ہائے، اتنے پیارے، اتنے شونے شونے سے بے بیز......" وہ ہونٹ گول کیے، دونوں بچوں کے کبھی ہاتھوں کو چھوتی، کبھی گالوں کو ہاتھ لگاتی، ہولے ہولے ہاتھ پاؤں مارتے، اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پٹپٹاتے، گلابی گلابی سے وہ گڈے اس کے دل میں گھسے جا رہے تھے۔
"ہائے نہیں کہتے بیٹا۔ ماشاءاللہ بولتے ہیں۔" مریم نے فوراً ہی اسے ٹوکا تھا۔ جبکہ بیڈ پہ ایک طرف بیٹھی آرام سے انار کا جوس پیتی رانیہ بس مسکراتے ہوئے اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"میں اٹھا لوں انہیں مما۔" بیلا نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

''اٹھالو......'' وہ مسکرا دی۔

''بیلا!'' تانیہ آپی نے کچھ شرارتی انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔

''میرے اور ایمن کے بچوں کے لیے تو کبھی ایسی محبت نہیں انڈیلی تمہاری۔ رانیہ کے بچوں پہ بڑا پیار آرہا ہے۔''

''ارے اچھے کیوں نہیں لگتے، مگر وہ اور دور تھا ناں...... جب آپ کا فیضان پیدا ہوا، تب تو میں خود ایٹ کلاس میں تھی اور بچی بنی رہتی تھی۔'' وقت یاد کرتے ہوئے بیلا کھو سی گئی۔

''اور کل تک بچی بنی رہنے والی۔ اب خود ماں بننے کی تیاری کر رہی ہے، تو بچے تو اچھے لگنے ہیں ناں۔'' رانیہ نے اسے چھیڑا تھا۔ وہ بلش ہو گئی تھی۔

''ارے دیکھو اس کی آنکھوں کا کلر تو بالکل میرے جیسا ہے، ہیزل گرین، رانیہ ان کی آئیز کا کلر ڈیفرنٹ ہے، تمہیں انہیں پہچاننے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔'' اس نے جان بوجھ کر ایکسائٹمنٹ شو کی تھی۔

تانیہ، رانیہ اور مریم، تینوں ہی اس کے بات بدلنے پہ بے ساختہ مسکرائی تھیں۔

''ادھر آؤ...... گھنٹہ ہو گیا ہے آئے ہوئے اور تب سے ان کے ساتھ ہی بزی ہو۔ ایک ماہ کا پیار ابھی ہی دینا ہے کیا؟ ہمارے ساتھ آکر بیٹھو اب۔''

مریم نے بیڈ پہ اپنے ساتھ جگہ بناتے ہوئے اسے بلایا تھا۔ بیلا نے ننھے ریان کو بے بی کاٹ میں لٹایا اور آکر ان سے لپٹ گئی۔

''اتنی لمبی فلائٹ تھی، تھک گئی ہو گی۔ ریسٹ کر لو تھوڑا۔'' اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے مریم نے کہا تھا۔

''کیسی تھکن مما؟ ساری تھکن تو آپ کو دیکھ کر ہی اتر گئی تھی۔'' ان کے کندھے سے سر ٹکاتے بیلا ہولے سے مسکائی تھی۔

''اتنا ٹائم کیوں لگا دیا آنے میں؟ ایک ماہ بعد آ رہی ہو، اب تو میں اپنے گھر بھی جانے والی ہوں۔'' رانیہ نے جیسے شکوہ کیا تھا۔ وہ ہاسپٹل سے ممی کے گھر آ گئی تھی، اور اب آج کل میں اپنے گھر جانے والی تھی۔

''یس ریکارڈنگز کمپلیٹ کروا رہی تھی ساری، پھر اس کے بعد اب ریسٹ کرنا ہے ناں کچھ عرصہ تو میں نے سوچا ادھر کچھ زیادہ دن رہوں گی آپ کے ساتھ، اسی لیے کام کی ٹینشن ختم کر کے ہی آنا چاہتی تھی۔''

مما کی گود میں سر رکھ کر وہ مزے سے لیٹ گئی تھی۔

''اچھا ہوتا۔ اگر تم اور افنان ایک دفعہ ڈاکٹر سے بھی چیک اپ کروا لیتے......'' تانیہ نے دھیرے سے کہا تھا۔

''کروا لیا ہے آپی! سب نارمل ہے۔''

مریم کی گود میں سر رکھے بیلا پر سکون سی تھی۔ پتا نہیں کتنے عرصے بعد اسے اتنا سکون محسوس ہوا تھا۔ ساری فکریں، سارے تفکرات جیسے دور چلے گئے تھے، باتیں کرتے کرتے جانے کب اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور وہ نیند میں چلی گئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔

مریم اسے یوں بے فکری سے سوتا دیکھ کر مسکرائیں اور اس کے سر کو دھیرے سے گود سے تکیہ پہ منتقل کیا، اور پھر تانیہ اور رانیہ کو آہستہ آواز میں باتیں کرنے کا کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔

انہیں ابھی ڈنر کے انتظامات کا جائزہ لینا تھا اور بیلا اور افنان کا کمرہ بھی سیٹ کروانا تھا، کیونکہ بیلا نے انہیں ادھر آ کر ہی بتایا تھا کہ افنان بھی کچھ دن کے لیے پاکستان آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اور وہ چاہ رہی تھیں کہ اس کے آنے سے پہلے بیلا کے کمرے کی کچھ ضروری سیٹنگ کروا لیں۔ کیونکہ بیلا تو پھر بھی ان تین ساڑھے تین سالوں میں دو تین چکر لگا گئی تھی۔ مگر افنان پہلی بار آ رہا تھا اور وہ چاہ رہی تھیں کہ کہیں کوئی کمی نہ ہو۔ اسی لیے ابھی بیلا کے کمرے کی طرف جاتے وہ ذہن میں سارے ضروری کاموں کی لسٹ بنانے میں مگن تھیں۔ شاید ان کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی نہیں ہو گا کہ جس داماد کی آمد کو پہلی بار

جان کر وہ خصوصی پروٹوکول دینا چاہ رہی ہیں۔ وہ اس کی پہلی کے ساتھ ساتھ آخری آمد بھی ہے۔

☆☆☆

"ویسے بیلا! ہو بڑی بے وفا تم ......" کافی کا گھونٹ انڈیلتے بیا نے بیلا کو مخاطب کیا تھا۔

"ان تین سالوں میں بمشکل تین چار دفعہ ہی رابطہ کیا ہو گا تم نے، یاد نہیں آتی تھی ہماری، یا افنان بھائی نے سب بھلا دیا تھا۔"

وہ اب بیلا کو چھیڑ رہی تھی۔ بیلا کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی۔ وہ چاروں ایک عرصے بعد پھر سے اکٹھی ہوئی تھیں۔ آج بیا کے گھر بیلا کی دعوت تھی، فی بی اور نیا بھی آئی ہوئی تھیں اور دنیا جہاں کے موضوعات تھے جو زیر بحث لائے جا رہے تھے۔ ابھی بھی لنچ کر کے وہ چاروں بیا کے کمرے میں آئیں تو بیا نے کافی منگوالی اور اب کافی کے گھونٹ لیتے وہ ہلکی پھلکی گپ شپ بھی جاری تھی۔

"یاد کیوں نہیں آتی تھی، بس مصروفیت ہی اتنی ہوتی تھی۔ چاہ کر بھی زیادہ رابطہ نہیں رکھ پائی۔" بیا کی بات کے جواب میں وہ یہی کہہ پائی تھی۔

"یار! تین ساڑھے تین سالوں میں پانچ البم، فلموں کے سونگ اس کے علاوہ ہیں۔ پھر سونگز کی ویڈیوز میں بھی تم خود ہوتی تھیں، اتنا اسٹیمنا کہاں سے آیا تمہارے پاس۔" نیا کو کافی حیرت ہوتی تھی۔ بیلا کا اتنا کام دیکھ کر، سو اس نے پوچھ بھی لیا۔

"محبت سب کروا لیتی ہے۔"

بیلا نے مختصر سی بات میں سب سمیٹ دیا تھا۔

"محبت ......؟" فی بی کا لہجہ شرارت لیے ہوئے تھا۔ "کس کی محبت؟ افنان بھائی کی یا تمہارے فینز کی۔"

"جو سمجھ لو۔" بیلا کے سیاسی جواب پہ وہ تینوں مسکرا دی تھیں۔

"ڈپلومیٹک جواب ...... سچ بتاؤ ناں کہ افنان بھائی کی محبت، فینز کی کہاں اتنی ویلیو کہ بیلا جی کو دن بھر ریکارڈنگ میں مصروف رکھ سکیں۔"

فی بی چھیڑنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔

"سچ تو پھر واقعی یہی ہے کہ افنان کی محبت۔" وہ جو بات کہہ دیتا ہے میں انکار کر ہی نہیں سکتی، لوگ پسند نہ بھی کرتے اتنے فینز نہ بھی ہوتے، وہ کہتا تو میں پھر بھی کرتی۔ فینز کی محبت ......" اپنی چھوٹی سی خوب صورت ناک سکوڑتے وہ ایک ادا سے بولی۔ "سمجھ لو بونس ہے جو مل رہا ہے۔" اس کے لہجے میں افنان کے لیے محبت تھی۔

"محبت واقعی سب کچھ کروا لیتی ہے، ہے ناں بیلا۔" پتا نہیں کیوں، مگر بیلا کو نیا کا لہجہ چبھتا ہوا سا لگا تھا۔

"کیا مطلب؟" بیلا نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" نیا نے کندھے اچکائے تھے۔

"نہیں کچھ تو ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو ناں، یوں اشاروں میں بات کرنے کا تو ہم میں کوئی کانسپٹ ہی نہیں تھا، جو بھی کہتے تھے، کھل کر کہتے تھے، کیا تین سال کی دوری نے ہمیں واقعی اتنا دور کر دیا ہے کہ تم مجھ سے کھل کر بات ہی نہیں کر پا رہی ہو۔"

بیلا نے جیسے اسے اکسایا تھا۔

"یہ سوسائیڈ اسکینڈل والے کیس پہ بات کرنا چاہ رہی ہے بیلا!" نیا کے بجائے فی بی نے کہا تھا۔

"یہ مادام جب سے خفیہ پولیس میں گئی ہیں ان میں تجسس کچھ زیادہ ہی آ گیا ہے، ہر بات میں جرم کا پہلو نکال لاتی ہے۔ یہ تو پھر اچھا خاصا اسکینڈل بن گیا ہے۔" فی بی ایک پل کو رکی۔

"اور پوچھنا تو ہم بھی چاہتے تھے۔ حقیقت کیا ہے بیلا! کیا واقعی بیک ٹریکنگ ایک حقیقت ہے یا افسانہ۔" فی بی اب جھجکتے ہوئے بیلا سے پوچھ رہی تھی۔ ایک پل کو بیلا کے چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑا، مگر پھر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"بکواس ہے سب۔ خود سوچو، ایسا کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک سونگ کسی کو سوسائیڈ پہ مجبور کر دے، پھر یہ سونگ تو، بہت ہی ہٹ سانگ تھا، کروڑوں

لوگوں نے سنا ہے، اگر ایسا ہوتا تو کیا صرف دو، ڈھائی سو افراد ہی خودکشی کرتے۔"

بیلا کو پتا بھی نہیں چلا، مگر اس نے بالکل افنان کا انداز اپنایا تھا۔

"بات اتنی سادہ نہیں ہے بیلا! میں کہنا تو نہیں چاہتی مگر، اب بات کھل ہی گئی ہے تو میں خود کو روک نہیں پا رہی، تمہارے اس سونگ میں واقعی بیک ٹریکنگ کی گئی ہے، تمہارے پاس اگر ریکاڈنگ انسٹرومنٹ ہیں اور یقیناً ہوں گے، کبھی اپنے اس سونگ کو نارمل رفتار میں بیک ورڈ چلا کر دیکھنا، جو الٹے سیدھے مجہول الفاظ تم نے گانے میں محض فن کے لیے گائے ہیں، وہ ویسے ہی فن کے لیے نہیں ہیں۔ ان میں Hidden Message (پوشیدہ پیغام) ہے۔"

"کل یور سیلف کا ——————— یعنی خود کو مار ڈالو۔"

"Dead! lets do it" کا......

نیا نے ٹھہر ٹھہر کر کہا اور اس کی بات سن کر بیلا نے لب بھینچ لیے تھے۔

"ایسا کچھ نہیں ہے، جیلسی ہے صرف، ہمارے کچھ مخالفین کی سازش ہے اور کچھ نہیں، تم کیا سمجھتی ہو میں نے ایسا نہیں کیا ہوگا، کمپنی سے نکالے گئے اوریجنل البم میں ایسا کچھ نہیں ہے اور غیر قانونی بنائی گئی کاپیز کی کمپنی ذمہ دار نہیں ہے۔"

وہ ایک پل کو رکی۔

"ویسے بھی رواج ہے اس فیلڈ میں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کا، الٹے سیدھے اسکینڈل بنانے کا، مگر دکھ تو اس بات کا ہے کہ میرے اتنے قریبی لوگ بھی اس پروپیگنڈے میں آ گئے اور میرا یقین نہیں کر رہے......"

بیلا کے لہجے میں دکھ تھا، نیا نے کہنا چاہا کہ معاملہ اتنا بھی سادہ نہیں ہے مگر......

"چھوڑو بھی۔ یہ کیا باتیں لے بیٹھے ہو۔ اور نیا! تم ناں اپنی یہ انویسٹی گیشن مجرموں تک ہی محدود رکھو، گھر والوں اور فرینڈز کو چھوڑ دو۔ خدا کے لیے۔"

فی بی نے اسے کچھ کہنے نہیں دیا تھا، اس کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے اس نے اپنا لہجہ ہلکا پھلکا ہی رکھا تھا۔

"سچ میں تنگ آ گئے ہیں ہم...... ابھی کل ہی مالی کے بیٹے سے کھیلتے ہوئے لاؤنج کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا، اور جو اس نے انویسٹی گیشن کی ہے، سچ میں مجھے تو مالی کا وہ دس، گیارہ سالہ لڑکا، کوئی دہشت گرد یا ڈاکوؤں کا ساتھی لگنے لگا تھا۔"

وہ بات کو بالکل دوسرے رخ پر لے گئی تھی۔ نیا نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی اور بیلا کی آنکھوں میں واضح تنبیہ تھی۔ وہ لب چباتے خاموش ہو گئی تھی۔ فی بی اور بیلا اب بیلا کو نیا کے خفیہ پولیس میں جانے اور ٹریننگ کی داستان سنا کر ہنسانے میں مشغول تھیں۔ ٹھنڈی ہوتی کافی کے گھونٹ لیتے، چپ چاپ ان کی باتیں سنتے نیا جانتی تھی وہ بیلا کا دھیان اس کی باتوں سے ہٹانے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کوشش میں وہ کافی کامیاب بھی لگ رہی تھیں۔

وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ بیلا سے بات کرنے کی اس کی یہ کوشش ناکام رہی تھی۔ اور پھر اب پتا نہیں کب موقع ملنا تھا۔ کبھی ملنا بھی تھا یا نہیں۔ یہ سب سوچتے اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سوسائیڈ اسکینڈل ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا بھونچال لانے والا ہے۔

☆☆☆

گاڑی چلاتے بیلا کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ پاکستان سے آئے ابھی اسے تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ ہی ہوا تھا اور اتنی بڑی خوش خبری اس کی پریگنینسی رپورٹ پازیٹیو آئی تھی۔ وہ ماں بننے والی تھی۔

"اف......!"

اس نے ایک گہرا پرسکون سانس لیا۔ وہ کہتی نہیں تھی مگر، یہ خواہش تو اس کے دل میں شادی کے ایک سال بعد ہی پھوٹ پڑی تھی، پر افنان کا اس معاملے میں انکار سن کر وہ دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔

وہ چاہتی تھی، وہ جب بھی اپنی فیملی بڑھائیں تو وہ صرف اس کی ضد کا نتیجہ نہ ہو بلکہ افنان کی بھی دلی آمادگی اس سب میں شامل ہو اور اب شادی کے تین سال، سات ماہ بعد بالآخر اس کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔

''کیا افنان کو ابھی بتاؤں......؟''

وہ لب چباتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''یا...... یا پھر ویڈنگ اینیورسری پہ، تقریباً چار ماہ ہی تو رہتے ہیں۔ مگر، اتنا عرصہ میں اس سے یہ کیسے چھپاؤں گی۔ دل تو کہہ رہا ہے ابھی اڑ کر اس کے پاس چلی جاؤں اور......'' وہ دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''مما کو بتاؤں۔'' ایک پل کو اس کے دل میں خیال گزرا۔

''اونہوں۔'' پھر اس نے یہ خیال خود ہی رد کر دیا۔

''پہلے افنان کو...... اور ابھی بتاتی ہوں، چار، ساڑھے چار ماہ صبر کر سکتی ہوں بھلا۔''

گاڑی احتیاط سے چلاتے اردگرد پارکنگ ڈھونڈتے، دھیمی سی مسکان اس کے لبوں پہ قائم رہی تھی۔

ابھی روبی سے پتا کرتی ہوں کہ افنان کہاں ہے۔

اس نے فی الحال سنگنگ چھوڑ دی تھی، تو افنان کے شیڈول کا بھی اسے کچھ پتا نہیں تھا، اس لیے اس نے روبی کو کال کرنے کا سوچا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ چلتی گاڑی سے ہی روبی کو کال کر لیتی مگر ابھی، ابھی تو وہ ڈاکٹر کی ہدایت پر پورا عمل کر رہی تھی، بلکہ ڈاکٹر کا دیا گیا ہدایت نامہ تو جیسے اسے ازبر ہو گیا تھا۔ گاڑی احتیاط سے پارک کر کے ہی اس نے روبی کو کال کی تھی، افنان ابھی اسٹوڈیو میں ہی تھا اور ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس نے ادھر ہی رہنا تھا، روبی سے کنفرم کرنے کے بعد اس نے گاڑی اسٹوڈیو کی طرف بڑھا دی تھی۔

اور اب اسٹوڈیو کی دوسری منزل پہ بنے ریکارڈنگ روم کی طرف بڑھتے، افنان کے متوقع ردعمل کا سوچتے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

وہ کیا کہے گا؟ وہ سوچ رہی تھی۔

''اور میں، میں کیسے کہوں گی؟ کیسے بتاؤں گی؟'' دروازے کا لٹو گھماتے پتا نہیں کیوں اسے ڈھیر ساری شرم آئی تھی۔ دروازہ تھوڑا کھل گیا تھا۔ ساؤنڈ پروف کمرے سے باتوں کی آوازیں، باہر آنے لگی تھیں۔ پتا نہیں اور کون، کون ہے ابھی افنان کے ساتھ۔ وہ ایک پل کو تھوڑی کنفیوز سی ہوئی۔

''کیا ابھی بتا دوں اسے، یا...... یا پھر گھر چلی جاؤں؟'' وہ گومگو کے عالم میں کھڑی تھی، جب اندر سے آنے والی آواز سن کر ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

وہ افنان کا دوست اور میوزیشن وجے تھا، ان کا جس کمپنی کے ساتھ کانٹریکٹ چل رہا تھا، اس کا کرتا دھرتا تقریباً وہی تھا مگر......

ابھی وہ کیا کہہ رہا تھا، اس کی بات سن کر بیلا کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

وہ ان کی آپس میں کی گئی گفتگو نہیں تھی، وہ ایک آئینہ تھا، جو بیلا کے آگے رکھ دیا گیا تھا، اس میں وہ تھی، دادا جی کے آگے بیٹھی سوال کرتی، تکرار کرتی، گانے کو گناہ ماننے سے انکار کرتی، موسیقی کو حرام قرار دیے جانے کی وجہ جاننے پہ اصرار کرتی اور وجہ اس کے منہ پہ مار دی گئی تھی، جواب مل گیا تھا اسے، مگر کہاں؟ دادا جی کی دعا قبول ہوئی تھی، مگر کب؟

جب وہ ساری کشتیاں جلا چکی تھی، واپس مڑ ہی نہیں سکتی تھی، مگر کیا وہ واقعی پیچھے نہیں مڑ سکتی تھی۔ پانچ سال بعد، ہاں تقریباً پانچ سال بعد اسے کوے میں پڑے اپنے دادا جی یاد آئے تھے اور کیا خوب یاد آئے تھے۔ ان کی جن باتوں کا وہ انکار کرتی آئی تھی، وہی باتیں اب اس کے دل کی رگیں کاٹ رہی تھیں، اندر کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ جیسے ایک دوراہے پہ کھڑی تھی۔ اندر چلی جائے۔ جہاں اس کی ساری دنیا تھی۔ اس کی محبت اور اس کے بچے کا باپ، پیچھے

پلٹ جائے۔ جہاں دنیا نہیں تھی مگر اللہ تھا۔
فیصلہ کرنا مشکل نہیں تھا، ہاں مگر اس پہ عمل کرنا کٹھن ضرور ہوتا۔ اگر جو وہاں رابیل عبدالرحمٰن کے بجائے کوئی اور ہوتا، وہ رابیل تھی، رابیل عبدالرحمٰن جسے اس کے دادا نے سورۃ رحمٰن ترجمہ کے ساتھ زبانی یاد کروائی تھی۔ پتا نہیں کتنے عرصے بعد سورۃ رحمٰن کی آیات اوران کا ترجمہ اس کے ذہن میں گونجا تھا۔
''اور جو اپنے رب کے آگے کھڑا ہونے سے ڈرا، اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔''
''اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔'' کیا یہ ایک آ گہی ایک نعمت تھی جو اُسے بخش دی گئی تھی؟ جو بھی تھا مگر فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس نے دنیا چھوڑ دی تھی اور اپنے رب کی طرف پلٹ گئی تھی۔
قاری عبدالوہاب کی دعائیں مستجاب ہوئی تھیں۔
مگر کیا پلٹنا اتنا ہی آسان تھا۔

☆☆☆

''ایک نیا پروجیکٹ ملا ہے......'' ٹیبل کو طبلے کی طرح بجاتے وجے نے سامنے بیٹھے افنان کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''پراجیکٹ......؟'' افنان نے بھنویں سوالیہ انداز میں اچکائیں۔
''اوپر سے......؟'' پھر وجے کے تاثرات دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔ وجے نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلایا تھا۔
''نہ کر یار......'' افنان نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔
''ابھی تو پچھلے پراجیکٹ کی گونج نہیں تھمی، عدالت میں کیس چل رہا ہے ابھی تک۔''
''وہی تو کامیابی ہے ہماری، اتنی پراپر بیک ٹریکنگ، دو، ڈھائی سو نوجوانوں کا میسج کو پک کرنا اور اس پر عمل کرنا مذاق نہیں ہے۔ ساری رپورٹ ہے میرے پاس، پہلے نفسیاتی مریض اور منشیات کے عادی نوجوانوں پہ ہی یہ پیغامات زیادہ اثر انداز ہوتے تھے، اس دفعہ نارمل نوجوانوں کی بھی بڑی تعداد متاثر ہوئی ہے اور یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ اوپر والے بہت خوش ہیں تم سے، بیلا اور تمہاری آواز اور کمپوزنگ کافی پراثر ثابت ہو رہی ہے۔'' وجے پرجوش ہو کر بولتا چلا گیا تھا۔
''اب اگلا پراجیکٹ بھی تم نے اور بیلا نے مل کر کرنا ہے۔''
''بیلا کو منانا مشکل ہوگا......'' وجے کی نسبت افنان کافی ڈھیلے ڈھالے انداز میں بولا، اس کے چہرے پہ سوچ کی پرچھائیاں واضح تھیں۔
''کیوں......؟'' وجے حیران ہوا تھا۔
''آج کل اور ہی ہواؤں میں ہے وہ، بتایا تو تھا تمہیں، بھول گئے؟'' افنان نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''تو سارا البم کون کہہ رہا ہے۔ یہی جو دو تین مخصوص سانگ ہوں گے، وہی کہنا اس سے، مان جائے گی یار، لڑکیوں کو محبت کا دانہ ڈالو تو چگ لیتی ہیں۔ پیار سے قابو کرو۔'' وجے نے گویا اسے بیلا کو رام کرنے کا طریقہ بتایا۔
''دیکھتے ہیں...... کرتے ہیں کچھ، بائی داوے، پیغام کیا ہوگا اس بار۔'' افنان نے بات بدل دی تھی۔
''جے شیطان'' کا نعرہ لگوانا ہے۔ نوجوانوں سے۔ اور میں تمہارا غلام ہوں، ہم تمہاری غلامی پہ جمے رہیں گے اے شیطان......''
وجے کی آنکھوں میں بھیڑیے کی سی چمک تھی۔
''یہ، ایسے وقت میں یہ پیغام۔ جب دنیا بیک ٹریکنگ کی تکنیک سمجھنے لگی ہے، پہلے ہی کیس چل رہا ہے۔ فرنٹ پہ تو میں اور بیلا کھڑے ہیں۔''
افنان سخت کبیدہ لگ رہا تھا۔
''وہ تم چھوڑو، آگے سب سنبھالنا اوپر والوں کا کام ہے، پہلے تم پہ آنچ آنے دی ہے، تم اپنا کام کرو۔'' وجے نے اس کا اعتراض چٹکیوں میں اڑایا تھا۔

''اوکے.....'' گہرا سانس لیتے افنان نے گویا ہتھیار ڈالے تھے۔

''مگر میسج لمبا نہیں ہے؟ Key Notes میں چھپانا پڑے گا، یعنی چوتھی اور پانچویں نوٹ پہ، مشکل نہیں ہو جائے گی۔'' پتا نہیں کیوں افنان اکتایا ہوا سا تھا۔

''کہہ تو رہا ہوں یار، دو، تین گانوں کا پراجیکٹ ہے، دھیان پتا نہیں کہاں ہے تیرا۔'' وجے کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

''دھیان یہیں پہ ہے، مگر یہ پیغام، لوگوں کے ذہنوں کو شیطان کی غلامی پہ آمادہ کرنا، کیا یہ مناسب ہوگا؟ مطلب یہ اس وقت مناسب ہوگا کیا؟'' افنان گڑبڑا گیا تھا۔

''تو اپنے کام پہ دھیان دے، پالیسی بنانے والے بہتر جانتے ہیں۔ کون سا پیغام کب اور کس طرح دینا ہے، تو اپنا کام کر اور مال بنا، یہ کن چکروں میں پڑ رہا ہے تو۔'' وجے نے دانستہ ہلکا پھلکا لہجہ اختیار کیا تھا۔

''اور برادرز تو اس سے کہیں آگے کا سوچ رہے ہیں، یہ تو ٹریلر ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''کیا مطلب.....؟'' افنان چونکا تھا۔

''مطلب.....'' وجے اب آگے کو جھکا رازدرانہ انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر افنان کی رنگت متغیر سی ہوئی۔

''ڈر کیوں رہا ہے۔ تو کہہ دینا جس کمپنی سے تیرا کانٹریکٹ تھا، انہوں نے جیسا کہا۔ تم نے ویسا گا دیا۔ نہ الفاظ تمہارے نہ کمپوزنگ اور میوزک تمہارا، بس آگے برادرز جانیں اور ان کا کام، دل اب چل کر.....؟''

اس نے جیسے افنان کو تسلی دی تھی، افنان پرسوچ انداز میں سر ہلا کر رہ گیا، وہ پریشان ہو گیا تھا، مگر اپنی پریشانی چھپانے کی پوری کوشش کر رہا تھا، اور اسی کوشش میں جانے کتنے پل گزرے تھے کہ، موبائل کی بیل ہوئی۔ افنان نے چونک کر اپنے موبائل پہ نظر ڈالی۔ ''وکرم کالنگ.....'' افنان نے کال اٹینڈ کر لی تھی۔

''یس.....'' اس کا انداز سوالیہ تھا۔

''سر! میم رابیل آئی تھیں ابھی اوپر، پھر تیزی سے واپس چلی گئیں، منع کر کے گئی ہیں کہ آپ کو ان کے آنے کا پتا نہ چلے۔'' وکرم نے مودبانہ انداز میں کہا۔

''ڈیم اٹ۔'' افنان نے جھنجلا کر کال آف کی اور موبائل کو ٹیبل پہ پٹخ دیا۔

''کیا ہوا.....؟'' وجے نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''نیا ہی مسئلہ بن گیا ہے، بیلا آئی تھی ابھی، کچھ کہے بغیر ہی چلی گئی۔ اب پتا نہیں اس نے کچھ سنا ہے یا کوئی اور مسئلہ.....؟'' افنان بوکھلایا ہوا تھا۔

''ساؤنڈ پروف کمرہ ہے یار، کیا سنا ہوگا اس نے، کوئی اور مسئلہ ہوگا، تو خود طریقے سے پتا کر۔''

''ہاں نکلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں پھر.....'' افنان گاڑی کی چابی اٹھاتے کھڑا ہوا تھا۔

''ٹھہر کا کے ٹھہر، اسے جانے دے۔ پتا کر۔ کہاں جاتی ہے۔ ٹائم پہ گھر جانا اور طریقے سے بات کرنا۔'' وجے نے اسے سمجھایا تھا۔

''ویسے اگر اس نے سن لیا ہے تو اچھا ہے۔ طریقے سے آمادہ کرنے کی کوشش کر اسے۔ ہو جائے گی، شہرت اور دولت چیز ہی ایسی ہے، اچھے اچھوں کو گھٹنے ٹیکنے پہ مجبور کر دیتی ہے اور پھر جو ایک بار شہرت کا مزہ چکھ لے، اسے یہ چھوڑنا مشکل لگتا ہے، پھر بھی نہ مانے تو دھمکا دینا۔'' اسے تسلی دیتے دیتے آخر میں وجے کا لہجہ بدل گیا تھا۔

افنان نے چونک کر اسے دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلاتا دوبارہ اپنی چیئر پہ بیٹھ گیا، مگر اس کے چہرے پہ پریشانی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

☆☆☆

شام تک کا وقت اس نے بڑی مشکل سے کاٹا تھا۔ شیڈول کے مطابق اس شام وہ فارغ تھا تو اس

نے چھ بجے تک گھر پہنچنا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ یہ اور بات کہ اس دوران اس سے ایک کام بھی ڈھنگ کا نہیں ہوا تھا۔ دھیان بیلا ہی میں الجھا رہا تھا۔

وہ کیوں آئی تھی......؟ اگر آئی ہی تھی تو پھر کچھ کہے بغیر کیوں چلی گئی؟ کیا اس نے ان کی گفتگو سن لی تھی، اور اگر سن لی تھی تو اب اس کا ردعمل کیا ہوگا......؟

وہ خود ہی قیاس لگاتا اور خود ہی رد کرتا رہا تھا۔ گھر میں سناٹے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ جب سے بیلا نے گانے سے کنارہ کیا تھا۔ وہ اس کے گھر پہنچنے تک فریش ہو کر اس کے انتظار میں کھڑی ملتی تھی مگر آج، وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ الجھا الجھا سا بیڈ روم میں داخل ہوا اور سامنے کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

دروازے سے بیڈ تک پھولوں کا راستہ سا بنا تھا۔ پورے کمرے میں جا بجا پھول سجے تھے اور کمرہ ان کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ابھی وہ اس ساری صورت حال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا جب بیلا ڈریسنگ روم سے برآمد ہوئی۔ بلڈ ریڈ کلر کے ایوننگ گاؤن میں وہ بلاشبہ معمول سے ہٹ کر اور بے حد حسین لگ رہی تھی، پھول ہاتھوں میں لیے وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

مگر جانے کیوں افنان کو چار برس پہلے کی وہ شام یاد آ گئی، جب ایسی ہی پیروں کو چھوتی میکسی پہنے سر پہ تاج دھرے وہ پھولوں کے ڈھیر پہ کھڑی تھی، جب اس نے اسے ٹھکرا دیا تھا، تو کیا تاریخ خود کو دہرا رہی تھی، کیا وہ اسے چھوڑ کر جانے والی تھی، اس کی ناراضی اور اس کے چھوڑ کر چلے جانے کا خوف اتنا زیادہ تھا کہ وہ اور کچھ سمجھ پا رہا تھا نہ ہی سوچ پا رہا تھا۔ بس سانس روکے اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور اس کے خالی ہاتھوں میں پھول تھما دیے۔

"بیلا......؟ یہ سب کیا ہے؟"

لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے آزاد ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں موجود پھولوں کو حیرت سے دیکھتا، وہ ڈھنگ سے اپنی حیرت کا اظہار بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائی تھی، کچھ تھا جو اس میں بدلا تھا، افنان نے شدت سے محسوس کیا، مگر کیا؟

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ سارا دن اس نے اس ٹینشن میں گزارا تھا کہ اگر بیلا نے اس کی اور وجے کی گفتگو سن لی ہے تو وہ اسے کس طرح رام کرے گا، کیسے اسے اپنا ساتھ دینے پہ آمادہ کرے گا۔ مگر...... ادھر تو کوئی اور ہی سین چل پڑا تھا۔ جو بھی تھا اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ بیلا اس کی اور وجے کی باتیں سنے بغیر ہی پلٹ آئی تھی۔ سارے دن کی بے نام سی پریشانی اڑن چھو ہوئی تھی اور اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"تم آج آفس آئیں اور پھر مجھ سے ملے بغیر ہی چلی گئیں؟" اب پوچھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا، سو وہ مسکراتے ہوئے استفسار کر رہا تھا۔

"ہاں......" بیلا بھی دھیرے سے مسکرائی تھی۔

"میں جو تمہیں بتانے گئی تھی، وہ خبر ایسے ہی بتانے والی نہیں تھی، ہماری زندگی کی پہلی خوشی کی، اتنی سیلی بریشن تو بنتی تھی۔" وہ کمرے میں موجود پھولوں اور جلتی کینڈلز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"کیسی خوشی......؟" اس کے چہرے پہ جمی سنہری آنکھوں میں حیرت ابھری تھی۔

"خود پڑھ لو......" اس نے ذرا سا پیچھے ہو کر ٹیبل پہ پڑی ایک فائل اٹھائی اور اس کی طرف بڑھا دی۔

افنان نے الجھ کر اسے دیکھا، اور فائل اس کے ہاتھ سے لے کر اس پہ سرسری سی نظر دوڑائی۔ وہ بیلا کی پریگننسی رپورٹ تھی اور پازیٹیو تھی۔

"مائی گاڈ۔" حیرت، خوشی، سکون سارے جذبات آپس میں گڈمڈ سے ہو گئے تھے۔ ایک ہاتھ میں پھول دوسرے میں فائل پکڑے اس نے بیلا کو خود سے لگا لیا تھا۔

"جواب نہیں تمہارا...... یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ اسے ساتھ لگائے لگائے ہی بولا تھا۔

"بس......"

جانے کیوں اسے لگا، اس کی آواز کپکپائی ہے، جیسے اس نے ڈھیر سارے آنسو اندر ہی اندر اتارے ہیں، دھیرے سے اسے خود سے الگ کرکے اس نے دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی۔ جانے کیوں آج اسے وہم آرہے تھے بار بار، عجیب سے خیالات۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ تو بہت خوش لگ رہی تھی۔

"مما کو بھی بتا دیا ہے۔ بہت خوش ہو رہی تھیں۔ اپنے پاس آنے پہ اصرار کر رہی تھیں۔" وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ شاید شرما رہی تھی۔

"نو وے۔ ابھی تو آئی ہو، اب پھر سے جانے کی باتیں؟ اور اس کنڈیشن میں تو بالکل نہیں۔" افنان نے صاف انکار کیا تھا۔

"ارے......" بیلا ہنس دی تھی۔

"اس کنڈیشن کا کیا مطلب؟ ابھی تو پریگنینسی کا اسٹارٹ ہے، میں آسانی سے سفر کر سکتی ہوں۔ پھر آگے مشکل ہوگی، جانے دو ناں پلیز۔"

ہنستی مسکراتی بچوں کی طرح منہ بسورتی وہ اسے اتنی اچھی لگی کہ کتنے ہی پل وہ اسے دیکھے گیا۔

"اور میرا کیا......؟" وہ اس کے قریب ہوا تھا۔

"آجاؤں گی ناں ایک ڈیڑھ ہفتے کے لیے پلیز۔" افنان کو لگا وہ ہر صورت جانا چاہتی ہے۔

"او کے۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

"مگر چار پانچ دن سے زیادہ نہیں۔ کلیئر؟" اس نے انگلی اٹھا کر گویا تنبیہ کی تھی۔

"او کے باس۔" وہ ہنس دی تھی اور افنان جان ہی نہیں سکا کہ اس کی ہنسی میں کیسے طوفان کروٹیں لے رہے ہیں۔

☆☆☆

"مما! میں کراچی جانا چاہتی ہوں، دادا جی سے ملنے۔" بیلا کو لاہور پہنچے ابھی ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا جب اس نے کراچی جانے کی خواہش ظاہر کی اور مریم اسے حیرت سے دیکھ کر رہ گئیں۔ پہلے ہی وہ اس کی اتنی جلدی دوبارہ آمد پہ حیران تھیں، ابھی دو ماہ پہلے ہی تو اس نے پاکستان چکر لگایا تھا اور سال کا سال بمشکل چکر لگانے والی بیلا۔ جب بھی پاکستان آئی تھی، اس طرح قاری صاحب سے ملنے کی خواہش کا اظہار تو کبھی نہیں کیا تھا، بس ان کا ذکر چلتا تو سرسری سا ان کے بارے میں پوچھ لیتی تھی اور اب......

"وہاں جا کر کیا کرو گی، وہ کون سا کسی سے ملنے یا بات کرنے کی پوزیشن میں ہیں، بستر ہی پہ تو پڑے ہیں ایک زندہ لاش کی طرح۔"

جواب ان کے بجائے عبدالرحمٰن صاحب نے دیا تھا اور انہیں زندہ لاش کہتے ان کی آواز کپکپائی تھی۔

"لیکن اس بار وہ مجھ سے ملیں گے بھی، اور بات بھی کریں گے۔" اس کے پریقین انداز میں کہنے پہ عبدالرحمٰن صاحب نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"کیا مطلب......؟"

"آپ کو پتا ہے بابا! میں ان کے سوال کا جواب لے کر آئی ہوں۔" جانے کیا تھا اس کے لہجے میں، عبدالرحمٰن صاحب اور مریم بیک وقت چونکے تھے۔

"انہوں نے کہا تھا ناں کہ میں اپنے رب سے دعا کروں گا، اپنے اٹھائے گئے سوال کا جواب اب یہ خود لے کر میرے پاس آئے۔"

وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بول رہی تھی۔

"ان کی دعا قبول ہوئی ہے، میں...... میں اس سوال کا جواب لے آئی ہوں بابا، میں جان گئی ہوں کہ موسیقی کی اسلام میں کیوں گنجائش نہیں ہے کیوں ہمارے محبوب پیغمبر موسیقی کی آواز سنتے ہی کانوں میں انگلیاں دے کر اس جگہ سے جلد از جلد دور ہو جاتے تھے۔ یہ شیطانی آوازیں ہیں بابا......"

یک ٹک سامنے موجود دیوار پہ نظریں جمائے وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے نکلتے آنسو اس کی ٹھوڑی سے ٹپکتے گریبان میں جذب ہو رہے تھے، پتا نہیں کیوں، مگر مریم کو اس پل وہ نارمل نہیں لگ رہی تھی۔

''بیلا! میری جان! کیا ہوا ہے......؟''

وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھیں اور بیلا کے ساتھ بیٹھ کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا، جبکہ عبدالرحمٰن صاحب ہونٹ بھینچے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ میٹنگ روم کا ماحول ایک دم گمبھیر سا ہو گیا تھا۔ ابھی بلیک ڈیڑھ مہینے پہلے ہی جب مریم نے انہیں بیلا کی پریگنینسی اور اس کے یہاں آنے کے بارے میں بتایا تو وہ کتنا خوش ہوئے تھے۔ اپنی اس بیٹی سے انہیں باقی بیٹیوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی پیار اور انسیت تھی اور اب اس کی کامیابیاں دیکھ کر سب سے زیادہ فخر بھی انہیں محسوس ہوتا تھا۔

زندگی میں جس مقام پر پہنچنے کی انہیں خواہش تھی، اس مقام پہ ان کی بیٹی پہنچ چکی تھی، اس سے بڑھ کر خوشی ان کے لیے کیا ہوتی۔ مگر اب وہ کیا کہہ رہی تھی؟ کیوں اتنی ٹوٹی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ یک ٹک مریم کے کندھے سے سر ٹکائے ہچکیاں بھرتی بیلا کو دیکھ رہے تھے۔ پتا نہیں کتنے دنوں کا غبار تھا جو وہ یوں روتے ہوئے نکال رہی تھی۔ ہچکیاں لے کر روتے ہوئے وہ پتا نہیں کیا کہتی جا رہی تھی۔

''میں فوراً آ جاتی مما، مگر، میں چاہتی تھی کچھ پروف ہو میرے ساتھ، مگر میں، میں بیان دے کر آئی ہوں، ان کے خلاف......''

یہ کیا کہہ رہی تھی وہ۔ کون سے ثبوت؟ اور بیان کس کے خلاف بیان؟ کیا اس کا افنان سے کوئی جھگڑا ہوا تھا۔''

وہ اور مریم بے حد الجھے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھتے، اس کے خاموش اور نارمل ہونے کا انتظار کر رہے تھے، تاکہ اس سے تفصیل سے بات کر سکیں، اور وہ تھی کہ روئے جا رہی تھی۔ زار و قطار۔

''میں نے دادا جی کے پاس جانا ہے مما۔''

اس نے ایک بار پھر کہا تو عبدالرحمٰن صاحب چپ نہ رہ سکے۔

''ٹھیک ہے تم۔ چپ کرو، ابھی جاتے ہیں دادا جی کے پاس، شاباش۔''

وہ صوفے پہ اس کے دوسری طرف جا کر بیٹھ گئے اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا تھا اور ان کے ہاتھ میں جانے کیا تاثیر تھی۔ روتی ہوئی بیلا کے دل کو جیسے قرار آتا جا رہا تھا۔ اس کی ہچکیاں آہستہ آہستہ تھمنے لگی تھیں اور اس کے خاموش ہونے کا انتظار کرتے مریم اور عبدالرحمٰن منتظر نظروں اور دھڑکتے دل سے اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ کیا کہنے والی تھی، وہ کیا کرنے جا رہی تھی؟ اور اس کے نتیجے میں کیا کیا طوفان اٹھنے تھے۔ تب شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

''مجھ سے بڑی بھول ہوئی دادا جی، بڑی بھول ہوئی۔ میں نے رب کے حکم پر سوال اٹھایا تھا ناں، لاجک ڈھونڈنا چاہی تھی، وجہ مانگی تھی ناں، تو وجہ میرے منہ پہ مار دی گئی۔ جواب مل گیا ہے مجھے، میرے سوال کا اور ایسے وقت ملا ہے کہ پلٹنا مشکل ہے دادا جی! بہت مشکل، کاش! آپ نے مجھے اتنا آگے بڑھنے ہی نہ دیا ہوتا۔ وہیں پہ روک لیا ہوتا۔ کیا ہو جاتا پھر، اتنا ہی ناں کہ میں بھی پاپا کی طرح سنگر بننے کی حسرت دل میں دبا لیتی، سہہ لیتی میں، مگر جواب ہوا ہے، وہ سہنا مشکل ہے، بہت مشکل ہے دادا جی! بہت مشکل، بہت تکلیف میں ہوں میں، درد ہے بہت، بہت درد ہے دادا جی......''

ہاسپٹل کے کمرے میں ان کا ہاتھ تھامے زار و قطار روتی بیلا نے عبدالرحمٰن صاحب اور مریم کو بھی رونے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اس نے سنگنگ کے ساتھ ساتھ افنان کو چھوڑنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا، لیکن وہ جانتے تھے۔ یہ فیصلہ اس کے لیے کتنا کٹھن تھا، وہ افنان سے محبت نہیں عشق کرتی تھی، اور اس نے نہ

صرف اسے چھوڑ دیا تھا بلکہ وہ عدالت میں سوسائیڈ اسکینڈل پہ چلتے کیس میں اس کے خلاف مخالف پارٹی سے جا ملی تھی اور اپنا بیان ریکارڈ کروا آئی تھی، اور اگلی پیشی میں اس کا بیان سن لینے کے بعد پتا نہیں عدالت کا کیا فیصلہ آنا تھا۔

بیلا کے ہاتھوں سے قاری صاحب کا ہاتھ چھڑاتے عبدالرحمٰن صاحب نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکا تھا، آنے والا وقت بیلا کے ساتھ ساتھ ان کے لیے بھی کٹھن تھا۔

انہیں بیک وقت کئی محاذوں کا سامنا کرنا تھا۔

وہ جانتے تھے، افنان اور بیلا جس کمپنی میں کام کرتے تھے۔ اس کا ایک ننھا سا پرزہ تھے۔ بیلا نے صرف افنان کے خلاف بیان نہیں دیا تھا بلکہ بلاواسطہ اس کمپنی سے ٹکر لی تھی۔ اگر وہ پہلے ان کے پاس آتی تو شاید وہ اسے روک لیتے، کسی اور بہانے اس کی اور افنان کی علیحدگی کروا دیتے۔

مگر اب، جبکہ وہ مخالف وکیل کے سامنے نہ صرف اعتراف کر چکی تھی کہ واقعی گانے میں بیک ٹریکنگ ہوئی ہے۔ بلکہ اپنا یہ اعتراف ریکارڈ کر کے اسے دے آئی تھی کہ وہ آئندہ ہونے والی پیشی پہ عدالت میں پیش کر سکے۔

تو انہیں اب مقابلہ کرنا ہی تھا جتنی ان میں ہمت تھی، کم از کم اس حد تک تو اس کا ساتھ دینا ہی تھا اور اس مرحلے پہ انہیں کمزور نہیں پڑنا تھا۔

بیلا کو سنبھالنے کے لیے ان کا اپنا سنبھلنا ضروری تھا۔ کسی بھی کمزوری کا مظاہرہ بیلا کو مزید ہراساں اور پریشان کر سکتا تھا۔ سو خود کو کمپوز کیے وہ بمشکل روتی بلکتی بیلا کو پیچھے کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

جب کوئی دروازہ کھول کر اندر آیا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور ساکت رہ گئے، وہ ولی تھا۔ ولی بھی انہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"چچا جان! آپ......؟" ولی کے لبوں سے بمشکل آواز برآمد ہوئی تھی۔

عبدالرحمٰن صاحب یوں کھڑے تھے جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو، بیلا کی شادی کے وقت ان کی اپنے خاندان سے ایسی ناچاقی ہوئی تھی کہ اس کے بعد ان کا کوئی رابطہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے خود کوئی رابطہ رکھنا چاہا ہی نہیں تھا، وہ تو خود کو بالکل حق پہ سمجھتے تھے، ابھی کل تک بیلا کے پاکستان آ کر انہیں سب بتانے تک تو، وہ خود کو ہی ٹھیک سمجھتے آئے تھے۔

مگر......ان چند گھنٹوں میں کیا کیا تھا جو بدل گیا تھا اور پتا نہیں کیا کچھ تھا جو بدلنا تھا۔ ان کے برسوں کے نظریات یوں مسمار ہوئے تھے کہ ان کے ملبے پہ وہ خود حیران پریشان کھڑے رہ گئے تھے۔

"کیسے ہیں آپ......؟" آخر ولی ہی آگے بڑھا تھا۔

"السلام علیکم مریم آنٹی......ارے بیلا بھی آئی ہوئی ہے؟" ان کے روئے روئے چہروں سے نظریں چرائے وہ نارمل انداز میں ملنے اور نارمل نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا، ولی کو دیکھ کر بیلا نے بھی بمشکل خود پہ ضبط کیا تھا۔

"ہاں، بس......دادا جی کی یاد آئی تو ملنے چلی آئی۔ بس۔"

دونوں ہتھیلیوں سے آنسوؤں سے تر گال رگڑتے وہ جیسے اپنے چہرے سے رونے کے سارے نشانات مٹانا چاہتی تھی۔

"تو پھر اسٹے کدھر کر رہی ہو؟ کب تک ہو ادھر......؟" ولی نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔

"نیلم آنٹی کی طرف رکیں گے۔" وہ بمشکل مسکرائی تھی۔

"اچھا......" ولی چاہ کر بھی اسے گھر آنے کی دعوت نہ دے سکا......اپنے والد اور چچا کی عبدالرحمٰن صاحب سے ناراضی کی شدت بھی جانتا تھا اور وجہ بھی......

اور جو وجہ تھی، جو ناراضی کا باعث بنی تھی وہ بھی ان کے ساتھ ہی تھی، بیلا کا کانٹیکٹ نمبر لے کر بہت اداسی سے اس نے انہیں رخصت کیا تھا اور قاری صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ بات نہیں

کر سکتے تھے، نہ ہی ان کی باتوں کے جواب میں کوئی رسپانس ہی دے سکتے تھے، مگر ان کی کھلی آنکھوں سے بہتی آنسوؤں کی باریک سی لکیر بتا رہی تھی کہ وہ سب سمجھتے ضرور تھے۔ کم از کم اتنا تو کہ بیلا کا آنا اور اس کا رونا انہیں تکلیف دے رہا تھا اور پتا نہیں انہوں نے کب تک یوں ہی اسی حالت میں رہنا تھا اور کبھی ہوش میں آنا بھی تھا یا نہیں۔ ان کے بیڈ کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھتے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھپکتے وہ دل گرفتی سے یہی سوچ جا رہا تھا۔ جب ان کا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں کپکپایا اور یہ کپکپاہٹ اتنی زیادہ تھی کہ وہ دنگ رہ گیا تھا۔ حیرت سے منہ کھولے کچھ پل ان کے کپکپاتے ہاتھوں کو دیکھتے رہنے کے بعد، وہ بجلی کی سی تیزی سے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے بھاگا تھا۔

☆☆☆

قاری صاحب کو ہوش آ گیا تھا۔ تقریباً پانچ سال لگے تھے مگر اب وہ کوما سے باہر تھے۔ ولی نے ایک دو نمبرز پر ہی کال کی تھی اور پوری فیملی ہاسپٹل میں جمع ہو گئی تھی۔ ایک دوسرے کو بتاتے، کبھی ہنستے کبھی روتے وہ سارے ان سے ملنے کے منتظر تھے۔

ولی کا دل چاہا، وہ بیلا کو بھی خبر کر دے مگر پھر کچھ سوچ کر رک گیا تھا۔ پوری فیملی ہاسپٹل میں موجود تھی اور ان میں سے اکثریت قاری صاحب کی حالت کا ذمہ دار بیلا کو سمجھتی تھی۔ کوئی بھی کچھ بھی کہہ سکتا تھا اسے، اور جتنے دل گرفتہ وہ اور عبدالرحمن صاحب اسے لگے تھے، وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں یہاں آ کر کسی کی باتیں سننا پڑیں۔ سو وہ چاہ کر بھی انہیں فوراً بتا نہیں پایا اور ان کو دادا جی کا ہوش میں آنے کا بتانا کسی اور وقت پہ ٹال کر خدیجہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''دادا جی سے ملنے کیوں نہیں دے رہے ڈاکٹر ابھی...... کیا کنڈیشن ہے...... کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر؟''

خدیجہ بے چینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ باقی سب کا بھی یہی حال تھا جبکہ اشعر بھائی، والد اور چچا کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس گئے تھے اور باقی سب کے سوالوں کا سامنا کرنے کے لیے ولی رہ گیا تھا۔

''میری بات ہوئی ہے ڈاکٹر عثمان سے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ابھی انہیں ریہبلائزیشن کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصہ انہیں ہاسپٹل میں ہی رکھیں گے۔''

ولی نے بتایا تو وہ سب ہی بے قرار سے ہو گئے۔

''کچھ عرصہ......؟''

''اب انہیں ہوش آ گیا ہے تو ہم انہیں گھر لے جائیں گے ناں۔''

وہ سب ہی اپنے اپنے انداز میں، اپنی الجھن کا اظہار کر رہے تھے۔

''تم تو ملے ہو دادا جی سے۔ کیسے تھے......؟ کچھ پوچھا تم سے...... کوئی بات ہوئی تھی؟''

رامین نے پوچھا۔ باقی سب بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''پتا نہیں۔ ابھی تو کنفیوز سے تھے۔ جیسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو انہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ اور...... پہلے تو کچھ لمحوں تک مجھے بھی پہچاننے میں ناکام رہے تھے پھر بس...... اور کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ان کا ٹریٹمنٹ اسٹارٹ ہو گیا تھا پھر۔''

''ویسے ولی! دادا جی کا پانچ سال بعد یوں اچانک سے ہوش میں آنا...... جبکہ ہم بالکل ہی مایوس ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اب تو ڈاکٹرز نے بھی امید دلانا بند کر دی تھی اور بس دعا کا کہتے تھے۔ کتنا عجیب سا لگ رہا ہے ناں۔'' خولہ نے کچھ خوشی، کچھ حیرت سے کہا تھا۔

''ہاں یاد ہے، ڈاکٹر عثمان نے کہا تھا آپ ان سے روزانہ آ کر بات کیا کریں۔ خاص کر ان کے ہاتھ تھام کر، ہو سکتا ہے کوئی بات، کوئی یاد ان کے دل و دماغ پر اتنا اثر انداز ہو کہ یہ ہوش میں آ جائیں۔ تم ان سے کیا بات کر رہے تھے ولی! جب دادا جی ہوش میں آئے......''

دیا نے دلچسپی سے استفسار کیا تھا۔

دلی ایک پل کو رکا۔ کیا انہیں بتانا چاہیے؟ ہونٹ بھینچے وہ ان سب کی منتظر نگاہوں میں جھانکتا رہا۔ پھر جیسے فیصلہ ہو گیا۔

"میں نہیں...... بیلا اور عبد الرحمٰن چچا بات کر رہے تھے۔ جب میں ادھر آیا تو وہ جانے والے تھے اور پھر وہ جیسے ہی گئے، دادا جی ہوش میں آ گئے۔"

وہ بول رہا تھا اور سب ہکا بکا اسے سن رہے تھے۔

☆☆☆

سجدے میں سر رکھے مریم چونکی تھیں۔ جبکہ بیڈ پر بیٹھی بیلا کا چہرہ ویسے ہی سپاٹ رہا تھا۔ کچھ کہنے کے بجائے وہ بس استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھتی رہی تھی۔ آج کل وہ ایسی ہی ہو گئی تھی، گم صم سی، کوئی بات اس پر اثر انداز ہی نہیں ہوتی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہوں میں۔ یہ کیا کر آئی ہو تم۔ کیسا بیان دیا ہے تم نے عدالت میں۔" اس کا کندھا ہلاتے ہوئے انہوں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"اور تم...... تم افنان کی کال کیوں نہیں پک کر رہیں۔ مریم کا نمبر بھی بند جا رہا ہے۔ ابھی مجھے کال کی ہے اس نے۔ یہ ہو کیا رہا ہے۔"

بیڈ پر اس کے سامنے بیٹھتی نیلم کے انداز میں واضح بے ربطی تھی۔ افنان نے کال کر کے جو کچھ انہیں بتایا تھا، جس طرح کا بیان بقول اس کے بیلا دے آئی تھی، وہ انہیں حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ تو بیلا اور مریم کے اپنے گھر آنے کو سرپرائز وزٹ بھی تھیں اور پھر انہیں ان کے ساتھ بیٹھنے کا اتنا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اپنی بہت ساری ریکارڈنگز کینسل کرنے کے باوجود، کچھ ضروری ریکارڈنگز کے لیے انہیں ایک دن کے لیے جانا ہی پڑا تھا اور ابھی پرسوں ہی تو وہ دونوں آئی تھیں۔ آج وہ بالکل فارغ تھیں اور بیلا اور مریم کے ساتھ پورا دن گزارنے کے خیال نے ان کا موڈ بھی خوش گوار رکھا تھا۔ مگر......

افنان کی کال نے سب درہم برہم کر دیا تھا۔

بیلا کو ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر انہوں نے مریم کی طرف رخ کیا۔ وہ نماز پڑھ چکی تھیں اور اب دعا کے لیے ہتھیلیاں پھیلائے بیٹھی تھیں۔

"مریم! تم ہی بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟"

ان دونوں کی خاموشی سے وہ عاجز آ گئی تھیں۔ مریم نے رخ پھیر کر انہیں دیکھا، پھر دعا مختصر کر کے اٹھ آئی تھیں۔

"کیا بات ہوئی ہے افنان سے تمہاری؟" بجائے ان کی کسی بات کا جواب دینے کے مریم نے الٹا سوال کیا تھا۔

"وہ...... وہ تو پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ سوسائیڈ اسکینڈل کیس میں بیلا مخالف وکیلوں سے جا ملی ہے۔ افنان اور جس کمپنی کے ساتھ ان کا کانٹریکٹ چل رہا ہے، اسی کے خلاف بیان دے کر آ گئی ہے اور بیان بھی کیا، سیدھا سیدھا مان لیا ہے اس نے تو کہ واقعی سونگ میں بیک ٹریکنگ کے ذریعے خودکشی کرنے کا Hidden Massege (پوشیدہ پیغام) تھا۔ کیا بکواس ہے یہ؟ افنان سے کوئی جھگڑا ہوا بھی تھا تو اس حد تک جانے کی کیا ضرورت تھی۔"

نیلم کا بول بول کر سانس پھول رہا تھا۔

"عدالت میں کیا فیصلہ ہوا ہے؟" بیلا نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

"تم مجھے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی ہی کہی جا رہی ہو۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں؟"

نیلم جھلا گئی تھیں۔

"آپ پہلے بتائیں، تو کیا فیصلہ دیا ہے عدالت نے؟" بیلا اب کے اپنی بے چینی چھپا نہیں پائی تھی۔

"کیا افنان اور اس کمپنی کے خلاف ہوا ہے فیصلہ؟" اس نے پر امید انداز میں نیلم کو دیکھا تھا۔

نیلم ہونٹ بھینچے اسے دیکھے گئیں۔

"نہیں......" پھر کچھ سوچ کر انہوں نے جواب دیا۔ "عدالت نے فیصلہ محفوظ کر لیا ہے۔ افنان نے بیان دیا ہے کہ تمہارا اور اس کا کوئی پرسنل جھگڑا ہوا تھا

اور تم ناراضی میں اس حد تک چلی گئیں کہ اس کے خلاف بیان دے دیا۔ اب تم نے خود جا کے عدالت میں بیان دینا ہو گا دوبارہ۔ اور اگر اپنے بیان پر قائم ہو تو ثبوت بھی مہیا کرنے ہوں گے۔"

بیلا جانتی تھی، ایسا ہو گا۔ اسے عدالت جا کر خود بیان دینا ہو گا۔ بیرسٹر نے یہی کہا تھا اس سے اور رہی ثبوت کی بات تو وہ بھی تھے اس کے پاس۔ یوں ہی تو وہ دل پر پتھر رکھ کر ایک ماہ تک افنان کے ساتھ نہیں رہتی رہی تھی، ورنہ سب جان لینے کے بعد تو اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اڑ کر پاکستان پہنچ جائے۔ اپنے مما، پاپا اور دادا جان کے پاس۔"

"تم یہ بتاؤ کہ اس قسم کا بیان دینے کی تمہیں ضرورت کیا تھی۔ اگر واقعی افنان سے کوئی جھگڑا ہو گیا تھا تو یہ کوئی حل تو نہیں تھا۔"

اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر نیلم ایک بار پھر بول پڑی تھیں۔

"کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا نیلو آنٹی۔"

بیلا کی آواز بھرا گئی تھی۔ مریم نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام کر گویا تسلی دی۔

"میں نے سچا بیان دیا ہے۔ سونگ میں واقعی بیک ٹریکنگ ہوئی ہے۔" لب چباتے خود پر بے حد ضبط کرنے کے باوجود اس کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔

"مگر......" نیلم پتا نہیں کیا کہنا چاہتی تھیں، پر بیلا کے موبائل پر کال آنے لگی تو انہیں اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑی۔ بیلا موبائل کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

"ولی کالنگ" موبائل پر ولی کا نام دیکھ کر وہ ٹھٹکی تھی۔ پھر اس نے فوراً کال پک کی تھی۔

"ہیلو......"

"ہاں۔ فائن۔ تم سناؤ۔" وہ پھیکا سا مسکرائی تھی۔

"کیا؟"

ولی نے پتا نہیں کیا کہا تھا کہ وہ حیرت سے اچھل پڑی تھی۔

"کب......؟ اور تم اب بتا رہے ہو"۔

پھر رک کر دوسری طرف سے اس کی بات سنی۔

"میں...... میں ابھی آ رہی ہوں۔ ہاسپٹل میں ہیں ناں؟"

"ہاں میں پہنچتی ہوں۔"

وہ اب کھڑی ہو کر اپنی قمیص کی شکنیں درست کر رہی تھی۔ مریم اور نیلم اسے ناسمجھی سے دیکھتی رہ گئیں۔ وہ موبائل کندھے سے لگائے بات کرتی اب اپنا بیگ کندھے پر ڈال رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے......؟ کہاں جا رہی ہو؟"

آخر مریم کو ہی ہوش آیا تو وہ بے ساختہ اس کی طرف لپکیں۔

"اوکے بائے۔ ولی! میں آ رہی ہوں۔"

بیلا نے موبائل بند کر کے بیگ میں ڈالا اور...... اس کی آنکھیں...... وہ خوشی سے چمکتی آنکھیں۔ آنسو چھلکاتی وہ آنکھیں...... خوشی اور آنسوؤں کا ایسا سنگم تھا کہ مریم یک ٹک دیکھے گئیں۔

"دادا جی کو ہوش آ گیا ہے۔ میں ہاسپٹل جا رہی ہوں ان سے ملنے۔"

"اپنے پاپا کو تو آنے دو۔ میں اور وہ بھی جائیں گے تمہارے ساتھ۔" مریم نے اسے روکنا چاہا۔

"نہیں۔ آپ بابا کو بتا دیں اور پھر ان کے ساتھ آ جایئے گا۔ میں جا رہی ہوں۔" بیلا ان کے گال سے گال مس کرتے دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔

"نیلو...... اپنا موبائل دو۔ میں عبدالرحمٰن کو کال کر کے بتاؤں، اس کو کہاں ہوش رہے گا بتانے کا۔"

مریم نے پلٹ کر نیلم سے کہا تو موبائل مریم کی طرف بڑھاتے نیلم اپنے بہت سے تشنہ سوالوں کا جواب ڈھونڈتی رہ گئی تھیں۔ فی الحال مریم اور بیلا تو ان کے کسی سوال کا جواب دینے والی نہیں تھیں۔

☆☆☆

اور ایک ڈیڑھ ہفتے بعد بیلا اپنے ددھیال میں قاری صاحب کے ساتھ ان کے کمرے میں موجود

تھی۔ کمرے میں اس کے علاوہ اشعر، ولی، عبدالرحمٰن صاحب اور اس کے دونوں تایا بھی موجود تھے۔ تین دن بعد بیلا نے واپس انگلینڈ جانا تھا۔ اسے بیان دینے کے لیے عدالت میں پیش ہونا تھا اور ابھی یہی معاملہ زیر بحث تھا۔

"ثبوت کے بغیر تمہارے بیان کو شاید ہی کوئی تسلیم کرے۔" اشعر نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بیلا کو دیکھا۔

"کیوں، میں نے خود وہ گیت گایا ہے۔ میرے بیان کی کوئی ویلیو نہیں ہے کیا؟" بیلا نے تیکھے انداز میں کہا۔

"جس طرح تمہارے اور افنان کے جھگڑے کو میڈیا پہ ہائی لائٹ کیا جا رہا ہے، اس سے تو یہی تاثر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، جیسے تم نے ذاتی عناد کی بنیاد پر یہ بیان دیا ہے۔ اور جو جھگڑے کی وجہ بیان کی جا رہی ہے، اس کے بعد تو واقعی ایسا لگتا ہے کہ......"

جہاں اشعر تھوڑا جھجک کر خاموش ہوا تھا، وہیں بیلا کی نظریں بھی جھک گئی تھیں۔ افنان نے جھگڑے کی وجہ ہی ایسی بیان کی تھی، بقول اس کے بیلا نے اسے اس کی گرل فرینڈ کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں دیکھا اور غصے میں اس حد تک چلی گئی۔

"میں نے حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد بھی ایک ماہ تک کا عرصہ وہاں بہت مشکل سے اسی آس میں گزارا تھا کہ شاید کوئی ثبوت مل جائے۔ ان کی اس بارے میں کی جانے والی بات چیت کی کوئی ویڈیو یا آڈیو ہی مل جائے مگر......" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"اب لے دے کے ڈیوڈ کے پاس ہی کچھ ثبوت ہیں۔" عبدالرحمٰن صاحب تو واقف تھے، مگر باقی سب کے چہروں پر بیک وقت اطمینان ابھرا تھا۔

"اچھا کیسا ثبوت؟" سوال عبدالواحد کی طرف سے آیا تھا۔

"انہوں نے اس سونگ کو نارمل اسپیڈ میں بیک ورڈ چلا کر ریکارڈ کر لیا تھا اور اس میں وہ ہائیڈن میسج (پوشیدہ پیغام) واضح سنائی دے رہا ہے۔"

"بس......؟" ولی نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"ہاں تو......؟ کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے۔" بیلا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اس کا توڑ تو انہوں نے پہلے ہی سوچ لیا ہوگا۔ کیس زیر سماعت تھا اور اسی بیس پر کیا گیا تھا، تو کیا انہیں نہیں پتا ہوگا کہ مخالف وکیل ایسا کر سکتے ہیں۔" عبدالباسط صاحب نے دھیرے سے کہا۔

"تو......؟" بیلا اب مایوسی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"سب سے پہلے تو تم ان کے وکیل...... وہ کیا نام بتا رہی تھیں تم اس کا؟"

"ڈیوڈ۔" بیلا نے انہیں یاد دلایا۔

"ہاں ڈیوڈ...... اس سے رابطہ کر کے پوچھو کہ اس نے وہ ریکارڈنگ عدالت میں پیش کی تھی یا نہیں اور اگر پیش کی تھی تو مخالف وکلاء کا کیا رسپانس تھا۔" وہ ایک پل کو رکے۔

"اور بیٹا! یہ تو تمہیں بیان دینے سے پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔ کیس کی باریکیوں کو سمجھ لینا چاہیے تھا۔"

"بس وہ......" بیلا خفت زدہ سی ہو گئی۔ کیا بتاتی کہ اس وقت اسے اور ہی روگ تھے۔ وہ ایسا کچھ سوچنے کی پوزیشن میں کب تھی۔

"اس سے بھی پہلے بیلا کو ایک اور کام کرنا چاہیے۔" ولی نے گفتگو میں حصہ لیا تو سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ میڈیا کا دور ہے۔ اب تک میڈیا پہ افنان کی طرف سے ہی آ رہا ہے، جو کچھ بھی آ رہا ہے۔ بیلا کو اپنی بات بھی لوگوں تک پہنچانی چاہیے۔ نہیں......؟" اس نے سوالیہ انداز میں سب کو دیکھا۔

"ہاں، یہ تو اب بیلا کی ذمہ داری بن گئی ہے۔ جو کچھ اس کے علم میں آیا ہے۔ اسے لوگوں تک پہنچائے گی۔ اگرچہ جھوٹ سچ سے زیادہ قابل اعتماد ہوتا جا رہا ہے اور سچ کی حیثیت ناقابل اعتماد حقیقت

کی سی ہوتی جا رہی ہے۔ ہوسکتا ہے بہت کم لوگ اس کا یقین کریں، مگر...... اس نے اپنا فرض تو نبھانا ہے۔"

قاری صاحب کی بات پر وہ سب چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ ان کی پہلی طویل گفتگو تھی۔ اگرچہ اس میں بھی واضح بے ربطی تھی، ان جیسی سلیس گفتگو کرنے والے کی، جملوں کی ایسی بناوٹ حیران کن تھی مگر وہ سب کی باتیں سمجھ رہے تھے اور اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے یہ بھی خوشی کی بات تھی۔ ورنہ تو دو دن ہو گئے تھے انہیں ہاسپٹل سے آئے، سب کی باتیں سن کر مختصر جواب دیتے۔ وہ بھی جب خاص طور پر انہیں مخاطب کیا جاتا ورنہ خاموش ہی رہتے تھے۔

"ٹھیک ہے، میں تو تیار ہوں۔ کیا پریس کانفرنس کریں گے؟" بیلا نے فوراً ہی رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ اگرچہ وہ کافی حد تک سنبھل گئی تھی، مگر اس کی زرد رنگت اور اس کے وجود سے لپٹی اداسی بتاتی تھی کہ کوئی بات ہے جو اندر ہی اندر اسے کھائے جا رہی ہے۔

"میرا ایک دوست ٹی وی چینل پر بطور اینکر کام کر رہا ہے۔ پرائم ٹائم میں شو چلتا ہے اس کا۔ اس میں ایز آ گیسٹ نہ بھجوا دیں تمہیں۔"

اشعر نے بیلا کو سوالیہ انداز میں دیکھا۔ وہ خود بھی کافی اچھا صحافی تھا اور اس کے لکھے ہوئے کالم بہت پسند کیے جاتے تھے۔

"ہاں، پریس کانفرنس کے مقابلے میں یہ زیادہ بہتر رہے گا۔" عبدالباسط صاحب نے کہا تو باقی سب نے بھی تائید کے انداز میں سر ہلا دیے۔

"لیکن...... وہ ایک حد تک اور اپنی پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی بیلا کو بات کرنے دیں گے۔ میرا خیال ہے، رانیہ کا یوٹیوب چینل بھی استعمال میں لایا جائے۔ خاصے ویورز ہیں اس کے بھی۔ کیا خیال ہے؟"

ولی نے سوالیہ انداز میں سب کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ کرو پھر جو کچھ کرنا ہے۔ مگر دیکھ بھال کر اور ذرا جلدی پھر بیلا کو دو تین دن تک تو جانا بھی ہے۔"

"کیا اکیلی جائیے گی؟" عبدالباسط صاحب کے ماتھے پہ شکن پڑی تھی۔ عبدالوہاب صاحب بھی بے چین سے ہوئے۔

"جی تایا جی! پہلے بھی تو اکیلی آتی جاتی رہی ہوں۔"

بیلا حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی، جیسے ان کے اعتراض کی وجہ جاننا چاہ رہی ہو۔

"پہلے کی بات اور تھی، مگر اب جو حالات ہیں تو عبدالرحمٰن تمہیں جانا چاہیے بیلا کے ساتھ۔"

"مگر پاپا کا تو ویزا ری نیو کروانا ہے اور میں نے پرسوں کی فلائٹ بھی بک کروالی ہے۔" ہونٹ چباتی ہاتھوں کو مسلتی وہ الجھی سی بیٹھی تھی۔

"میرے ایک دو جاننے والے ہیں، میں ان سے رابطہ کرتا ہوں۔ جہاں تک ہوسکا وہ تمہاری مدد کریں گے۔ جاتے ہوئے رابطہ نمبر لے لینا مجھ سے۔"

عبدالواحد صاحب کی فکر پر عبدالرحمٰن صاحب نے گہرا سانس لیا تھا۔ ایک دفعہ قدم اٹھالیا تھا تو ظاہر ہے پیچھے نہیں ہٹا سکتے تھے۔ حالانکہ راستے کے کانٹے سامنے ہی نظر آ رہے تھے اور وہ جانتے تھے، ان کانٹوں پر ان کی لاڈلی نے پاپیادہ چلنا ہے مگر یہ سب ان کی اپنی کمائی تھی۔ اللہ کے حکم سے انکار کرنے کی کچھ سزا تو انہیں ملنی ہی تھی۔ کاش وہ بھی مریم کی طرح ہوتے۔ اللہ کے حکم پر سوال اٹھانے کے بجائے سر جھکا کر عمل کرنے والے......تو شاید آج حالات کچھ اور ہوتے۔ کاش......وہ سوچ کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

"فتنہ زدہ اس دور میں تاریکی کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں اور روشنی کی کرنیں گہرے بادلوں کے پیچھے گم ہوتی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کا شوق کم ہوتا جا رہا ہے اور دنیا کی محبت

غالب آتی جارہی ہے۔ کبھی آپ نے سوچا ایسا کیوں ہے؟

کیونکہ......

دلوں کے بند دروازے پر دستک دے کر انہیں اللہ تعالیٰ کی محبت اور روحانیت کی طرف پھیر کر لانے کی کوششیں کم ہوگئی ہیں۔ دولت، شہرت اور مادی تسکین کی ہوس چار سو پھیلتی ہی جارہی ہے۔

شیطانی علامات اور شیطان پرستی پر مبنی بول زبان زد عام ہو رہے ہیں اور آپ کو پتا ہے؟ خلق خدا کو شیطان کی پوجا پر مبنی مبہم اور خفیہ کاموں سے کیسے مانوس کیا جارہا ہے۔ کون کون سے طریقے استعمال کیے جارہے ہیں۔ شاید آپ کو یقین کرنا مشکل ہو، میں بھی نہ کرتی اگر جو میں اس سب کا حصہ نہ ہوتی۔"

ایک پل کو رک کر اس نے گہرا سانس لیا اور پھر بولی۔

"کبھی آپ نے سوچا ہے کہ گانوں کے جو بول آپ سنتے ہیں۔ موسیقی کی جس لے پر آپ تھرکتے ہیں، شیطان کی آواز موسیقی کی ان دھنوں میں مدغم ہو کر کس طرح آپ کو خدا کی عبادت سے چھڑا کر اپنی غلامی میں جکڑ رہی ہے...... آپ لوگوں میں میرے جیسے کئی ہوں گے۔ جو اسلام میں موسیقی کی ممانعت کے باوجود اسے روح کی غذا سمجھتے ہوں گے۔ ان کے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا تو رک جائیں۔"

یہاں آ کر اس کی آواز تھوڑی بھرا گئی تھی۔ وہ ایک پل کو رک گئی تھی۔ کیمرہ پکڑے ریکارڈنگ کرتے رانیہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ اسے لگا، بیلا ابھی رو دے گی۔ اس نے کیمرہ بند کرنے کا سوچا مگر وہ سنبھل گئی تھی۔

"اس لیے میں آج اس بحث میں نہیں پڑوں گی کہ اسلام میں اس کے بارے میں کیا احکامات ہیں۔ میں آپ کو اس کے انسانی دل و دماغ پر اثر انداز ہونے اور انسانی خیالات کو بدل دینے یعنی مائنڈ پروگرامنگ کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں اور یقین کریں، ہمارے علماء حضرات اس پر بھی کافی تحقیق کر چکے ہیں، مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم بھی ان کی تحقیقات سے استفادہ ہی نہیں کرتے۔"

"خیر......"

وہ ایک پل کو رکی اور ذہن میں الفاظ مجتمع کرنے لگی۔

"دراصل انسانی ذہن بھی عجیب ہے، یہ اپنے اندر صرف ان معلومات کو اکٹھا کرتا ہے اور اپنی یادداشت کا حصہ بناتا ہے جو اس کے عقائد ونظریات کے مطابق ہوتے ہیں۔ باقی کو یہ اپنی یادداشت کے خانے میں جانے ہی نہیں دیتا مگر یہاں الیکٹرونک انجینئر اور موسیقار انسانی ذہن کی اس خصوصیت سے ہاتھ کھیل جاتے ہیں۔ دراصل میوزم آرکسٹرا پہ نو ٹریکس ہوتے ہیں۔ عموماً میوزک ریکارڈنگ کے لیے آٹھ ٹریکس استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک ٹریک پر موسیقار بیک ٹریکنگ کرتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے عموماً چوتھے یا پانچویں ٹریک کو استعمال کیا جاتا ہے۔ الیکٹرونک انجینئر ریکارڈنگ آلات کی مدد سے اسے باآسانی مانیٹر کر سکتے ہیں۔

بیک ماسکنگ ایک اور ایسی ہی تکنیک کا نام ہے، اس میں لفظ کو الٹا بولتے ہیں جیسے لفظ "Kill" ہے اس کو llik کردیں گے۔ یہ ٹرک فارورڈ ٹریکنگ میں بھی استعمال ہوتی ہے اور زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔

بیک ٹریکنگ اور بیک ماسکنگ کے طریقہ کار کی ذہن کے عمل میں اثرانگیزی دیکھیں کہ اس طریقہ کار میں چھپے ہوئے پیغامات کو کان ذہن تک پہنچا دیتا ہے۔ ذہن اسے قبول اور وصول تو کر لیتا ہے لیکن سمجھ نہیں پاتا کیونکہ یہ نہ سمجھ میں آنے والی حالت میں ذہن کو ملتے ہیں۔ ذہن کا بایاں حصہ جس نے وہ پیغام وصول کیا، ایک کشمکش کی حالت میں ہوتا ہے کہ پیغام کو قبول کر کے آگے بھیجے یا رد کر دے۔ اسی کشمکش میں پیغام گزر کر یادداشت کے خانے میں چلا جاتا ہے۔ وہاں دماغ اس کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کر لیتا ہے اور مستقبل میں کبھی، یہ پیغام کھل کر اپنا رنگ دکھاتا ہے۔

سوسائیڈ اسکینڈل کیس میں دو ڈھائی سو نوجوانوں نے جو خود کشی کی، وہ دراصل خود کشی نہیں مرڈر تھا۔ کیونکہ جو ٹریک انہوں نے سنا اس میں......

"Kill Your Self" (خود کو مار ڈالو)

کا پوشیدہ پیغام چھپا تھا۔ جنہوں نے اسے بار بار سنا، دن رات سنا۔ ان کے لاشعور نے نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ ان کو اس پیغام پر عمل کرنے پر بھی مجبور کر دیا اور وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ نادانستگی میں ہی سہی پر میں بھی ان کے مرڈر میں شامل رہی ہوں۔ اگرچہ مجھے جیسے حقیقت کا پتا چلا میں اس کمپنی سے علیحدہ ہوگئی اور اپنا بیان بھی ریکارڈ کروا دیا مگر......"

بیلا نے تیزی سے آنکھیں جھپکتے اپنے آنسوؤں کو قابو کرنے کی کوشش کی مگر وہ چھلک ہی گئے۔ تیزی سے گالوں کو صاف کرتے اس نے کیمرے کی طرف دیکھا۔

"اور بات اب صرف جان کی نہیں رہی، ان کا اگلا وار آپ کے ایمان پر ہوگا اور وہ زیادہ خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو گانے سنتے، موسیقی کی لے پر تھرکتے آپ کو پتا بھی نہ چلے اور آپ اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اب...... اگر خدانخواستہ انہوں نے ہماری مقدس ہستیوں کی بے حرمتی پر مبنی پوشیدہ پیغام چلا لیا تو ہمارا ایمان...... کیا قائم رہ پائے گا؟ اور ہم خود کیا مسلمان کہلانے کے بھی حق دار ہوں گے؟ اور جب یہ سب آپ اپنے گرد و پیش ہوتا دیکھ رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے حق و باطل میں جاری کشمکش عروج پر پہنچنا چاہتی تھی۔ ایسی صورت میں ہم اور آپ کہاں کھڑے ہیں؟ میرا خیال ہے ہر شخص کو اس لمحے کے بارے میں سوچنا چاہیے جب اللہ تعالیٰ اس سے براہ راست پوچھے گا کہ رحمٰن کے جانباز جب شیطان کے چیلوں سے مصروف جنگ تھے تو اس وقت تم نے کیا کردار ادا کیا تھا۔ تاریکی کے سائے یقیناً چھٹ جائیں گے۔ ان کے مقدر میں یہی لکھا ہے۔ روشنی کی کرنیں آفتاب بن کر رہیں گی۔ خوش نصیب ہیں وہ جو حق کے سرفروشوں کے ساتھ ہوں گے۔ فی امان اللہ!"

بیلا کے آخری الفاظ ادا کرتے ہی رانیہ نے کیمرہ بند کر دیا تھا۔

"ویری ویل ڈن۔" وہ بے ساختہ بیلا کی طرف لپکی اور اسے گلے لگا لیا۔

"کچھ بھولی تو نہیں ہوں ناں۔"

بیلا نے معصومیت سے اس کی طرف دیکھا۔ دراصل ویڈیو بنانے کے لیے انہوں نے مواد پہلے سے ہی لکھ لیا تھا تاکہ مختصر وقت اور آسان الفاظ میں اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا سکیں اور اس کے لیے انہوں نے مختلف کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔ کچھ بیلا نے اپنی ذاتی معلومات بھی شیئر کی تھیں۔

"نہیں، بلکہ لکھے ہوئے سے کچھ زیادہ ہی بول گئی ہو۔"

"بہت اچھے۔" رانیہ نے اس کے کندھے تھپکے۔

"تو لوگوں پر اثر ہوگا۔ وہ میری باتوں کا یقین کرلیں گے۔"

بیلا کے کہنے پر رانیہ نے گہرا سانس لیا۔

"کرنا تو چاہیے کیونکہ میوزک کی فیلڈ سے ریلیٹڈ کسی بندے کی یہ پہلی تفصیلی ویڈیو ہوگی۔ اگرچہ اس موضوع پر پہلے سے ہی یوٹیوب پر کافی ویڈیوز ہیں مگر ...... بہرحال ان کے بنانے والوں کا تعلق میوزک انڈسٹری سے نہیں تھا۔ خیر...... یقین کرنا نہ کرنا اب ان کا کام ہے۔ پہنچانا تمہارا فرض تھا اور تم نے اپنا فرض بخوبی نبھایا ہے۔"

رانیہ کی آواز کپکپا گئی تھی۔ بمشکل خود کو قابو کیے وہ ریکارڈنگ دیکھنے لگی تھی۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

مومنہ ریاض

"بھابھی! بس بھی کردیں اور کتنا ماتم کریں گی۔ یہ تو پتا ہے کہ ایک نہ ایک دن ہر کسی نے اس دنیا سے جانا ہے تو آپ بھی صبر کریں اور آ کر اماں کی بات سنیں۔"

صبا جو کہ ماریہ کی نند تھی اور آج کل میکے آئی ہوئی تھی۔ بھابھی کو دلاسا دینے کے بجائے ماں کا پیغام دے کر چلی گئی۔

"یا اللہ! یہ کیسی مخلوق ہے، جس کو تیرے بندوں کا ذرا بھی خیال نہیں۔ آج میری ماں کو اس دنیا سے گئے پانچواں روز ہے اور یہ کیسا رویہ اپنائے ہوئے ہیں میرے ساتھ۔" ماریہ نے بے بسی سے شکوہ کیا۔

آج ماریہ کی والدہ کو اس دارفانی سے کوچ کیے پانچ روز ہو گئے تھے اور وہ سسرال میں موجود تھی۔

شوہر نامدار صاحب پردیس میں تھے کیونکہ ان کا ذریعہ روزگار وہاں موجود تھا۔ ماریہ کو شکیلہ بیگم نے قل کے بعد ہی ساتھ گھر چلنے کو کہہ دیا کہ ان سے گھر کا کام کاج نہیں سنبھالا جاتا تھا اور پھر صبا کو بھی واپس اپنے سسرال جانا تھا۔ سو اسے نا چاہتے ہوئے بھی بہت سے آنسو دل میں چھپائے گھر آنا پڑا۔

"جی اماں! آپ نے بلایا تھا؟"

ماریہ نے اپنی سرخ متورم آنکھیں جھکا کر پوچھا کہ کہیں اماں اسے روتا ہوا نہ دیکھ لیں ورنہ بغیر کسی لگی لپٹی کے کہیں گی۔

"بی بی! تمہاری ماں کوئی پہلی نہیں تھیں، جو اس دنیا سے چلی گئی ہیں۔ گھر پر بھی اب دھیان دو اور ہر وقت رونے سے گھر میں بے برکتی ہوتی ہے۔"

"ہاں وہ آج صبا کی نند کی دعوت رکھی ہے گھر پر۔ تو تم بریانی، مٹن قورمہ، کباب اور ساتھ میٹھے میں رس ملائی بنا لینا۔" اماں بولتی جا رہی تھیں اور ماریہ ہونق سی ان کی شکل تک رہی تھی۔ یکا یک اماں کی نگاہ اس پر پڑی تو کچھ لمحوں کے لیے وہ خاموش ہو گئیں، پھر بولیں۔

"پتا ہے تمہاری والدہ فوت ہوئی ہیں۔ پر دنیا کے کام ایسے تو نہیں رکتے اور صبا کی نند پھر گھومنے چلی جائے گی تو بعد میں کہاں موقع ملے گا اور ویسے بھی صبا نے اصرار کیا تو اس نے ہامی بھر لی۔" اماں نے اپنا دکھڑا رو دیا۔

ماریہ خون کے گھونٹ پی کر چپ چاپ کچن میں آ گئی اور دعوت کی تیاری میں لگ گئی۔

صبا کی نند کی دعوت اچھے ماحول میں ہوئی اور کوئی بدمزگی بھی نہ ہوئی۔ اپنی نند کے جانے کے بعد صبا، ماریہ کے پاس چلی آئی۔

"بھابھی! مریم جاتے ہوئے اتنی باتیں سنا کر گئی ہے۔ کہہ رہی تھی، تمہاری بھابھی کا تو موڈ ہی بگڑا ہوا تھا۔ مجھے تو بڑی سبکی محسوس ہوئی۔ میں نے بتایا تھا کہ ان کی والدہ کی وفات ہوئی ہے، اس لیے وہ پریشان ہیں۔ تو کہنے لگی۔ اب تو ان کی شادی ہو گئی ہے اور شادی کے بعد میکے سے رشتہ کہاں رہ جاتا ہے۔ انہیں کہو، اب یہ ہی ان کا گھر ہے اور وہ اس پر ہی توجہ دیں۔ بہرحال مجھے بہت برا لگا۔ انہیں تھوڑی تو خوش اخلاقی دکھانی چاہیے تھی۔"

صبا بولتی جا رہی تھی اور وہ گم صم سی اسے سن رہی تھی۔ اس سے تو اتنا بھی نہ کہا گیا کہ سارا دن میں طرح طرح کے پکوان بناتی رہی۔ اتنی پریشانی کے باوجود بھی ان سے باتیں کرتی رہی، کیا ابھی بھی میں نے خوش اخلاقی نہیں دکھائی۔ مگر وہ خاموش رہی کیونکہ اگر وہ یہ سب صبا سے کہتی تو یہ بات اماں سے

ہوتی ہوئی فیاض تک پہنچتی اور پھر وہ اس پر خفا ہوتے۔

☆☆☆

دن گزرتے گئے۔ ماریہ کو اپنا دکھ بھولا تو نہیں البتہ کم ضرور ہو گیا۔ ان دنوں اماں پر فالج کا اٹیک ہوا اور ان کی حالت دن بہ دن بگڑتی چلی گئی۔ ماریہ سے جتنا ہو سکتا تھا اس نے ان کی خدمت کی۔ مگر وہ ان سب کو داغ مفارقت دے کر ابدی نیند جا سوئیں۔

سب سے پہلے صبا پہنچی اور پھر فیاض ان کی وفات کے اگلے دن وہاں موجود تھے۔ ماریہ کو بھی گہرا صدمہ تھا۔ بے شک وہ اس کی ماں نہیں تھیں پر ماریہ نے ماں سے بڑھ کر ہی ان کی خدمت کی تھی۔ آخری دنوں میں وہ خود کو اماں کے اور زیادہ قریب سمجھنے لگی تھی۔ گھر میں وہ دونوں ساس بہو ہی ایک دوسرے کا سہارا تھیں۔ اس کی شادی کے فوراً بعد فیاض بیرون ملک چلے گئے تھے اور اب اماں کی وفات پر پورا ایک سال بعد پاکستان آئے تھے۔

جب بھی وہ آ کر اماں کی چارپائی کے پاس بیٹھتی تو اس کی پکار پڑنے لگ جاتی۔ کسی کو پانی چاہیے تھا تو کسی کو بیٹھنے کے لیے جگہ درکار تھی۔ میت کو لے جانے کے بعد پھر سب کو کھانا دینے میں گھن چکر بنی رہی۔ کسی کے پاس نان نہیں تو کسی کے سالن میں بوٹیاں کم اور یہ حال چالیسویں تک رہا۔

دو گھڑی بیٹھتی تو کوئی ادھر سے پکار لیتا تو کوئی اُدھر سے۔ اسے تو فیاض کے ساتھ بھی دو پل سکون سے بیٹھنے کے لیے میسر نہیں آئے۔

☆☆☆

اس رات وہ باورچی خانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اماں کے کمرے سے صبا کی آواز باہر تک آ رہی تھی اور اپنا نام سن کر وہ نا چاہتے ہوئے بھی اس کی باتیں سننے لگی۔

"بھیا! آپ نے دیکھا نہیں بھابی کو۔ اماں کی میت پر بھی دو گھڑی نہیں بیٹھیں۔ جب اپنی ماں مری تھی تو اس کے سرہانے سے اٹھ ہی نہیں رہی تھیں اور گھر بھی آنے کو تیار نہیں تھیں۔ دو ہفتے گھر میں کوئی کام تک نہ کیا۔ اماں بے چاری ہی کرتی رہیں۔ اور اب تو انہیں اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ساس کی میت کو ہی رو لیتیں۔ جنہوں نے بھابی کو کلیجے سے لگا کر رکھا۔ سارا سارا دن کچن میں رہتی ہیں۔ باہر جھانک کر بھی نہیں دیکھتیں کہ افسوس کرنے کون آیا ہے۔" وہ بول رہی تھی۔

اب بھی ماریہ کہنا چاہتی تھی کہ بہو تو ہمیشہ بری ہوتی ہے اور ساس کے مرنے پر جشن مناتی ہے تو پھر تم بیٹی ہونے کے باوجود اماں کے فوت ہونے کے آٹھویں روز بن ٹھن کر سہیلی کی شادی پر کیوں گئی تھیں۔ میں تو بہو ہو کر بری ہوں پر تم تو بیٹی تھیں، تم ہی کچھ خیال کر لیتیں۔ مگر آج بھی اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھ کر یہ سب کہہ پاتی۔

"آپ ابھی سے کہاں جا رہی ہیں.... مس مراد؟" دروازہ کھلتے دیکھ کے ایڈم نے ٹون بدل لی۔ لہجہ رسمی ہوگیا۔ تالیہ نے مڑ کے دیکھا۔ صوفی چند کاغذات لیے اندر آرہی تھی۔ تالیہ نے واپس ایڈم کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں ابرو اٹھا کے بنا آواز کے کہا (مس مراد؟ ہوں؟)

"آپ ابھی تو آئی تھیں؟" ایڈم نے اس کے تاثرات نظرانداز کر کے اسی لہجے میں پوچھا۔ صوفی بھی ساتھ آ کھڑی ہوئی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے سری پردھانہ جانا ہے۔ پردھان منتری سے ملنے۔"

"پردھان منتری کے پاس روز روز کی ملاقات کا وقت ہے؟" ایڈم نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ "مجھے تو انٹرویو کے لیے کب سے وقت نہیں دیا۔"

"وقت نہیں ہے۔ لیکن ہر پردھان منتری کو لنچ بریک ملتی ہے، ایڈم صاحب۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "آپ تب تک عبرہ کے فنانشلز میں کوئی بڑی رقم

چھتیسویں قسط
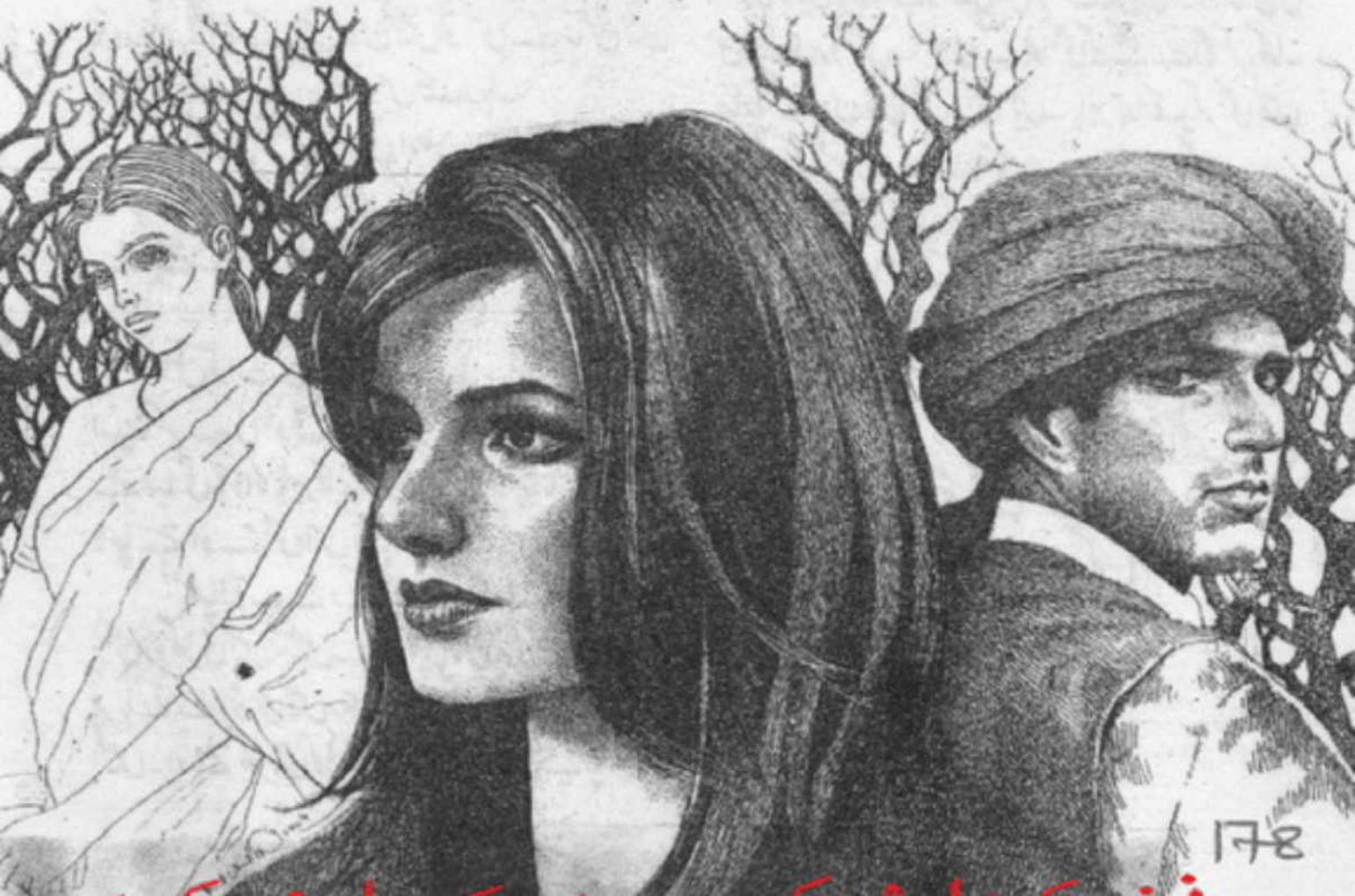
چیک کریں۔" وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔ دروازہ بند ہوا تو صوفی نے اچنبھے سے ایڈم کو دیکھا۔

"آپ لوگ بڑی رقم چیک کر رہے ہیں؟ میں سمجھی غیر معمولی رقم چیک کر رہے ہیں۔" وہ لہجے کو سرسری بنا کے بولی اور خالی کپ اٹھا لیے۔

"غیر معمولی رقم بڑی ہی ہوتی ہے۔" ایڈم نے صفحے پلٹتے ہوئے اسے ٹوکا۔

"میرے لیے؟ ہاں۔ میں تھوڑی سی تنخواہ پہ گزارا کرتی ہوں کیونکہ میرا باس تو ظالم ہے اور کنجوس بھی۔" آنکھیں گھما کے اپنے باس کو دیکھا جس نے اس بات کو ان سنا کر دیا تھا۔ "لیکن عصرہ تو ایک سیاسی بیوی تھیں۔ ڈیزائنر پہنتی تھیں۔ ڈیزائنر خریدتی تھیں۔ ان کی تو ہر ٹرانزیکشن عام انسان سے زیادہ ہوتی ہوگی۔ آپ کو غیر معمولی ڈھونڈنی ہے تو چھوٹی رقم ڈھونڈیں۔ اتنی چھوٹی رقم جو عصرہ کی طبیعت کے برخلاف ہو۔"

"واہ۔" ایڈم نے چونک کے اسے دیکھا۔ "تم کافی سمجھ دار ہوگئی ہو صوفی۔"

وہ ٹرے میں فالتو اشیا ڈالتے ہوئے خفگی سے بولی۔

"اگر آپ مجھے میٹنگ میں شامل کر لیتے..... (کان میں لگے آلے کی طرف اشارہ کیا جو ایڈم نے اپنی طرف سے بند کر رکھا تھا) تو میں پہلے ہی بتا دیتی۔"

مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ تیزی سے فائل کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ اس کی سوچ کو ایک نیا زاویہ ملا تھا۔

☆☆☆

سری پردھانہ کی کھڑکیوں پہ بارش کے قطرے آج بھی جمے تھے۔ وہ جب پتراجایا پہنچی تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ پردھان منتری کا اسٹاف اب اس کو پہچاننے لگا تھا۔ پچھلی میٹنگ کے بعد فاتح نے اس کا سری پردھانہ کا انٹری پاس جاری کروا دیا تھا جس کے باعث اندر آنے میں آسانی تھی۔ اس کو داخلی فصیل سے ویٹنگ روم میں بٹھانے تک سب اس کو خاموش نظروں سے دیکھتے آئے تھے۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے لیکن تالیہ مراد لوگوں کی آرا کے غم سے خود کو آزاد کرنے کی کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔

مکمل آزادی تو آج تک کسی انسان کو نہیں ملی۔

جس وقت وہ فاتح کے آفس میں داخل ہوئی ایک نوجوان شیلف میں ایک سیاہ کور والی فائل رکھ رہا تھا۔ فاتح نے ایک نظر فائلز کے اس ڈھیر کو دیکھا جو وہاں جمع ہوتا جا رہا تھا... اور پھر اندر داخل ہوتی تالیہ کو..... پھر وہ مسکرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی توجہ فائلز سے ہٹ گئی۔

نوجوان نے یاسیت سے اپنے پردھان منتری کی بکھرتی توجہ کو دیکھا اور پھر نووارد مہمان لڑکی کو۔ پھر سر جھٹک کے اداسی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"آؤ۔ بیٹھو۔ تم نے لنچ کیا؟" وہ سیٹ پہ واپس بیٹھتے ہوئے انٹرکام اٹھانے لگا۔

"ضرورت نہیں ہے۔ ناشتہ دیر سے کیا تھا۔ آپ نے لنچ کر لیا؟" جامنی فراک والی لڑکی کرسی پہ بیٹھی اور پرس میز پہ رکھا۔ سفید ہیٹ ترچھا کر کے سر پہ جما رکھا تھا۔ انداز یوں تھا گویا اس آفس میں روز کا آنا جانا ہو۔

"ٹھہر کے کروں گا۔" فاتح نے مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے انٹرکام پہ چائے کا آرڈر دیا۔ سفید شرٹ اور گرے ٹائی میں ملبوس، جیل سے بال دائیں جانب کیے... وہ آج بھی ویسا ہی لگ رہا تھا جیسا ہمیشہ لگا کرتا تھا۔ کوٹ پیچھے اسٹینڈ پہ لٹکا تھا اور سفید شرٹ کے کف پہ لگے سلور کف لنکس چمک رہے تھے۔ تالیہ نے غور سے اس کے تازہ دم مسکراتے چہرے کو دیکھا۔ وہ تالیہ کے ساتھ بہت اچھی طرح سے پیش آیا تھا۔ رویہ بھی دوستانہ تھا۔ لیکن کیا وان فاتح ویسا ہی تھا؟

"تمہارے کیس کی تیاری کیسی جا رہی ہے؟" انٹرکام رکھ کے وہ ہاتھ باہم پھنسائے آگے کو ہوا اور توجہ سے پوچھنے لگا۔

تالیہ نے بے فکری سے کندھے اچکائے۔ ''میں بے قصور ہوں۔ میں یہ ثابت کردوں گی۔''

''تم ٹھیک ہونا؟'' وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور دنیا اس میز کے اطراف سے ختم ہو چکی تھی۔

وان فاتح کے ساتھ وہ ہوتی تھی تو وقت یوں ہی تھم جاتا تھا۔ سوچوں کے سارے شور خاموش ہو جاتے تھے۔ میز کے گرد جیسے دائرہ سا کھنچ گیا تھا۔ روشنی کا دائرہ۔ اس دائرے کے پار سب دھواں بن کے فضا میں تحلیل ہو چکا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں' فاتح۔''

''اور ایڈم بن محمد..... وہ تمہاری مدد کر رہا ہے؟''

''ہوں۔ اس کی یادداشت چلی گئی تھی۔ آپ کو معلوم ہوگا۔'' تالیہ نے پرکھنے والے انداز میں پوچھا۔ فاتح مسکرایا۔

''سیریسلی؟'' ابرو اچکائے۔ ان کے دائرے کی روشنی تیز ہو رہی تھی۔ ''تم نے اس کہانی پہ یقین کر لیا؟'' وہ ہلکا سا ہنس دی۔ ''آپ نے بھی نہیں کیا؟''

''نہیں۔ وہ محض مجھ سے فاصلہ رکھنا چاہتا تھا۔ سو میرا اخلاقی فرض تھا کہ اس کی خواہش کا احترام کروں۔ جب کسی کی زندگی میں آپ کی جگہ نہ ہو تو اس کو مجبور نہیں کرنا چاہیے۔''

تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا ملال چمکا۔

''کیسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی زندگی میں آپ کی جگہ ہے یا نہیں؟''

ان کے دائرے کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ کوئی تاریک سایہ سا تھا جو اس روشنی کو نگل رہا تھا۔

''معلوم نہیں کیا جاتا۔ محسوس کیا جاتا ہے۔''

''اور جب محسوس ہو جائے کہ اس کی زندگی میں اپنی جگہ نہیں رہی تو کیا کرنا چاہیے؟''

''گریس فل ایگزٹ۔'' وان فاتح نے مسکرا کے ابرو اچکائے۔ وہ مسکرا بھی نہیں سکی۔ بس اس کو دیکھے گئی۔

وہ آسیب جیسا سایہ دائرے کے اوپر چھانے لگا۔ روشنی جہاں سے بھی آ رہی تھی' اس کا راستہ رک گیا۔ اسے لگا ان دونوں کے درمیان سرمئی دھواں سا اٹھنے لگا ہو اور سارا منظر نامہ دھندلا گیا ہو۔

تالیہ نے پلکیں جھپک کے غور سے اسے دیکھنا چاہا لیکن دھواں گاڑھا ہو رہا تھا۔ وہ فاتح کو ٹھیک سے پڑھ نہیں پا رہی۔

''کیا تم واقعی ٹھیک ہو؟'' وہ فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔ تالیہ کی نظر اس کے عقب میں پھسلی۔ فاتح کے عقب میں بنی اونچی کھڑکی کے بلائنڈز اٹھے ہوئے تھے۔ پیچھے سبز لان دکھائی دے رہا تھا۔

لان کے وسط میں ایک سفید ہرن کھڑا تھا۔ اتنا کورا سفید کہ ذرا سی گرد بھی اس کو میلا کر سکتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سبز آنکھیں تالیہ پہ جمی تھیں۔ وہ آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کی تحریر پڑھنا مشکل تھا۔

''تالیہ؟'' فاتح کی آواز پہ وہ چونکی۔ وہ منتظر سا اسے دیکھ رہا تھا۔

''میڈیا..... لوگ..... حتیٰ کہ آپ کے اسٹافرز

تک.....سب میرے خلاف باتیں کر رہے ہیں۔ میں ٹھیک کیسے ہو سکتی ہوں؟" اس کے انداز میں تلخی تھی۔ چند لمحے قبل کی شگفتگی عنقا ہو چکی تھی۔

"آج سے کئی برس پہلے ہم امریکہ میں ایک قصہ سنا کرتے تھے۔ اس عورت کا قصہ جس نے مک ڈونلڈز کو sue کیا تھا۔"

تالیہ کو اس قصے میں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ متلاشی نظروں سے کھڑکی کو دیکھنے لگی۔ سفید ہرن اب وہاں نہیں تھا۔

"یاد ہے ایک زمانے میں امریکہ میں ایک عورت نے مک ڈونلڈز کو اس وجہ سے sue (مقدمہ) کیا تھا کہ وہ کافی کپ کے اوپر یہ کیوں نہیں لکھتے کہ کافی گرم ہے۔ اور عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ دیا۔ مک ڈونلڈز نے دو ملین کا ہرجانہ ادا کیا۔ صرف اس لیے کہ انہوں نے کپ پہ "گرم" نہیں لکھا تھا۔"

"میں نے یہ قصہ سن رکھا ہے۔" اس کی نظریں سبزہ زار میں اس ہرن کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر وہ کہیں نہیں تھا۔

"تقریباً سب نے سن رکھا ہے۔ ایک احمقانہ مقدمہ۔ یہ تو کامن سینس کی بات ہے کہ کافی گرم ہوتی ہے۔ لکھنے کی کیا تک بنتی ہے؟ تعجب کی بات کہ وہ عورت مقدمہ جیت بھی گئی۔ اس زمانے میں امریکی میڈیا نے اس عورت کو بہت لعن طعن کیا تھا۔ اور لوگوں نے بھی کیونکہ یہ وہ کہانی تھی جو میڈیا نے انہیں سنائی۔ اپنی مرضی کا سچ۔ جانتی ہو اس عورت کی اصل کہانی کیا تھی؟"

تالیہ نے واپس فاتح کو دیکھا۔ ان کے دائرے کی روشنی مدھم ہو چکی تھی لیکن ابھی بجھی نہیں تھی۔ اس نے اپنی توجہ فاتح کے قصے کی طرف مبذول کرنی چاہی۔

"سچ یہ تھا کہ وہ ایک ستر سال کی بوڑھی عورت تھی جس نے ڈرائیو تھرو سے مک ڈونلڈز کی کافی لی تھی۔ اس کے بھانجے نے وہ کافی اسے تھمائی تو بوڑھی عورت نے اسے اپنی گود میں رکھا۔ مگر کافی چھلک گئی اور اس کی ٹانگوں کو بری طرح جلا گئی۔ وجہ؟ کیونکہ مک ڈونلڈز کی کافی ..... فارن ہائیٹ 180-190°F جتنی گرم ہوتی تھی۔ کسی بھی دوسری کافی شاپ سے کئی گنا ابلتی ہوئی۔ مک ڈونلڈز کو اس وقت تک سات سو سے زیادہ شکایات آ چکی تھیں کہ آپ کی کافی بہت گرم ہوتی ہے۔ لیکن مک ڈونلڈز نے کان نہ دھرے۔"

وہ اداس مسکراہٹ کے ساتھ فاتح کو بولتے سنے گئی۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا اس کے قصے سنے ہوئے؟ چھ دن؟ یا چھ سال؟

"وہ عورت اتنی بری طرح جلی کہ بستر مرگ پہ آ گئی۔ اولاد کا روزگار ختم ہو گیا۔ اسے وہ دو ملین ڈالرز آخر میں ملے بھی نہیں۔ چند ہزار ڈالرز دے کر مک ڈونلڈز نے جان چھڑا لی۔ اور کیس ختم ہو گیا۔ لیکن capitalist میڈیا نے مجھے اور تمہیں وہ کہانی سنائی جو ان کے سرمایہ دارانہ نظام کی منشا کے مطابق تھی۔ میڈیا کبھی نہیں بدلتا۔ میڈیا تمہارے اور میرے ساتھ آج بھی وہی کر رہا ہے جو اس وقت کافی سے جلنے والی بوڑھی عورت کے ساتھ کر رہا تھا۔"

"میڈیا کبھی میرا سچ نہیں دکھائے گا۔ مجھے اپنا سچ خود دکھانا ہو گا۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔ "لیکن.... آپ کے ساتھ میڈیا کیا کر رہا ہے؟" نا سمجھی سے پوچھا۔

فاتح نے گہری سانس لی اور پیچھے کو ہوا۔ "ٹی وی کھول لو۔ سوشل میڈیا دیکھ لو۔ ہر جگہ وان فاتح تنقید کی زد میں ہوتا ہے۔" اس نے مسکرا کے شانے اچکائے۔

"آپ اپنی جاب سے خوش نہیں ہیں؟" اس نے اچنبھے سے سوال پوچھا۔ "یہی تو آپ کا خواب تھا۔ یہی تو آپ چاہتے تھے فاتح۔ پھر کیوں؟"

"اس کیوں کا سوال مجھے بھی ان چھ سالوں میں نہیں ملا۔" فاتح نے پیچھے کو ٹیک لگائے اطراف میں اپنے شاہانہ آفس کے در و دیوار کو دیکھا۔ "یہ ویسا نہیں

ہے جیسا میں نے تصور کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا' تالیہ.... میرے پاس میرے ملک کی باگ ڈور ہوگی تو میں اس ملک کی بہتری کے فیصلے کروں گا۔ لیکن جب سے میں اس کرسی پہ آیا ہوں.... مجھے اس کرسی کو بچانے کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ اگر یہ کرسی چلی گئی تو میں کچھ نہیں کر پاؤں گا اس لیے پہلے کرسی۔ پھر کچھ اور۔"

"اور آپ پچھلے کئی سال سے اس کرسی کو بچا رہے ہیں۔ ہر طرف سے۔ ہر ایک کے ہاتھ سے۔" اس نے سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔ اس کا دھیان اپنے دائرے کی روشنی سے ہٹ چکا تھا۔

"لیکن میں نے ملک کے حالات دیکھے ہیں۔ آپ نے اچھے فیصلے بھی کیے ہیں' فاتح۔ آپ نے بہت اچھے قوانین بنائے ہیں۔"

"مگر یہ ویسا نہیں ہے جیسا میں چاہتا تھا۔ میں اس سے بہت زیادہ کرنا چاہتا تھا۔"

"مگر یہ لوگ آپ کو کچھ کرنے نہیں دے رہے۔ آپ کے دشمن بڑھتے جا رہے ہیں۔" وہ اس کا چہرہ پڑھ رہی تھی۔ "کبھی آپ نے سوچا کہ آپ کے دشمن آپ کے قریبی لوگوں کو بھی غداری کرنے پہ مجبور کر سکتے ہیں؟"

دائرہ اب بجھنے کے قریب تھا۔ روشنی کم ہوئی تو پردھان منتری کا اجنبی آفس نمایاں ہونے لگا۔ فاتح نے اس کی بات پہ چونک کے اسے دیکھا۔

"کھل کے کہو۔ کیا کہنا چاہ رہی ہو۔"

"یونہی کہہ رہی ہوں۔ مجھے آپ کے گرد کچھ ایسے لوگ نظر آ رہے ہیں جو آپ سے مخلص نہیں لگتے۔"

وہ اس کی آنکھوں سے نظریں ہٹائے بغیر کہہ رہی تھی۔

"اشعر میرے ساتھ کئی برس سے ہے۔ میں جانتا ہوں' اس نے تمہیں گرفتار کروایا ہے لیکن عصرہ اس کی بہن تھی....."

تالیہ نے پہلو بدلا۔ چھ سال کے فاصلے نے درمیان سے اعتماد کی وہ فضا غائب کر دی تھی جو سب کچھ کہنے دیتی تھی۔ کیا اب وہ فاتح سے کھل کے بات کر سکتی تھی؟

"میں اشعر کی بات نہیں کر رہی تھی۔ میرا مطلب تھا... آپ کے گھر میں آنے جانے والے لوگ..."

"میرے گھر میں چند ملازم ہیں جن کی سیکیورٹی کلیئرنس کے بعد انہیں رکھا گیا ہے۔ باقی میرے بچے ہیں' ییشا ہے اور اشعر ہے۔" وہ حیران ہوا تھا۔

"ییشا؟ وہ جولیانہ کی ٹیوٹر؟ وہ آپ کے گھر میں رہتی ہے؟" وہ چونک گئی۔

"ہاں۔ اس کا کچھ ذاتی مسئلہ چل رہا تھا تو جولیانہ اور میں نے اسے پیشکش کی کہ وہ کچھ دن ہمارے پاس قیام کر لے۔ کوئی بات ہے کیا؟"

"نہیں۔ ایسے ہی کہہ رہی تھی۔" اس نے سر جھٹک کے گہری سانس لی۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ فاتح اس کا یقین نہیں کرے گا، وہ جانتی تھی۔ "میں چلتی ہوں۔ آپ کی بریک ختم ہونے والی ہے۔"

ایک نظر اس نے دونوں کے درمیان حائل میز کو دیکھا۔

برسوں پہلے وہ اس کے ڈائننگ ہال میں ایسی ہی میز کے گرد بیٹھی تھی۔ اور اس سے پوچھا جا رہا تھا کہ کیا گھائل غزال کی پینٹنگ اصلی ہے؟ اور اس نے مسکرا کے کہا تھا کہ ہاں' وہ اصلی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کوئی اس کا یقین نہیں کرے گا۔

پھر یہ منظر کتنی دفعہ دہرایا گیا تھا۔ تالیہ مراد جھوٹی اور فریب کار عورت تھی۔ وہ فاتح سے دل کی بات نہیں کہہ سکتی کیونکہ وہ اس کا یقین نہیں کرے گا۔ کتنی ہی دفعہ فاتح نے اس کا یقین کیا تھا۔ مگر اب دونوں کے درمیان کئی سال کا فاصلہ بھی حائل تھا۔ اب فاتح کے نزدیک اس کی بات کیسے معتبر ہوگی؟

"بس؟" فاتح جیسے مایوس ہوا۔ اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ "ابھی میری بریک میں کچھ وقت ہے۔"

اور تالیہ نے سوچا کہ سارے کھیل وقت کے ہی

تو تھے۔

اسے وقت ضائع کیے بغیر مڑنا تھا اور ہمیشہ کی طرح کچھ کہے بنا وہاں سے نکل جانا تھا۔

جیسے اس نے انہیں پہلی دفعہ نہیں بتایا تھا کہ گھائل غزال کی پینٹنگ نقلی ہے۔

جیسے اس نے فاتح کو نہیں بتایا تھا کہ اس کی فائل عصرہ نے چرائی تھی۔

جیسے اس نے یادداشت کھو دینے والے فاتح کو نہیں بتایا تھا کہ وہ دونوں کبھی وقت کے سفر پہ ساتھ گئے تھے۔

جیسے وہ فاتح کو کنویں پہ چھوڑ کے ایڈم کے ساتھ قدیم ملاکہ کے سفر پہ نکل گئی تھی۔

جیسے وہ ہمیشہ اپنی بات اسے نہیں کہہ پاتی تھی۔ کیونکہ دل کہتا تھا' وہ بھی سچی قرار نہیں دی جائے گی۔

''میں آپ کا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتی۔''

اس نے سر کو خم دے کر سلام کیا۔

''تمہیں کیوں لگا کہ تمہارے لیے میرے پاس وقت نہیں ہوگا؟''

وہ تعجب سے بولا تھا۔ تالیہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

وہ پردھان منتری تھا۔ وہ اس کے لیے وقت نکال رہا تھا۔ پھر اس کی زندگی میں تالیہ کی جگہ کیسے نہیں تھی؟ وہ اس دن سے فاتح کو الزام دیتی آرہی تھی کہ وہ آگے بڑھ چکا ہے۔ وہ بدل چکا ہے۔

کتنا عجیب احساس ہوتا ہے جب انسان پہ انکشاف ہو کہ اس ساری ایکویشن میں وہ خود ہی غلط جگہ کھڑا ہے؟ اس کا چیزوں کو دیکھنے کا زاویہ ہی غلط ہے؟ فاتح بن رامزل آگے نہیں بڑھا تھا۔ تالیہ اس سے پیچھے کہیں رک گئی تھی۔ وہ تالیہ کے اپنی طرف بڑھنے کا انتظار کر رہا تھا۔

''کیا اب بھی آپ کی زندگی میں میری جگہ ہے؟'' اس نے خود کو حیرت اور بے یقینی سے کہتے سنا۔

''اور تمہیں کیوں لگا کہ میری زندگی میں تمہاری جگہ ختم ہو چکی ہوگی؟''

وہ اطمینان سے اپنی کرسی پہ براجمان گردن اٹھائے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

''میں سمجھی...'' اس کے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کے ادا ہونے لگے... ''آپ کے زخم بھر گئے ہوں گے۔ اور آپ آگے بڑھ چکے ہوں گے۔''

''کچھ لوگوں کو unlove کرنا ناممکن ہوتا ہے' تالیہ۔ ان کی جگہ زندگی سے کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔'' وہ نرمی سے مسکرایا لیکن وہ اسی بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ (کیا اس نے کہا unlove؟ کیا اس نے واقعی یہ لفظ بولا تھا؟)

''میں چاہتا ہوں کہ تم کل رات میری فیملی کے ساتھ ڈنر کرو۔ میرے گھر پہ۔ میں تمہیں اپنے بچوں سے ملوانا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی دکھانا چاہتا ہوں کہ میرے گھر میں تمہاری جگہ ہمیشہ رہے گی۔''

اس کے الفاظ نے تالیہ مراد کو لاجواب کر دیا تھا۔ اس نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلائی۔ یہ اقرار تھا۔ یہ بہت تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''ہوں؟'' فاتح نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

''کیا سری پردھانہ میں کوئی سفید ہرن ہے؟''

''سفید ہرن؟'' وہ حیران ہوا۔ ''میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''مگر میں نے دیکھا ہے۔'' وہ دل میں خود سے بولی۔

جب وہ باہر نکلی تو اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

اگر فاتح کی زندگی میں اس کی جگہ تھی تو وہ اس رشتے سے ناامید کیوں تھی؟ وہ تالیہ مراد تھی۔ وہ کبھی ہمت نہیں ہارا کرتی تھی۔ اس کی ایکویشن میں کیا غلط تھا؟

سری پردھانہ کی راہداری میں آگے بڑھتے ہوئے ایک عجیب سے سوال نے اندر سر اٹھایا۔

کیا تالیہ مراد کی زندگی میں وان فاتح کی جگہ

تھی؟

اس سوال کا جواب اسے اپنے اندر ڈھونڈنا تھا لیکن اس سے پہلے ایک کام کرنا تھا۔ اسے ملا کہ جانا تھا۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھنا تھا کہ کیا وہاں واقعی کوئی خط اس کا منتظر تھا؟ وہ اب اپنے خواب کے پورا ہونے کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اس خواب کی تعبیر خود ڈھونڈنی تھی۔

تالیہ مراد کا ماضی ایک دفعہ پھر اسے پکار رہا تھا۔

☆☆☆

دوپہر اپنے جوبن پہ تھی لیکن اس شاپنگ مال کے اندر چمکتی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ باہر کے موسم کا کچھ علم نہ ہوتا تھا۔ مال کے اندر رنگوں اور روشنیوں کی ایک نئی دنیا آباد تھی۔ لوگ سارے مہینے کی محنت ان چمکتی راہداریوں میں لٹانے آئے کھڑے تھے۔

ایسی ہی ایک مرمریں راہداری میں ایڈم کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی چھوٹے بالوں والی اسسٹنٹ' کندھے سے اسٹریپ والا بیگ لٹکائے' ہاتھ میں دو فونز پکڑے کھڑی تھی۔ وہ دونوں ایک شاپ کے سامنے موجود تھے اور ایڈم رک کے موبائل پہ کچھ دیکھ رہا تھا۔

''باس؟'' منتظر سی صوفی نے پکارا۔

''برانڈڈ جیولری اسٹور ہونے کا فائدہ یہ ہے' صوفی.... کہ چھ سال بعد بھی آپ کی دکان اسی جگہ موجود ہوتی ہے۔'' اس نے مسکرا کے سامنے والی شاپ کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ کے خیال میں آپ درست سمت میں جا رہے ہیں' باس؟'' صوفی نے بغور اسے دیکھا۔

''آف کورس۔ چھ سال پہلے.... اپنی موت سے کچھ دن قبل.... عصرہ محمود نے اپنے کارڈ سے ایک معمولی سی ادائیگی اس اسٹور پہ کی تھی۔ اتنی کم رقم میں اس اسٹور کی معمولی سی انگوٹھی بھی نہیں آ سکتی۔ اگر ہم اس رقم کا پتا لگا لیں تو....''

''میں تالیہ مراد کی بات کر رہی ہوں۔ آپ کبھی کسی کے لیے پی کیپ پہن کے شاپنگ مال میں تفتیش کرنے نہیں آئے۔''

وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ پی کیپ اور گلاسز پہنے' وہ جینز اور شرٹ میں ملبوس' عام لوگوں کے درمیان پہچانا نہیں جا رہا تھا۔

''تالیہ کا کیس اس وقت سب سے زیادہ بکنے والی چیز ہے۔'' ایڈم نے سرسری انداز میں کندھے اچکائے۔ ''اور تمہیں جاب پہ رکھنے سے پہلے ایک زمانے میں' میں ایسی کئی تحقیقات کر چکا ہوں۔''

''مگر اب تو نہیں کرتے نا۔ اتنے سالوں سے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اب اس کے لیے کر رہے ہیں۔ کیا تالیہ مراد اتنا وقت اور توانائی صَرف کیے جانے کی حق دار ہے؟'' وہ جتانے والے انداز میں کہہ کے آگے بڑھ گئی۔ ایڈم نے بھنویں بھینچ کے اسے دیکھا۔ اور ہونہہ کہہ کے سر جھٹکا۔

''جی ہاں۔ مسز عصرہ بنت محمود ہمارے اسٹور کی بہت پرانی کسٹمر تھیں۔''

وہ کچھ دیر بعد اس قیمتی نگینوں سے چمکتے اسٹور کے اندر رکھے مخملیں صوفوں پہ براجمان تھے اور سامنے بیٹھا منیجر بتا رہا تھا۔ صوفی آگے ہو کے بیٹھی ایک ایک بات نوٹ کیے جا رہی تھی۔ ایڈم البتہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ چھت کی تیز سفید روشنیاں اس کے سنجیدہ چہرے پہ پڑ رہی تھیں۔ وہ صوفی کی بات پہ قدرے ڈسٹرب ہو گیا تھا یہ صاف ظاہر تھا۔

''وہ زیورات کی شوقین خاتون تھیں۔ اکثر ہمارے ہاں سے زیورات خریدا کرتی تھیں۔ میں خود انہیں ڈیل کرتا تھا۔'' منیجر بات کرتے کرتے رکا۔ ایک سوٹ میں ملبوس اسٹور کا ملازم اس کے پاس آیا' اور ایک پرچہ پیپر اس کی طرف بڑھایا۔

''سر.... یہ وہ بل ہے جو ایڈم صاحب نے مانگا تھا۔'' وہ جانے کے بجائے منیجر کے صوفے کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔

منیجر نے عینک لگا کے کاغذ کو پڑھا' پھر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ رہی اس رقم کی تفصیل جو انہوں نے آخری

دفعہ یہاں ادا کی تھی۔"

ایڈم نے تیزی سے کاغذ پکڑا اور نظریں سطور پہ دوڑائیں۔ وہ ایک اِن وائس کی کاپی تھی۔ اس کے مطابق عصرہ محمود نے وہ معمولی رقم ایک نیکلیس کے پتھر ہٹا کے اس کو تولنے کے لیے ادا کی تھی۔ یہ ایک ڈائمنڈ نیکلیس تھا جس کے زمرد ہٹا کے اس کی قیمت لگائی گئی تھی۔

"کیا آپ کو یاد ہے وہ اس سیٹ کی قیمت کیوں لگوانا چاہتی تھیں؟" ایڈم نے چہرہ اٹھا کے منیجر کو دیکھا۔ کن اکھیوں سے اس نے دیکھا کہ وہ ملازم لڑکا وہیں کھڑا تھا۔ وہ مسلسل ایڈم کو دیکھ رہا تھا۔

"انہوں نے بتایا نہیں تھا لیکن لوگ قیمت صرف ایک وجہ سے لگواتے ہیں۔"

"زیورات بیچنے کے لیے۔" صوفی تیزی سے بولی۔

"جی بالکل۔" منیجر کے پیچھے کھڑے لڑکے نے پرجوش انداز میں تائید کی۔ وہ پھر سے ایڈم کو دیکھنے لگا۔

"کیا آپ کے پاس اس روز کی سی سی ٹی وی ریکارڈنگ ہوگی؟"

"سی سی ٹی وی زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک کی رکھی جاتی ہے۔ چھ سال بہت لمبا عرصہ ہے۔ سوری۔"

"مجھے اندازہ تھا۔ خیر... اس ان وائس میں ان تینوں ڈائمنڈز کا سرٹیفکیٹ نمبر بھی لکھا ہے جو اس سیٹ میں جڑے تھے۔" ایڈم بل کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا آپ مجھے اس ہیرے کا ریکارڈ نکال کے دے سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے مسز عصرہ نے وہ سیٹ کسی کو بیچا تھا۔ اس شخص نے آگے بیچا ہوگا۔ بغیر سرٹیفکیٹ کے وہ اسے آگے نہیں بیچ سکتا۔"

"جی۔ فنگر پرنٹ کی طرح ہر ہیرے کا سرٹیفکیٹ نمبر ہوتا ہے جو لیزر کی مدد سے اس ہیرے پہ لکھا گیا ہوتا ہے اور عام آدمی کو نظر نہیں آتا۔ میں چیک کر کے بتاتا ہوں۔" منیجر ساتھ رکھی میز کی طرف گھوما اور کی بورڈ پہ تیز تیز ٹائپ کرنے لگا۔ "وہ ہیرا دنیا میں جہاں بھی ہوگا' مل جائے گا۔ میں متعلقہ اداروں کو ای میل کر رہا ہوں۔ جیسے ہی جواب آئے گا' میں آپ کو مطلع کر دوں گا۔ ہمارے ریکارڈ میں اس سیٹ کی تصویر بھی ہے۔ وہ بھی میں آپ کو میل کر رہا ہوں۔ ہمارا ہر سیٹ یونیک ہوتا ہے۔ ایک ڈیزائن صرف ایک دفعہ بنتا ہے۔" منیجر تیزی سے انگلیاں چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ نوجوان ہنوز وہیں کھڑا تھا۔

"اس دن مسز عصرہ کو جس سیلز منیجر نے ڈیل کیا تھا....." اس نے پوچھتے ہوئے بل پر لکھا نام پڑھا۔ "نور جاز لان... کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

"جی سر۔ وہ میں ہی تھا۔" منیجر نہایت ذمہ داری سے بتا رہا تھا۔ "اور مجھے یاد ہے وہ دن۔ وہ اپنا ڈائمنڈ سیٹ لے کر آئی تھیں اور اس کی قیمت لگوانا چاہتی تھیں۔"

"کوئی ایسی بات... کوئی چھوٹی سی بات جو آپ کو اس دن سے متعلق یاد ہو؟"

سامنے کھڑے لڑکے کا دیکھنا اسے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔ مگر وہ اسے نظر انداز کر کے منیجر سے بات کرتا رہا۔

"وہ اس دن خاموش خاموش سی تھیں۔" منیجر سوچ کے بتانے لگا۔ "کچھ خاص نہیں بولی تھیں۔ انہوں نے سیٹ کی قیمت لگوائی اور پھر وہ دونوں چلے گئے۔"

"دونوں؟"

"ایک آدمی تھا ان کے ساتھ۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا میں نے اسے۔"

"اس کا کوئی نام.... کوئی شناخت... کچھ یاد ہے آپ کو؟" ایڈم تیزی سے بولا۔

"نہیں سر.... اتنی پرانی بات ہو چکی ہے۔ مجھے تو اس کی شکل بھی ٹھیک سے نہیں یاد۔" منیجر بے چارگی سے بولا۔

"خیر۔ جہاں اس نے ہیرے بیچے ہیں وہاں سے اس کا ریکارڈ نکل آئے گا۔" ایڈم نے خود کو تسلی

دی۔ صوفی نے گہری سانس لے کر اسے افسوس سے دیکھا اور نوٹ پیڈ پہ کچھ لکھنے لگی۔ وہ بھی سر جھکا کے اپنے موبائل پہ میسج دیکھنے لگا۔

منیجر کو ای میل موصول ہوئی تو اس نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔ "او کے... اس ڈائمنڈ سیٹ کا پتا چل گیا ہے۔"

"گڈ... وہ اب کس کی ملکیت ہے؟" ایڈم تیزی سے سیدھا ہو کے بیٹھا۔

"وہ سسٹم میں ابھی تک عصرہ محمود کے نام پہ رجسٹرڈ ہے۔" وہ اسکرین کو دیکھ کے بتانے لگا۔

ایک دفعہ پھر بند گلی۔ ایڈم نے کوفت سے آنکھیں بند کیں۔

"کیا مطلب؟" صوفی نے تعجب سے ایڈم کو دیکھا۔ "وہ سیٹ عصرہ نے بطور اجرت اس شخص کو دیا ہوگا۔ وہ چھ سال سے اس سیٹ کو سنبھالے کیوں پھر رہا ہے؟"

"اونہوں۔ وہ اسے بیچ چکا ہوگا۔ بلیک مارکیٹ میں ذرا کم قیمت پہ۔ یا اس نے ہیروں کے لیزر نمبرز مٹوا دیے ہوں گے۔ ان کرمنلز کے پاس اب یہ ٹیکنالوجی موجود ہے۔" ایڈم نے کنپٹی چھوئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے کتنی امید ہو گئی تھی۔ اسے لگا یہاں سے کوئی سرا اس کے ہاتھ آئے گا اور وہ تالیہ کو بچا لے گا۔ لیکن.... سارے کھرے وقت کی دھول میں مٹ چکے تھے۔

"ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی مدد نہیں کر سکے۔" وہ اٹھا تو منیجر اور صوفی بھی ساتھ ہی کھڑے ہوئے۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ نے اپنا وقت ہمیں دیا۔ یہ بہت ہے۔" وہ جبراً مسکرایا۔ وہ نوجوان اب دانت نکوستا ایڈم کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ کوئی جیولری دیکھنا پسند نہیں کریں گے؟" منیجر نے مسکرا کے قریبی شوکیس کی طرف اشارہ کیا۔

ایڈم نے ایک نظر سامنے قطار در قطار دور تک پھیلے شوکیسز پہ ڈالی اور پھر سنجیدگی سے منیجر کو دیکھا۔

"نہیں۔ تھینک یو۔ مجھے ہیرے جڑے کف لنکس، ٹائی پن یا گھڑیوں کا شوق نہیں ہے۔ میری جنریشن کے لوگ پتھروں کی نسبت "ایکسپیرینس" پہ پیسہ خرچ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔"

"میرا مطلب تھا.... کوئی تو ایسا ہوگا آپ کی زندگی میں جسے آپ ہیرا تحفے میں دینا چاہیں گے؟"

منیجر خوش گوار لہجے میں ابرو اٹھا کے بولا۔ صوفی نے بھی مسکراہٹ چھپا کے ایڈم کو دیکھا۔

"وہ اب ہیروں سے خوش نہیں ہوتی۔ اس کے پاس سارے زمانے کے جواہرات ہیں۔" پھر منیجر سے مصافحہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ نوجوان تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

ایڈم کے ساتھ چلتی صوفی کھنکھاری۔ "آپ کیا کر رہے ہیں، باس؟"

وہ سر جھکائے موبائل پہ ٹائپ کرتے ہوئے بولا۔ "پے تالیہ کو اس سیٹ کی تصویر بھیج رہا ہوں تاکہ وہ وان فاتح سے پوچھیں کہ یہ سیٹ عصرہ کی ملکیت میں ہے یا نہیں۔ امید ہے یہ سیٹ انہیں کئی برس سے نظر نہیں آیا ہوگا۔"

"آپ اپنی زندگی کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟"

"میں ایک دوست کی مدد کر رہا ہوں۔"

"وہ صرف دوست نہیں ہے۔ یقیناً کسی وجہ سے آپ دونوں کا تعلق ٹوٹ گیا تھا لیکن جس طرح آپ اس کی مدد کر رہے ہیں، آپ کو پھر سے تعلق جوڑنے کی امید ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے سادگی سے شانے اچکائے۔ وہ دونوں اب اسٹور کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔

"تو پھر معلوم کریں اور کھل کے اسے سب بتا دیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" وہ تلخی سے ہنسا۔

"پھر آپ کو کوئی پچھتاوا نہیں رہے گا۔ اور سنیں

باس.... ساری دنیا امید پہ ہی تو قائم ہے۔ اور اپنے فائدے کے لیے ہم سب کو لڑنا پڑتا ہے۔ قسمت وغیرہ کچھ نہیں ہوتی۔ انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے' ہاں۔"

دروازہ کھولنے سے پہلے ایڈم ایک دم واپس گھوما۔ وہ نوجوان جوان سے ذرا فاصلے پہ رکا کھڑا تھا' گڑبڑا گیا۔

"جی؟" ایڈم نے تحمل سے ابرو اٹھا کے پوچھا۔

"وہ سر... میں...." وہ ہکلا گیا۔ رنگت سرخ پڑ گئی۔ صوفی نے گہری سانس لی اور آگے بڑھی۔

"آپ ادھر کھڑے ہو جائیں۔ میں آپ دونوں کی تصویر بنائے دیتی ہوں۔ باس۔ باس!" اسے آنکھ سے اشارہ کیا۔

"اوہ۔" وہ ان مسکلوں میں ایسا الجھا تھا کہ اسے بھول گیا تھا کہ وہ نوجوان اسے ایسے کیوں دیکھ رہا تھا۔ وہ بے چارہ فین تھا۔ ایڈم قدرے مسکرایا تو اس کو حوصلہ ہوا۔ وہ خوشی خوشی اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ صوفی نے اپنے فون سے دونوں کی تصویر کھینچی۔ پھر ایڈم نے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ فین مومنٹ میں بالکل کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔

"تھینک یو' سر... میں آپ کا شو بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔" وہ جذبات سے بے قابو ہوتے بہ دقت بول پایا۔

"بہت شکریہ۔" ایڈم نے سر کو جنبش دے کر کہا اور مڑ گیا۔ اپنے پیچھے اس نے سنا' وہ صوفی سے تصویر اپنے فون میں منتقل کرواتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں آج کے دن کو ساری زندگی یاد رکھوں گا۔"

ایڈم بن محمد کے قدم وہیں جم گئے۔ وہ آہستہ سے مڑا اور تعجب سے اس نوجوان کو دیکھا۔

"کیوں؟ تم اس دن کو کیوں یاد رکھو گے؟"

"کیونکہ...." وہ نروس سا مسکرایا۔ صوفی کو دیکھا پھر اس کو۔ "کیونکہ آپ سیلیبریٹی ہیں۔ آپ...... لائیک...... مشہور ہیں اور......"

"باس؟" صوفی نے آنکھیں گھما کے اسے دیکھا۔

"منیجر صاحب..." وہ بلند آواز میں کہتا واپس اسٹور میں آیا۔ بہت سے لوگ ہاتھ روک کے اسے دیکھنے لگے۔ ایڈم نے پی کیپ اتاری اور واپس اسی صوفے پہ بیٹھا۔

"مجھے آپ سے ایک اور فیور چاہیے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس کے بعد میں آپ کے ڈائمنڈز خریدنے کے لیے متفق ہو جاؤں گا۔" وہ بازو صوفے کی پشت پہ پھیلا کے مسکرا کے بولا۔ منیجر مسکرا کے واپس اس کی طرف آیا۔

اس کی سب سے بڑی طاقت سیلیبریٹی ہونا تھی۔ اور آج اسی شے نے ایڈم بن محمد کو کامیابی دلانا تھی۔

☆☆☆

جونکر اسٹریٹ کی رونق اس سہ پہر ویسی ہی تھی۔ بادل سارے ملاکہ پہ چھائے تھے اس لیے وہاں ٹھنڈی سی چھایا تھی۔ ایسے میں سڑک کنارے ایک ٹیکسی رکی اور سفید ہیٹ والی تالیہ مراد باہر نکلی۔

اس کے سامنے سڑک کا وہ حصہ تھا جہاں سے وہ چھ سال بعد اپنی دنیا میں واپس آئی تھی۔

کتنی ہی دیر وہ وہیں کھڑی رہی۔ پھر ہمت کر کے دھیرے دھیرے قدم اس جانب اٹھائے۔ جامنی فراک کا گھیرا ٹخنوں کے قریب ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اور سنہری چین والا پرس کندھے سے لٹک رہا تھا۔ انگلیاں باہم مروڑتی وہ اس مین ہول کے کنارے آئی۔ پھر پنجوں کے بل وہاں بیٹھی۔ چند لمحے وہ اپنے دل کی دھڑکن سنتی رہی۔

مین ہول کے ڈھکن میں ایک کاغذ کا کونا پھنسا نظر آ رہا تھا۔ کنارے سے ایک جگہ سیمنٹ اکھڑی تھی تو وہاں برہنہ گیلی مٹی نظر آتی تھی۔ جس میں ایک کونپل اگی تھی۔ اس کونپل پہ ایک تتلی بیٹھی تھی۔ تتلی سیاہ تھی اور اس پہ پیلے دھبے تھے۔ یا شاید وہ پیلی تھی اور دھبے سیاہ تھے۔

تالیہ نے ہاتھ اس جانب بڑھائے تو تتلی اڑ

گئی۔ اس نے تتلی کا تعاقب نہیں کیا۔ بس ہمت کر کے ڈھکن ذرا سا اٹھایا اور لفافہ نکالا۔ پھر ہاتھ سے اس پہ لگی گرد اور ریت جھاڑی۔

"پتری تاشہ بنت مراد کے نام۔"

خط کا لفافہ سفید تھا۔ زردی مائل سفید۔ کاغذ قدیم زمانے کا بنا لگتا تھا۔ اس پہ تاریخ اس دن سے ایک ماہ بعد کی لکھی تھی جب وہ ایڈم اور فاتح کے ساتھ قدیم ملاکہ سے نکلی تھی۔ جب مراد راجہ نے فاتح کو وہ کاری زخم پہنچایا تھا۔

تالیہ نے انگلیوں پہ گنا۔ یہ اس کے قدیم ملاکہ سے نکلنے کے ایک ماہ بعد لکھا گیا تھا۔

وہ لفافہ اٹھائے کھڑی ہوئی۔ اسے چاک کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس پہ لگی مہر سلطنت محل کی تھی۔ سلطان مراد راجہ کی مہر۔ کیا وہ واقعی اس کے ماضی کی بازگشت تھا؟ کیا اُس دنیا سے اِس دنیا میں خط بھیجنا ممکن تھا؟

تالیہ کو احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ تیزی سے الٹے قدموں گھومی۔

گلی میں غیر شناسا لوگ آ جا رہے تھے۔ بظاہر کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ وہ سر جھٹک کے آگے بڑھنے لگی۔

کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ یہ احساس پھر سے ہونے لگا لیکن وہ بظاہر اطمینان سے قدم اٹھاتی رہی۔ ایک دوسری اسٹریٹ میں مڑتے ہوئے وہ تیزی سے پلٹی۔ کوئی سیاہ لبادے میں موجود تھا اور تیزی سے دوسری گلی کی اوٹ میں روپوش ہوا تھا۔

تالیہ تیز قدموں سے اس طرف بھاگی۔ اس کا ہیٹ نیچے گر گیا لیکن وہ دوڑ کے اسٹریٹ کے دوسرے سرے تک آئی۔

سیاہ لبادے میں موجود شخص کی اس کی جانب پشت تھی۔ اس نے آہستہ سے چہرہ موڑا۔ وہ چہرہ دیکھ کے تالیہ ساکت سی کھڑی رہ گئی۔ اسے چند لمحے لگے تھے اسے پہچاننے میں۔

"لیانہ!" وہ بے یقینی سے بولی تو لیانہ صابری ہلکا سا مسکرائی۔ وہ دونوں گلی کے سرے پہ کھڑی ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ لیانہ مسکرا کے اور تالیہ ششدر سی ہو کے۔

"اوہ نو.... داتن!" وہ ایک دم ہنسی اور آگے بڑھ کے اس کے گلے لگ گئی۔ پھر اسی تحیر سے الگ ہوئی اور سر سے پیر تک اسے دیکھا۔

"تم.... تم داتن ہو نا؟" وہ واقعی بے یقین تھی۔

لیانہ صابری کے بال ویسے ہی گھنگھریالے تھے اور لباس ڈھیلا ڈھالا سا سیاہ رنگ کا تھا۔ لیکن وہ ایک دبلی پتلی جسامت کی عورت میں بدل چکی تھی۔ وزن کم ہونے کے باعث اس کی صحت خوش گوار اور عمر کم لگ رہی تھی۔

"ہاں۔ اور مجھے تمہارا میسج مل گیا تھا۔" وہ مسکرا کے بولی۔ تالیہ نے ایک دفعہ پھر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"میرے پاس پوچھنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں... مگر.... پہلے یہ بتاؤ.... تمہارا وزن کیسے کم ہوا؟"

"بس تالیہ... بہت فاقے کاٹے... روز گھنٹوں ورزش کی... میٹھا چھوڑ دیا... کاربز کو خدا حافظ کہہ دیا... پھر کہیں جا کے وزن کم ہوا۔"

تالیہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"ظاہر ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ sleeve gastrectomy کروائی ہے۔ (ایسا آپریشن جس میں معدہ کاٹ کے چھوٹا کر دیا جاتا ہے۔)" وہ مسکراتے ہوئے کندھے اچکا کے بولی تو تالیہ ہنس دی۔

"تم نہیں بدلو گی' داتن۔"

"اور کسی انسان کی اس سے بڑی اچھائی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بدلنے والا نہ ہو۔ ہوں؟" داتن پدو کا تفاخر سے مسکرائی۔ تالیہ نے پیار سے اسے دیکھا۔

"آؤ وہاں بیٹھتے ہیں۔" اس نے اسٹریٹ سائیڈ بچھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "بہت سی باتیں ہیں جو مجھے تم سے پوچھنی ہیں۔"

”اور مجھے تم سے صرف یہی پوچھنا ہے کہ تم کہاں تھیں، تالیہ؟ اتنے برس میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔“ داتن کے انداز میں اپنائیت بھرا غصہ در آیا۔ وہ ہنس دی اور سڑک پہ گرا اپنا ہیٹ اٹھایا۔

”داستان لمبی ہے۔ تم داستان سننے ہی آئی ہو نا تو بیٹھ کے سنو۔“ وہ دونوں سڑک کنارے بچھی کرسیوں کی طرف چلی گئیں۔ تالیہ نے ہاتھ سے ویٹر کو اشارہ کیا۔ اسے داتن کو یہ داستان کافی کے چند ادوار کے ساتھ سنانی تھی۔

☆☆☆

تیز بتیوں سے روشن جیولری اسٹور میں اس وقت ایڈم کے سامنے چار پانچ افراد بیٹھے تھے۔ سب اسے بغور سن رہے تھے جو ہاتھ ہلاتے ہوئے آہستہ آہستہ سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”آپ چار لوگ وہ ہیں جو چھ سال سے یہاں جاب کرر ہے ہیں۔ آپ چاروں اس دن شاپ میں موجود تھے جب مسز عصرہ آئی تھیں۔“

”جی بالکل۔ مجھے یاد ہے۔ مگر ہم میں سے کسی کی ان سے بات نہیں ہوئی تھی۔“

”آپ ایک برانڈڈ اسٹور ہیں۔ آپ کے پاس آنے والے گاہک صرف وہ ہوتے تھے جن کے پاس پیسے کی فراوانی ہو۔ یہاں عام آدمی نہیں آتا۔ شہر کے کتنے امراء یہاں روز آتے ہوں گے لیکن آپ کو نہیں یاد ہوگا کہ چھ برس پہلے یہاں کون کون آیا۔ البتہ عصرہ محمود آپ کو یاد ہیں حالانکہ وہ اتنی امیر نہیں تھیں۔“

”بالکل۔“ ایک سیلز آفیسر بولا۔ ”آخری سال تک تو ان کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ جس زمانے میں یہ ہیروں کا سیٹ انہوں نے ہم سے لیا تھا اس بات کو بھی کئی برس ہو چکے تھے۔ مگر ان کی آمد کا دن مجھے اچھے سے یاد ہے۔ ایک ایک تفصیل کے ساتھ۔“

”جی بالکل۔ اور آپ کو معلوم ہے ایک زمانے میں میں وان فاتح کے پاس ملازمت کرتا تھا۔“ ایڈم مسکرا کے بولا۔

”جی۔ آپ ان کے باڈی گارڈ تھے۔“ پیچھے کھڑا فین نوجوان تیزی سے بولا۔

”باڈی مین۔“ ایڈم نے ضبط سے تصحیح کی۔ ”اور مجھے اپنی جاب کا پہلا دن اچھے سے یاد ہے۔“

(اور وہ دن وہ کیسے بھول سکتا تھا؟ اسی دن تو سب شروع ہوا تھا۔ تنگو کامل کا گھر.... ان کی ملازمہ.... عصرہ کا دیا سکہ....)

”مجھے وہ دن اس لیے یاد ہے کہ اس دن میں ایک سیلیبریٹی سے پہلی دفعہ ملا تھا۔ ہمیں امیر لوگ بھول جاتے ہیں، خوب صورت لوگ بھی ہماری یادداشت سے دھندلا جاتے ہیں، لیکن کسی بھی شخص کو روک کے پوچھیں کہ کیا کبھی وہ کسی سیلیبریٹی سے ملا ہے تو وہ اس دن کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دے گا۔ جب اس نے مارکیٹ میں کسی ایکٹر یا سنگر کو دیکھا۔ کپڑے، جوتے، موسم.... ایک ایک لفظ جو سیلیبریٹی کے منہ سے نکلا.... لوگوں کو وہ سب یاد رہتا ہے۔“ ایڈم پرجوش انداز میں کہہ رہا تھا۔

”اور لوگ اس یاد کو محفوظ کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟ وہ سیلیبریٹی کے ساتھ تصویر کھنچواتے ہیں۔ اب بتائیے.... کیا کسی نے اس دن ان کے ساتھ تصویر کھنچوائی تھی؟ اور اگر کھنچوائی تھی تو لوگوں کو کہیں دکھائی ہوگی۔ فیس بک یا ٹوئیٹر پہ۔“

یہ ممکن نہیں تھا کہ عصرہ محمود شاپ میں داخل ہو اور کوئی اس کے ساتھ سیلفی نہ لے اور اسے اپ لوڈ نہ کرے۔ چند منٹ میں اس کے سامنے آٹھ تصاویر آگئیں جو یہاں کام کرنے والے اور یہاں سے کام چھوڑ جانے والے ملازمین کے فیس بک سے اٹھائی گئی تھیں۔

عصرہ ہر تصویر میں مسکرا رہی تھی لیکن وہ تکان زدہ لگتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا جس کے اندر یقیناً وہ سیٹ ہوگا۔ صرف ایک تصویر ایسی تھی جس میں وہ صوفے پہ بیٹھی تھی اور ملازم نے

پیچھے کھڑے ہو کے سیلفی بنائی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھے شخص کا نیم رخ اس تصویر میں واضح نظر آرہا تھا۔

اس کے چہرے پہ واضح زخم کا نشان تھا۔ بال گھنگھریالے تھے۔ تصویر کافی حد تک قابل شناخت تھی۔

"جو ہمیں کرنا آتا ہے' وہ ہمیشہ ہمارے کام آتا ہے۔" وہ گہری سانس لے کر بڑبڑایا۔

اتنے دن سے وہ غلط لوگوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ فلاں دکان' فلاں کافی شاپ۔ وہ بھری مارکیٹ میں لوگوں سے غلط سوال پوچھ رہا تھا۔ اور اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

اسے صرف ان دکانداروں سے پوچھنا تھا کہ کیا انہوں نے کبھی عصرہ محمود کو یہاں آتے دیکھا ہے؟ اور ہر شخص کے پاس سنانے کو ایک فین مومنٹ سے بھری کہانی ہوتی۔ کتنی ہی سیلفیاں نکل آتیں۔ ساری کڑیاں مل جاتیں۔

ایڈم نے گہری سانس لی اور وہ تصویر تالیہ کو بھیجی۔

"وان فاتح سے پوچھ کے بتائیں.... کیا وہ اس شخص کو جانتے ہیں؟ اور ہے تالیہ..... جب آپ ملاکہ سے واپس آئیں گی تو میں آپ کے پاس آؤں گا۔ مجھے آپ سے ایک اہم بات کرنی ہے۔" اس نے وہ پیغام بھیج دیا اور ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

☆☆☆

سڑک کنارے بچھی کرسیوں پہ وہ آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ کافی کے کپ سامنے رکھے تھے اور فضا میں روسٹ ہوئے کافی بینز کی مہک پھیلی تھی۔ تالیہ کا ہیٹ اب میز پہ رکھا تھا۔ کافی کا دوسرا دور چل رہا تھا اور باتیں ختم ہونے کو نہیں آرہی تھیں۔

"میں نے اتنے سال تمہیں اتنا تلاشا' تالیہ۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارے وہ سال کہیں گئے ہی نہیں تھے۔" داتن اس کی کتھا سن کے حسرت سے ٹھنڈی آہ بھر کے بولی۔ "کاش یہ آپشن میرے پاس بھی ہوتا۔ زندگی کو پاز کرنے کا۔"

"یہ آپشن نہ ہونا ہی اچھا ہے۔ خیر تم بتاؤ..... تم پولیس کو مطلوب تو نہیں ہو نا؟"

"نہیں۔ میں آزاد ہوں۔ میرے پیچھے کوئی نہیں ہے۔" وہ آنکھیں گھما کے مسکرائی تو تالیہ نے غور سے اسے دیکھا۔

"تم نے وہ زندگی نہیں چھوڑی' داتن؟" اسے جیسے افسوس ہوا۔

"میرے پاس خاموش رہنے کا حق ہے۔" داتن نے مسکرا کے کندھے اچکا دیے۔ تالیہ نے سر جھٹکا اور کافی کا کپ اٹھا لیا۔ بدلنے کا فیصلہ تالیہ نے کیا تھا۔ داتن نے نہیں۔

"تم فاتح سے ملیں؟"

"ہاں۔ کئی دفعہ۔" وہ عام سے انداز میں بولی۔ نظریں کافی کے کپ پہ جھکی تھیں۔ "صبح بھی میں ان کے ساتھ تھی۔"

"سب کیسا ہے تمہارے درمیان؟" داتن اس کا چہرہ پڑھنا چاہ رہی تھی۔

"معلوم نہیں۔ میں یہ دیکھنے گئی تھی کہ ان کی زندگی میں میری جگہ ہے یا نہیں۔ مگر اب سوچ رہی ہوں کہ کیا میری زندگی میں ان کی جگہ ہے؟" وہ گھونٹ بھرتے ہوئے دور تک بچھی میز کرسیوں کی قطار کو دیکھنے لگی۔ ہر کیفے اور ریستوران کے سامنے اس کا اپنا چھجا بنا تھا جس کے نیچے لوگ بیٹھے اس خوب صورت سہ پہر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بے فکرے' من موجی لوگ۔ یا شاید وہ بھی اس لڑکی کو دیکھ کے یہی سوچتے ہوں گے۔ کون اپنے اندر کس جنگ سے نبرد آزما ہے' کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔

"تمہاری زندگی میں اس کی جگہ کیوں نہیں ہے؟"

"کیونکہ دنیا والے مجھے اپنے پردھان منتری کے ساتھ قبول نہیں کریں گے۔"

"ایں؟ دنیا والے کہاں سے آگئے؟"

"دنیا والے ہی تو ہر جگہ آجاتے ہیں' داتن۔" وہ اداسی سے سڑک کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "وان فاتح ان

کا ہیرو ہے اور لوگ اپنے ہیرو سے نفرت نہیں کر سکتے۔ وہ اس کو شیئر کرنے والے سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ جیسے لوگ زار روس نکولیس دوم سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ اس کی بیوی الیگزینڈرا سے نفرت کرتے تھے۔ راسپوٹین سے کرتے تھے۔ حالانکہ قصوروار 'زار' تھا کیونکہ اس نے ان دونوں کو اپنی زندگی میں جگہ دی تھی۔ مگر پرستار کی اندھی محبت یہ سوال نہیں پوچھتی۔ اپنے ہیرو کے لیے ان کے پاس ڈھیروں تاویلیں ہوں گی۔ تالیہ مراد کے لیے نہیں ہوں گی۔"

"وان فاتح کے ساتھ زندگی کا تصور مشکل لگ رہا ہے؟"

"جو الزام میرے اوپر لگا ہے' اس کو دھوئے بغیر تو بہت مشکل ہے۔ دنیا والے مجھے برا کہیں گے۔ اگر ان کو معلوم ہوا کہ تالیہ مراد فاتح کی بیوی ہے تو وہ مجھے 'ہوم ریکر' کہیں گے۔ پہلی بیوی بھی غلط نہیں ہوتی۔ دوسری ہوتی ہے۔"

شام اب گہری ہو رہی تھی۔ پرندے آسمان پہ غول کی صورت اڑتے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

"تو پھر چھوڑ دو اس کو۔ نکل جاؤ اس کی زندگی سے۔ اپنی زندگی مشکل نہ بناؤ' تالیہ۔ تم ایک ایسا انسان ڈیزرو کرتی ہو جس کے ساتھ تم سر اٹھا کے جی سکو۔ تمہیں کسی کا خوف' کسی کا گلٹ نہ ہو۔"

تالیہ نے اداس مسکراتی نظریں اس کی طرف اٹھائیں۔ "تم ایڈم کی بات کر رہی ہو۔"

داتن چپ ہو گئی۔ پھر گہری سانس لی۔ "شکر ہے تم جانتی ہو۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم اس بارے میں بات کریں گے لیکن نہیں کر سکے۔ کئی دن۔ کئی سال۔" وہ کپ کے دہانے پہ انگلی پھیرتے ہوئے مسکرا کے بولی۔

"اگر تم وان فاتح کے ساتھ خوش نہیں ہو تو اس کو اپناؤ جو تم سے محبت کرتا ہے۔ سیانے کہتے تھے' شادی اس سے نہیں کرنی چاہیے جس سے آپ محبت کرتے ہیں بلکہ اس سے کرنی چاہیے جو آپ سے محبت کرتا ہے۔"

"ان سیانوں کی اپنی شادیوں کا کیا بنا۔ میں اکثر سوچتی ہوں۔" وہ ہنس کے ٹال گئی۔ داتن نے ناک چڑھا کے ہونہہ کیا۔

"تم اپنے آپ کو وان فاتح کے انتظار میں ضائع کر رہی ہو۔ تم ایڈم جیسا انسان ڈیزرو کرتی ہو تالیہ۔ اب بھی وقت ہے۔ تم فاتح کی زندگی سے عزت کے ساتھ الگ ہو جاؤ۔ خود پہ کوئی دھبہ لگائے بغیر۔"

"کسی نے مجھے کہا تھا کہ کسی کو unlove کرنا آسان نہیں ہوتا۔ میں کوشش کروں گی کہ فاتح کو unlove کر سکوں۔ شاید یہ فیصلہ تب آسان ہو جائے۔" پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ "میرے پاس ابھی ایک دن ہے۔ کل مجھے فاتح کی فیملی کے ساتھ ڈنر کرنا ہے۔ فاتح نے بلایا ہے۔"

"اگر تم نے وان فاتح کو چھوڑ ہی دینا ہے تو اس کی فیملی سے ملنے کا مقصد؟"

"میں اس میشا تاج سے ملنا چاہتی ہوں جو ان کے گھر میں رہ رہی ہے۔ وہ جولیانہ کی ہوم ٹیوٹر ہے اور...." اس نے مسکرا کے داتن کو دیکھا۔ "مجھے اس کو دیکھ کر کوئی یاد آیا؟"

"کون؟" داتن نے تعجب سے اسے دیکھا۔ تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

"میں... داتن... میں' تالیہ۔ وہ میری کاربن کاپی ہے۔ کسی نے دو سال پہلے اسے فاتح کی زندگی میں داخل کیا ہے اور وہ صرف اسی لیے دھوکہ کھا گئے کیونکہ انہیں اس کو دیکھ کے میں یاد آتی تھی۔ وہ کون دشمن ہے اور مجھے ان کو اس سے بچانا ہے۔"

"تالیہ۔" داتن نے آہستہ سے کہا۔ "دو سال ایک لمبا عرصہ ہے ایک کون کھیلنے کے لیے۔ اور میرا نہیں خیال کہ تمہارے اور اس کے درمیان کوئی خاص مشابہت ہے۔ اتنی مشابہت ہونے کا یہ مطلب بھی تو

ہوسکتا ہے کہ فاتح ایک ہی طرح کی عورتوں کو اپنی زندگی میں جگہ دیتا ہے۔"

تالیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "تمہیں میرا یقین نہیں ہے؟"

"میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ تم ییشا تاج کے بارے میں غلط بھی ہوسکتی ہو۔ تالیہ تم ابھی تک چھ سال پہلے کے ٹائم فریم میں ہو۔ یہاں ایک زمانہ بیت چکا ہے۔ اتنا وقت کس کے پاس ہوگا کہ وہ تمہارے جانے کے چار سال بعد کسی کو فاتح کی زندگی میں بھیجے گا؟ اور پھر دو سال تک اس عورت نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اب کیوں پہنچائے گی؟"

"تمہیں میری عقل اور سمجھ پہ ذرا بھی بھروسہ نہیں ہے؟" تالیہ خفگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

"اپنی عقل سے پوچھو کہ کہیں وہ تمہیں وہی تو نہیں دکھا رہی جو تم دیکھنا چاہتی ہو۔ تم یہ ماننے کو تیار نہیں ہو کہ فاتح کی زندگی میں کوئی اور بھی ہے۔ تم بس یہی چاہتی ہو کہ کسی طرح ان کو تمہاری ضرورت پڑتی رہے۔ تم ان کو ہر مسئلے سے بچاتی رہو۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ "اور تمہارا اپنا کیس؟ اس کی تحقیق کون کرے گا؟"

"ایڈم۔ کیونکہ دوست اسی لیے ہوتے ہیں۔" وہ شانے اچکا کے بولی۔ "خیر چھوڑو ییشا کو۔ میں تمہیں ثابت کر کے دکھا دوں گی۔ بہر حال.... میرے گھر کا پتا تمہیں معلوم ہوگا۔ میں تم سے کل کے ایل میں ملوں گی۔ تب تک تم مجھے ییشا تاج کے بارے میں جتنی معلومات مل سکیں، ڈھونڈ کے دو گی۔"

داتن نے منہ بنا کے اسے دیکھا۔ "تم اس زندگی کو ترک کر چکی ہو۔ اب میں تمہاری کرائم پارٹنر نہیں رہی۔ اب میں تمہارے لیے کیوں ریسرچ کروں گی، تالیہ؟"

"کہا نا.... دوست اسی لیے ہوتے ہیں۔" اس نے مسکرا کے ہیٹ سر پہ رکھا۔ اور ہاتھ اٹھا کے دوسری جانب سے آتی ٹیکسی کو اشارہ کرنے لگی۔

"تم اب کہاں جا رہی ہو؟" داتن نے پیچھے سے پکارا۔

"اس شخص سے ملنے جس نے ییشا کو بھیجا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ کون ہے۔" وہ آگے بڑھ گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور کو پتا بتا کے اس نے پرس سے وہ خط نکالا اور پھر.... دھڑکتے دل سے لفافے کی مہر توڑی۔

اندر زردی مائل کاغذ پہ سیاہ روشنائی میں لکھی تحریر دیکھتے ہی اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ وہ اس لکھائی کو پہچانتی تھی۔

"پیاری تالیہ....

تمہیں گئے آج تیسواں روز ہونے کو آیا ہے۔ میری فتوحات میں اضافہ ہو رہا ہے اور میرے دشمنوں کو شکست ہو رہی ہے۔ لیکن کوئی بھی خوشی تمہارے بچھڑنے کے غم کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ تم مجھے بہت اکیلا کر کے چلی گئی ہو۔

میں مانتا ہوں کہ میرے کیے اکثر فیصلے بہت غلط تھے۔ میں نے وان فاتح کو تکلیف پہنچائی۔ نہیں معلوم کہ وہ دوسری دنیا میں پہنچنے تک زندہ رہا یا نہیں۔ نہیں معلوم کہ اپنی دنیا میں میں زندہ ہوں یا مردوں میں سے ہوں۔ نہیں معلوم کہ تم اپنی کتابوں میں میرے بارے میں کیا پڑھو گی۔ غلط تھے میرے فیصلے۔ میں مانتا ہوں۔ لیکن اس سب میں ایک چیز سچی تھی۔ تالیہ کی مراد راجہ سے محبت۔ اور مراد راجہ کی اپنی اصل بیٹی تالیہ سے محبت۔ میں نے جو کچھ کیا محبت میں کیا۔ محبت انسان سے کیا نہیں کرواتی۔ چوری.... قتل.... جنگ۔ بس ایک "محبت" نہیں کرواتی۔ میں تم سے وہ محبت نہیں کر سکا جو مجھے کرنی چاہیے تھی۔ نہیں جانتا کہ تمہاری دنیا میں وقت کی سوئی کہاں ہے۔ لیکن ایک ملال ہمیشہ رہے گا۔

کاش تم مجھے یوں دھوکا دے کر نہ جاتیں۔ تم مجھ سے لڑ کے، رو پیٹ کے، مجھ پہ غصہ کر کے چلی جاتیں تالیہ.... لیکن دھوکا دے کر نہ جاتیں۔ مجھے ٹھیک سے الوداع کہنے کا موقع تو دیتیں۔ تم نے مجھے بہت تکلیف دی ہے۔ میں اپنی دی گئی تکلیف کی سزا بھگت

رہا ہوں.... لیکن جانتی ہو تمہارا دل کیوں ٹوٹا ہوا ہے؟ کیونکہ تم نے مجھے تکلیف دی ہے۔ تمہارا یہ دکھ کبھی دور نہیں ہوگا تالیہ۔ تم چاہے ملکوں ملکوں پھرو۔ چاہے ان سارے مسئلوں سے نکل آؤ جن میں تم گرفتار تھیں... چاہے تمہارے پاس زمانے بھر کے خزانے آجائیں... یا تمہیں اپنا من پسند آدمی مل جائے.... تم جہاں بھی جاؤ گی میری بیٹی.... تمہارا یہ زخم کبھی نہیں بھرے گا۔ سوائے اس کے کہ..... تم میرے پاس واپس آجاؤ۔ تمہیں کسی دوسری دنیا میں سکون نہیں ملے گا۔ یہ بددعا نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے۔

تمہارا باپ۔

مراد۔"

خط کے صفحے پہ جگہ جگہ گرتے آنسوؤں نے روشنائی مٹا ڈالی تھی۔ اس نے گیلی سانس ناک سے اندر کھینچی۔ ڈرائیور نے بیک ویو مرر میں اس لڑکی کو دیکھا جو خط تہہ کرتے ہوئے پرس میں رکھ رہی تھی۔ اس کی جھکی پلکوں پہ کتنے ہی آنسو آن ٹھہرے تھے۔

کسی کو unlove کرنا واقعی آسان نہ تھا۔ نہ فاتح کو۔ نہ مراد راجہ کو۔

☆☆☆

وہ گلی چھ سال میں کئی دفعہ بدلی ہوگی۔ لیکن تالیہ کو وہ آج بھی ویسی ہی لگی تھی۔ وہی گملے۔ وہی فرش۔ اور ذوالکفلی کے گھر کے سامنے بنے دو اسٹیپ۔ وہ اس گلی میں داخل ہوئی اور چبھتی نظروں سے اطراف کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سارے آنسو اب تک سوکھ چکے تھے۔ اور ان میں سرد مہری در آئی تھی۔

مکان کے دروازے پہ زنجیر میں لپٹا تالا لگا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا اس گھر کو برسوں سے کسی نے نہیں کھولا۔ جامنی فراک والی لڑکی سینے پہ بازو لپیٹے چند لمحے تنفر سے اس مکان کو دیکھتی رہی۔

پھر وہ دروازے کے سامنے بنے اسٹیپ پہ بیٹھی، ہیٹ اتار کے ساتھ رکھا اور اونچی آواز میں بولی۔ "میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں، ذوالکفلی۔"

گلی سنسان تھی۔ مغرب گہری ہو چکی تھی اور سارے پہ جامنی اندھیرا پھیلا تھا۔ بظاہر اس کے اردگرد کوئی نہ تھا۔ لیکن تالیہ جانتی تھی کہ وہ کسی کونے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے گزرے اور گلی کے دوسرے کونے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ زینوں پہ بیٹھی تالیہ نے چہرہ اس طرف موڑا۔

لمبی برساتی پہنے، سر پہ سیاہ ہیٹ جمائے وہ اس کی طرف چلتا آرہا تھا۔ جیسے جیسے وہ قریب آتا گیا، اس کے چہرے کا ایک ایک نقش واضح ہوتا گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک آج بھی ویسی ہی تھی۔ جھریوں نے البتہ جلد کو کریلے کے خول کی مانند کر دیا تھا۔ کڑوے کریلے جیسے۔ قلموں سے بال سفید ہوتے نظر آرہے تھے۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ پھر ہیٹ والا سر جھکا کے اسے دیکھا اور مسکرا کے ابرو اچکائے۔

"کیا چیز شہزادی کو میرے غریب خانے پہ لے آئی آج؟"

تالیہ نے گردن اٹھا کے پتلیاں سکوڑ کے اسے دیکھا۔

"تم بھی عجیب آدمی ہو، ذوالکفلی۔" وہ افسوس سے اسے کہنے لگی۔ "میں تم سے پہلی دفعہ تب ملی تھی جب میرے بابا زخمی تھے۔ تم نے مجھے ان کی دوا دی تھی.... اس شرط پہ کہ ان کو تمہارے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ محبت کی بے بسی بھی عجیب ہوتی ہے۔ ساری شرطیں منوا لیتی ہے۔ تمہیں جوان خون چاہیے تھا اپنی ساحرانہ قوتوں کو بڑھانے کے لیے۔ جتنے لوگوں کو تم جادو سکھاؤ گے، اتنی تمہاری طاقت بڑھے گی۔ میں نے پمورو کی کتابوں میں پڑھا ہے اس بارے میں۔ اسی لیے تم نے مجھ سے میرا باپ لے لیا اور اس کو جادوگر بنا ڈالا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کے بول رہی تھی۔

"اگر تمہارا باپ جادوگر نہ ہوتا تو کیا وہ سارے ظلم نہ کرتا جو اس نے کیے، پتری تالیہ؟ اونہوں۔ کسی ہنر کا سیکھنا انسان کی فطرت نہیں بدلتا۔ سانپ کی فطرت میں ڈس لینا ہے۔ وہ مسجد میں رہ کے بھی نہیں بدلتا۔"

"جیسے تم نہیں بدلے۔ وہ دنیا ہو یا یہ دنیا۔ تم نے ہر جگہ دوسروں کو دھوکے سکھائے۔ جادو بھی تو ایک دھوکا ہے۔ تم اپنی دنیا میں جادوگر تھے۔ ہماری دنیا میں کون آرٹسٹ کہلائے۔ جب میں تمہیں بھلا چکی تھی، تب تم مجھ سے یتیم خانے میں ملے۔ اور تم نے مجھے پھر سے دھوکا دیا۔"

"اپنی شناخت چھپا کے؟" وہ چمکتی آنکھوں سے مسکرا رہا تھا۔

"نہیں۔ مجھے یہ تاثر دے کر کہ تم مجھے ایڈاپٹ کرنے جا رہے ہو۔ پہلی دفعہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ مجھے ایک باپ، ایک گھر ملنے والا ہے۔ تالیہ نے ساری عمر کیا چاہا ہے اس کے سوا کہ اس کا کوئی گھر ہو، کوئی فیملی ہو؟ لیکن نہیں۔ برسوں بعد میں تمہیں دوبارہ ملی، تب بھی تم نے میرے ساتھ یہی کیا۔ مجھے ایک فریب کے پیچھے لگا دیا۔"

"کیا میں نے تمہیں بہروپیا بنایا؟ یاد رکھو..... تم میرے پاس آنے سے پہلے بھی چھوٹی موٹی چوریاں شروع کر چکی تھیں۔"

"میں vulnerable تھی۔" اس کی آواز اب سپاٹ نہیں رہی تھی۔ اس میں اداسیاں گھل گئی تھیں۔ "میرے خواب ٹوٹے تھے۔ میرے پاس غربت میں گزارا کرنے کی چوائس تھی۔ میں نے غلط فیصلہ کیا۔ لیکن تمہارے پاس بھی چوائس تھی۔ تالیہ کی روح کو بچا لینے کی۔ تم نے بھی درست فیصلہ نہیں کیا۔ تم نے مجھے فریب کاری کی دنیا میں گرنے دیا۔"

"میں نے ہمیشہ تمہارا خیال رکھا۔ تمہارے پیچھے تمہاری حفاظت کی۔ تم مشکل میں میرے پاس آئی تھیں۔ اور تم نے کیا کیا؟ مجھے زہر دینا چاہا؟"

دونوں اندھیر گلی میں آمنے سامنے موجود تھے۔ وہ ابھی تک بیٹھی تھی اور وہ کھڑا تھا۔ دونوں کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔

"میں نے تمہیں زہر نہیں دیا تھا۔ دھوکا دیا تھا۔ میں تم سے چابی مانگنے بھی نہ آتی اگر تم مجھے اس چابی کے چکر میں نہ پڑنے دیتے۔ تم مجھے میرا ماضی بھولنے رہنے دیتے۔ بھولنا ایک نعمت تھی، ذوالکفلی۔ تم نے میری نعمت مجھ سے چھن جانے دی۔"

"اور تم نے مجھ سے دھوکے سے چابی حاصل کر لی۔ میں نے کہا تھا نا، تمہیں دھوکے کی قیمت چکانی پڑے گی۔ تمہارے چھ برس ضائع ہو گئے، تالیہ۔ چچ چچ....."

"اگر میرے چھ برس ضائع ہوئے، تو تمہارے بھی یہ سال کسی اچھے کام کو کرنے میں نہیں گزرے۔ اب میری بات سنو جادوگر، انسان کا جو وقت کسی اچھے کام میں نہ گزرے، وہ ایسا ہوتا ہے کہ جیسے اس نے وہ گزارا ہی نہیں۔ بورنگ روٹین میں رہنے والوں کو اسی لیے لگتا ہے کہ وقت تیزی سے گزر گیا۔ وقت صرف ان کا ضائع نہیں ہوتا جو روشنی کے سفر پہ نکلتے ہیں۔ تالیہ کو افسوس نہیں ہے کہ اس کے سال ضائع ہوئے۔ تالیہ کو تم سے چابی حاصل کرنے پہ بھی کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔"

"تو پھر یہاں کیوں آئی ہو؟"

"یہ کہنے کہ میرا تمہارا حساب برابر ہو چکا ہے۔ بلکہ تمہارے گناہ زیادہ ہی ہوں گے۔ پھر فاتح کے پیچھے میشا کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ذوالکفلی کے ابرو اچنبھے سے بھنچے۔ "میں سمجھا نہیں۔ کون میشا؟" وہ حیران ہوا تھا۔

تالیہ نے افسوس سے سر جھٹکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اسٹیپ پہ کھڑی اس سے قدرے اونچی لگ رہی تھی۔

"تمہاری زبان دو کاموں میں ماہر ہے۔ جادو اور جھوٹ۔ لیکن تالیہ کو سچ اور جھوٹ کا فرق کرنا آتا ہے۔ تم نے اس عورت کو میرے سانچے پہ تخلیق کیا اور فاتح کی زندگی میں داخل کیا۔ صرف تم جانتے تھے ہمارے دونوں زمانوں کی باتوں کے بارے میں۔ سیاہ گھوڑے اور جانے کیا کچھ۔ تم فاتح کو نقصان پہنچا کے تالیہ سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔"

"نہیں، پتری تالیہ۔" وہ الجھن بھری برہمی سے بولا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی میشا کو نہیں

جانتا۔ نہ مجھے کسی کو یوں بھیجنے کی ضرورت ہے۔ میرا عناد تم سے تھا۔ وان فاتح سے نہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "تم میرے تنفر میں اتنی اندھی ہو چکی ہو کہ اپنے اصل دشمن کو ڈھونڈنے کے بجائے....."

"میں تمہارے جھوٹ سننے نہیں آئی۔ یہ بتانے آئی ہوں کہ اگر...." وہ ایک قدم نیچے اتری اور اس کے مقابل کھڑے ہو کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اگر.... تم نے.... فاتح کو نقصان پہنچایا.... تو.... میں.... تمہاری.... جان لے لوں گی۔"

"تم؟" وہ استہزائیہ مسکرایا۔ "تم کسی کی جان نہیں لے سکتیں۔"

"کیونکہ میں نے تمہیں زہر نہیں دیا تھا؟"

ذوالکفلی تلخی سے مسکرایا۔ "تم نے الف لیلوی کہانیاں پڑھی ہیں، پتری تالیہ؟ ان میں ایک شہزادی ہوتی ہے جس کو اگر کوئی زہر دے ڈالے... یا.... کسی ٹاور میں قید کر دے... یا... سوتیلی ماں اس پہ ظلم کرے.... تو اسے بچانے ایک شہزادہ آتا ہے سفید گھوڑے پہ۔ اور وہ اس کہانی کے سارے کرداروں کو ان کے غموں سے نکال لیتا ہے۔ تم بھی اپنی کہانی کی وہی saviour (نجات دہندہ) ہو۔ سفید گھوڑے والی شہزادی۔ اپنے سیاہ ماضی سے تائب ہو کے اچھائی کے سفید راستے پہ چلنے والی۔ اور سفید گھوڑے والی شہزادیاں کسی کی جان نہیں لے سکتیں۔"

وہ کہہ رہا تھا اور تالیہ اسے چبھتی نظروں سے دیکھتی گئی۔ پھر اس کے کان کے قریب چہرہ جھکا کے بولی۔

"ذوالکفلی...." اس کی آواز سرگوشی سے بھی ہلکی تھی۔ "سفید گھوڑے والی شہزادیوں کا زمانہ گزر چکا ہے۔"

پھر وہ اپنا ہیٹ لیے آگے بڑھ گئی۔ ذوالکفلی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتے دیکھتے رہا۔

☆☆☆

اگلی صبح اور اگلی دوپہر یوں گزر گئی کہ پتا ہی نہ چلا۔ پتراجایا کے آسمان پہ سرِ شام ہی سیاہ بادل اکٹھے ہونے لگے۔ ان کے گرجنے کی آوازیں اونچے محلوں میں رہنے والوں کو اپنے آرام دہ لونگ رومز میں بھی واضح سنائی دے رہی تھیں۔ آج رات بارش کھل کے برسنی تھی، یہ طے تھا۔

وان فاتح کی رہائش گاہ بھی بار بار بجلی کی چمک سے روشن ہوتی۔ پھر اندھیرا چھا جاتا۔ اندر اسٹڈی میں وہ اپنی مرکزی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ وہ سامنے بیٹھے سکندر اور جولیانہ کو دھیمے لہجے میں جو بات بتا رہا تھا، اسے سن کے جولیانہ نے کوئی تاثر نہیں دیا البتہ سکندر بدک کے کھڑا ہوا۔

"کیا مطلب؟" اس نے بے یقینی سے باپ کو دیکھا۔ "تالیہ مراد ہمارے گھر آ رہی ہے؟ وہ ہمارے ساتھ ڈنر کرے گی؟"

"تالیہ فیملی ہے، سکندر۔"

"تالیہ فیملی نہیں ہے۔" وہ دبا دبا سا غرایا۔ اس کے نوعمر چہرے پہ غصہ سرخی پھیلا رہا تھا۔

"سکندر....." وہ اتنے ہی تحمل سے بولا۔ "وہ ہر برے وقت میں ہمارے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ اس کا برا وقت ہے۔ اس پہ ایک غلط الزام لگا ہے۔ ہم اس کو اکیلا کیسے چھوڑ دیں؟"

"ڈیڈ..... آپ کو دکھائی کیوں نہیں دے رہا؟ اس نے ہماری ماں کا قتل کیا ہے۔ سارا میڈیا یہی کہہ رہا ہے۔"

"میڈیا تو یہ بھی کہتا ہے کہ میں ایک برا حکمران ہوں۔ کیا تم ان باتوں کا بھی یقین کر لیتے ہو؟" اس کے انداز میں اب کے برہمی در آئی۔ سکندر چپ ہو گیا۔ فاتح نے جولیانہ کی طرف چہرہ موڑا۔ "کیا تم نے سکندر کو نہیں بتایا؟"

سکندر نے چونک کے اسے دیکھا۔ "کیا؟"

جولیانہ کھنکھاری۔ پھر سکندر کی طرف دیکھا۔ "ڈیڈ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تالیہ نے ماما کا قتل نہیں کیا تھا۔ جو کیک وہ بھیجتی تھی، وہ میں نے خود دیکھے تھے۔ ان پہ آئسنگ نہیں ہوتی تھی۔ اور زہر آئسنگ میں تھا۔ کیک میں نہیں۔ آئسنگ کوئی بعد میں چھڑکتا

تھا۔"

سکندر چند لمحے الجھن سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر فاتح کی طرف رخ کیا۔ "کون؟"

"دیکھو سکندر... تمہاری ماما کے ایک پرانے ملازم کا آج سراغ ملا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تالیہ بے گناہ ہے۔ وہ گواہی دے گا اور تالیہ بری ہو جائے گی۔ یہ اتنا سمپل ہے۔"

سکندر نے دونوں ابرو سوالیہ انداز میں اٹھائے۔ "یعنی تالیہ مراد بے قصور ہے اور اصل گواہ سامنے آنے والا ہے؟"

"ہاں۔"

"میں جولیانہ نہیں ہوں' ڈیڈ جو میں اس بات کا یقین کرلوں گا۔" وہ ایک دم پھنکارا۔ "یہ تالیہ مراد کی کہانیوں میں سے ایک ہے۔ اس کے پاس بہت پیسہ ہے۔ وہ کسی کو بھی خرید سکتی ہے۔"

"سکندر...." فاتح نے گہری سانس لے کر اس کو پکارا۔

"اس نے میری ماں کا قتل کیا ہے۔ میں بس یہی جانتا ہوں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں تمیز سے اس ڈنر میں بیٹھوں تو میں بیٹھ جاؤں گا۔ میں اس کو برداشت کرلوں گا۔ لیکن آپ مجھ سے یہ امید نہ رکھیں کہ میں اس کہانی میں آؤں گا۔" وہ پیر پٹخ کے اٹھا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ بادل زور سے گرجے اور کھڑکیوں کے باہر بجلی چمکی۔ اگلے ہی پل سیاہی پھر سے چھا گئی۔ فاتح نے افسوس سے اس کو جاتے دیکھا۔ "اس کو کیا ہو گیا ہے؟"

"کیا اب آپ تالیہ کو نہیں بلائیں گے؟" جولیانہ نے تذبذب سے پوچھا۔

"ظاہر ہے میں اسے بلاؤں گا۔ تالیہ فیملی ہے اور ہمارے گھر میں اس کی جگہ ہمیشہ رہے گی۔" وہ مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا تو جولیانہ مسکرا دی۔

"مجھے تالیہ مراد تھوڑی بہت یاد ہے۔ مجھے وہ ہمیشہ اچھی لگتی تھی۔" وہ سادگی سے بولی تو فاتح مسکرا دیا۔

ادھر سکندر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے غصے سے اندر داخل ہوا تو دیکھا۔ اسٹڈی چیئر پہ اشعر ریلیکس انداز میں بیٹھا ہے۔ جینز پہ جرسی شرٹ پہنے' وہ ہاتھ میں سکندر کی گیند گھما رہا ہے۔ سکندر نے دروازہ بند کیا اور بگڑے تاثرات کے ساتھ بیڈ کے کنارے بیٹھا۔ کشن کو ٹھوکر ماری۔

"تو یہ سچ ہے؟ تالیہ مراد آج ڈنر ہمارے ساتھ کرے گی؟" اشعر گیند کو دیکھتے ہوئے بولا تو سکندر نے اسے گھورا۔

"ڈیڈ کو نظر کیوں نہیں آرہا؟"

"کیونکہ وہ ان کا بلائنڈ اسپاٹ ہے۔ تم اسے نہیں جانتے۔ میں جانتا ہوں۔" اس نے گیند رکھی اور سنجیدہ آواز میں اسے سمجھانے لگا۔ "تمہارے ڈیڈ زندگی کے اس حصے میں بہت اکیلے ہیں۔ ان کو تالیہ کی صورت میں ایک لائف پارٹنر مل رہا ہے۔ اور اس میں کوئی برائی نہ ہوتی اگر وہ کاکا کا قتل نہ کر چکی ہوتی۔"

"آپ سارا وقت مجھے ہی بولتے رہتے ہیں۔ ڈیڈ کو سمجھاتے کیوں نہیں ہیں؟" وہ زچ ہو کے بولا۔ اشعر نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے۔

"تمہارے ڈیڈ سمجھانے کی حدود سے نکل گئے ہیں۔ یہ لڑکی خطرناک ہے' سکندر۔ یہ تمہارے ڈیڈ کو نقصان پہنچانے کے لیے ان کی زندگی میں داخل ہوئی ہے۔ میں بتا رہا ہوں۔ اب تمہیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔" وہ افسوس سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ "ورنہ تم ہر دوسری شام اس کے ساتھ ایک ہی میز پہ ڈنر کرنے پہ مجبور ہو گے۔"

اشعر چلا گیا اور سکندر دروازے کو گھورتا رہا۔

☆☆☆

جس وقت داتن اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی' لونگ روم کی کھڑکیوں کے باہر شام اترتی دکھائی دے رہی تھی۔ بجلی وقفے وقفے سے چمک رہی تھی۔ دروازے کا میکینیشن کوڈ اسے معلوم تھا۔ تالیہ نے پہلے سے بتا رکھا تھا۔ وہ اندر آئی۔ اپنا بیگ صوفے پہ ڈالا۔

تالیہ کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ پھر دیکھا.... بیڈروم کا دروازہ کھلا تھا۔

"تالیہ.... تال..." وہ جو مگن سی اسے پکارتی اندر آرہی تھی۔ چوکھٹ پہ ٹھٹک کے رک گئی۔

تالیہ ڈریسنگ مرر کے سامنے کھڑی تھی۔ مرر کی سفید وینٹی لائیٹس روشن تھیں۔ ان کی تیز روشنی میں وہ کوئی سفید مورت لگ رہی تھی۔ وہ بالوں کے جوڑے میں پنیں لگا رہی تھی۔ آواز پہ پلٹی۔ اسے دیکھ کے داتن متحیر رہ گئی۔

وہ سفید اور سلور انڈین ساڑھی میں ملبوس تھی۔ بالوں کا ڈھیلا جوڑا بنائے... چھوٹی گھنگریالی لٹیں گالوں پہ گرائے... وہ گہرا کاجل لگائے تیار تھی۔ گردن میں ہیروں کا نازک نیکلیس پہن رکھا تھا اور کانوں میں سرخ یاقوت جڑے بندے تھے۔ داتن کو دیکھ کر وہ اداسی سے مسکرائی۔

"تم...... کتنی حسین لگ رہی ہو تالیہ۔"

"دبلی ہو کے تم بھی اچھی لگتی ہو۔" وہ مسکرا کے آئینے کی طرف مڑ گئی۔ پھر برش پہ ذرا سا پاؤڈر لیا اور گال کی اونچی ہڈی پہ پھیرنے لگی۔

"تم فاتح کے گھر جارہی ہو؟" داتن آہستہ سے اس کے عقب میں آکھڑی ہوئی۔

"ہوں۔ تم نے میشا کو چیک کیا؟"

"ہاں۔" داتن کی آواز میں مایوسی تھی۔ "سوری تالیہ لیکن اس کے بارے میں کوئی قابل گرفت بات نہیں معلوم ہوئی۔ وہ وہی ہے جو وہ خود کو کہہ رہی ہے۔ ایک سنگل مدر۔ ایک فوٹوگرافر اور ٹیچر۔ لوگ اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔"

"تم نے ٹھیک سے دیکھا نہیں ہوگا۔ اس کے فنانشلز.... اس کا شناختی کارڈ....." تالیہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔

"سب چیک کیا ہے۔ سب صاف ہے۔ وہ ایک سادہ اور بے گناہ عورت ہے۔ وہ کوئی کون وومن نہیں ہے۔"

"اونہوں۔" تالیہ اس کی طرف گھومی اور سنجیدگی سے بولی۔ "وہ بہت ہوشیار ہے۔ دوبارہ چیک کرو۔ کچھ مل جائے گا۔"

داتن نے ملال سے اسے دیکھا اور گہری سانس بھر کے رہ گئی۔ تالیہ نے پرس اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"تالیہ.... تمہارے پاس میشا کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کیا فاتح تمہارا یقین کرے گا؟"

تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ باہر نکل گئی۔ شاید اس کے پاس جواب نہیں تھا۔

"دھیان سے جانا تالیہ۔ آج موسم خراب ہے۔" مگر تالیہ نے نہیں سنا تھا۔ وہ سننے کی حدود سے باہر تھی۔

وان فاتح کی رہائش گاہ سری پردھانہ جیسی نہ تھی۔ بس ایک بڑا سا بنگلہ تھا جس کے چاروں اطراف وسیع و عریض لان بنا تھا۔ فرنٹ پہ ایک نیلا تالاب بھی تھا جس کے ساتھ اس وقت ایک کرسی رکھی تھی اور وان فاتح اس پہ بیٹھا سیاہ آسمان کو دیکھ رہا تھا جب کار اندر داخل ہوئی۔ وہ مسکرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سیدھی اس کی طرف آئی تھی۔ تھوڑی سی نروس۔ تھوڑی سی خوش۔ وہ ملی جلی کیفیت کا شکار لگتی تھی۔ سفید ساڑھی میں ملبوس وہ اس سیاہ رات میں دمک رہی تھی۔

وہ چند قدم آگے بڑھا۔ چند قدم وہ قریب آئی۔ یہاں تک کہ دونوں سوئمنگ پول کے کنارے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آرکے۔

"خوش آمدید۔ مجھے خوشی ہے کہ تم آگئیں۔" وہ اسے دیکھ کے گہری سانس لے کر بولا۔ تالیہ نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ کو شک تھا میرے آنے پہ؟"

"شک نہیں تھا۔ ڈر تھا۔"

"لیکن آپ نے ہی کہا تھا کہ کچھ لوگوں کو ان لو کرنا آسان نہیں ہوتا۔" وہ مسکرائی۔ اس کے گال پہ ننھا سا گڑھا بنا۔ اس کے کانوں کے سرخ یاقوت چمکے۔ تالاب کی سطح پہ پڑتی روشنی تالیہ کے چہرے

سے ٹکرا کے اسے مزید روشن بنا رہی تھی۔
"ویسے ریکارڈ کے لیے.... کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کن لوگوں کی بات کر رہے تھے آپ؟"
وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ "میں تمہاری بات کر رہا تھا۔ تالیہ مراد کی۔ جسے اَن لو کرنا آسان ہے نہ بھلانا۔"
اسے محسوس ہوا کہ اس کی ہتھیلیاں نم ہو رہی ہیں لیکن بظاہر وہ مسکراتی رہی۔ وسط لان کے وہ دونوں چمکتے ہوئے پول کے کنارے کھڑے تھے۔ آسمان کے تاروں اور پول کے پانی سے بالکل بے نیاز۔
"کیا آپ واقعی مجھے بھول نہیں پائے؟" اس کی آواز میں نمی در آئی۔ آنکھیں فاتح پہ جمی تھیں۔
"تالیہ تمہیں کوئی کیسے بھول سکتا ہے؟ میں تو کبھی نہیں۔" وہ صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔ "ہم نے اپنی دنیا میں گیارہ دن ایک دوسرے کو جانا تھا۔ پھر ہم چار ماہ کے لیے قدیم ملاکہ چلے گئے تھے۔"
"پھر اپنی دنیا میں ہم چھ ماہ کے لیے واپس آئے۔ اور پھر.... ایک ماہ ہم نے قدیم ملاکہ میں گزارا۔" اس نے فاتح کا فقرہ مکمل کیا۔
"ہاں۔ اور کل ملا کے کتنا ہوا؟ ایک برس بھی نہیں۔" اس نے انگلیوں پہ گنا۔ "میں تمہاری زندگی میں ایک برس رہا تھا شاید۔ تم میری زندگی میں اس کے بعد بھی چھ برس تک رہی ہو۔ میں نے ایک لمبا عرصہ تالیہ مراد کی یاد میں گزارا ہے۔ میں تمہیں کئی دفعہ کھو چکا ہوں۔ اب کی بار میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔"
وہ ٹھہرا۔ تالیہ کا سانس رک گیا۔ "کیا ہم پھر سے شروع کر سکتے ہیں؟"
"غلام اور شہزادی کی حیثیت سے؟ یا سلطان ساز اور راجہ کی بیٹی بن کے؟ یا پھر.... باس اور ان کی باڈی وومن؟" وہ بظاہر مسکرا کے بولی البتہ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس کا چہرہ دہکنے لگا تھا۔
"نہیں۔ ایک فیملی بن کے۔" وہ اپنائیت سے بولا۔ "تم میری فیملی ہو تالیہ۔ ہاں ٹھیک ہے.... وہ رشتہ ہم نے مجبوری میں جوڑا تھا۔ چھ برس گزر چکے ہیں۔ تمہارے اوپر کیس چل رہا ہے اور میں پردھان منتری ہوں لیکن....." اس نے گہری سانس لی۔
"ہماری کہانی ان چیزوں سے بالاتر رہی ہے۔ ہم نے زمانوں کا سفر ایک ساتھ کیا ہے۔ تم نہیں تھیں تو الگ بات تھی۔ لیکن اب تم آ گئی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم دوبارہ کہیں جاؤ۔"
تالیہ کے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹکنے لگا۔ آنکھوں میں گلابی پن در آیا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"
"میں چاہتا ہوں کہ تم کہیں نہ جاؤ۔ یہیں رہو۔ میرے ساتھ۔ میرے گھر کا حصہ بن کے۔ کیا ہم ہر چیز دوبارہ سے شروع کر سکتے ہیں؟" وہ بنا پلک جھپکے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے پوچھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک ڈر سا تھا۔ اور وہ یہ محسوس کر سکتی تھی۔
"مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ.... آپ کو کسی چیز کا ڈر ہے۔"
"ہاں۔" اس نے اعتراف کیا۔ "مجھے چھ برس اس بات کا خوف رہا ہے کہ تم کہیں چھپ گئی ہو اور ایک دن اچانک سے مجھے ڈاک میں ڈائیورس پیپرز بھجوا دو گی۔ اور مجھے تمہاری خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں سائن کرنا پڑے گا۔ اور میں تمہیں ایک دفعہ پھر کھو دوں گا۔" اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔ اپنائیت تھی۔ وہ ایک دم پرسکون سی ہو کے ہنس دی۔ اس کے سارے واہمے' سارے خدشات جیسے دور بھاگ گئے۔
"میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔"
"یعنی تم میری زندگی کا حصہ بننے کے لیے تیار ہو؟"
تالیہ جواب میں کچھ کہنے لگی لیکن پھر فاتح کے عقب میں اس نے دیکھا.... پول کے دوسرے کنارے پہ ایک ہرن کھڑا تھا۔ رات کی تاریکی میں اس کی سفید جلد چمک رہی تھی۔ وہ اپنی سبز آنکھوں سے تالیہ کو دیکھے جا رہا تھا۔
"تالیہ؟"

"ہوں؟" وہ چونکی۔ پھر مسکرا دی۔ "میں آپ کو اپنا جواب ڈنر کے اختتام پہ بتا دوں گی۔"

"اوکے۔" فاتح کھل کر مسکرا دیا۔ آؤ.... میں تمہیں اپنے بچوں سے ملواتا ہوں۔" تالیہ نے اس طرف نظریں موڑیں۔ اب وہ ہرن وہاں نہیں تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور فاتح کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

سیاہ آسمان اپنے پروں پہ ستارے پھیلائے ان کو خاموشی سے اوپر سے دیکھتا رہا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اب بنگلے کی عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ وہ آپس میں کچھ کہہ بھی رہے تھے۔ کسی بات پہ فاتح ہلکا سا ہنسا بھی تھا۔

سکندر نے کھڑکی سے یہ منظر ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ اس کی رنگت سیاہ پڑ رہی تھی اور ماتھے پہ بل تھے۔

☆☆☆

ایڈم بن محمد کا اسٹڈی روم شام ہوتے ہی سفید روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں سے باہر پھیلتا جامنی اندھیرا دکھائی اور گرجتے بادل سنائی دے رہے تھے۔ اسٹڈی ٹیبل پہ کھلے لیپ ٹاپس' فونز اور فائلیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔

احمد نظام ایک لمبی گفتگو کے بعد اب کھڑے ہو رہے تھے۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے انہوں نے اپنے ساتھ اٹھتے تھکے تھکے سے ایڈم سے پوچھا۔

"کیا وان فاتح نہیں جانتے کہ یہ شخص کہاں رہتا ہے جو مسز عصرہ کے ساتھ جیولر کی دکان پہ گیا تھا؟"

"نہیں۔ انہوں نے میری ای میل کے جواب میں بس اتنا بتایا ہے کہ وہ ایک زمانے میں عصرہ کے والد کا ملازم تھا۔ اس کا نام سرمد ہے۔ اس کو کئی دفعہ انہوں نے اپنے گھر آتے دیکھا لیکن ان کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ عصرہ کی موت کے بعد وہ کبھی نہیں آیا۔"

"میں نے چند لوگوں کو کہہ رکھا ہے۔ اگر وہ آدمی ملک سے فرار نہ ہو گیا ہو تو جلد ہمارے سامنے ہو گا۔ تالیہ مراد کی بے گناہی صرف وہی ثابت کر سکتا ہے۔" وہ امید سے کہہ رہے تھے۔ ایڈم اداسی سے مسکرا دیا اور کندھے اچکا دیے۔ وہ اپنے تئیں سب کچھ کر چکے تھے۔

وہ رخصت ہو گئے تو وہ دروازہ بند کر کے لونگ روم میں آیا۔

اس کا اپارٹمنٹ بالکل خاموش تھا۔ دیواریں' فرنیچر' ٹی وی کی بجھی اسکرین.... وہ جب بھی اکیلا ہوتا یوں لگتا یہ ساری چیزیں ٹھوڑی تلے ہتھیلی جمائے فرصت سے اسے دیکھ رہی ہیں۔ اس پہ طنز کر رہی ہیں۔

وہ صوفے پہ بیٹھا اور پیر میز پہ رکھ لیے۔ پھر گردن پیچھے ٹکا کے خاموشی سے چھت کو دیکھنے لگا۔

تالیہ کے بعد اس نے کبھی دوست نہیں بنائے تھے۔ دوست قسمت سے ملتے ہیں۔ جس کو نہیں ملتے' اس کو نہیں ملتے۔ دوست سے قریب قریب کوئی رشتہ مل بھی جائے' تو بھی وہ دوست نہیں ہوتا۔

اس وقت اسے ایک دوست کی ضرورت تھی۔ اور اس ساری دولت' شہرت اور عزت کے باوجود ایڈم بن محمد جانتا تھا کہ اس کے پاس کوئی دوست نہیں تھا جس سے وہ دل کی بات کہہ سکے۔ جو اسے جج نہ کرے۔ جس کے ساتھ وہ خود کو آرام دہ محسوس کرے۔

گھنٹی بجی تو اس نے گہری سانس لی اور اٹھ کے دروازے تک آیا۔ انٹر کام اسکرین کو دیکھنے کی زحمت بھی محسوس نہ کی۔ وہ جانتا تھا احمد نظام واپس آئے ہوں گے۔ یقیناً وہ کچھ بھول گئے تھے۔

اس نے دروازہ کھولا اور.... پھر وہ اگلا سانس لینا بھول گیا۔

پہلے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ پھر بے یقینی سے آنکھیں پھیلیں۔

"داتن؟" اس کے ہونٹوں سے بے آواز نکلا۔

"کیسے ہو' رائٹر؟" لیانہ صابری مسکرائی۔ وہ

ویسی ہی تھی۔ وہی بال۔ وہی مسکراتا چہرہ۔ وہی بے نیاز انداز۔ اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ بالکل ویسی نہیں تھی۔

"آپ..... کیسے؟ اتنے عرصے بعد؟" ششدر سے ایڈم نے چوکھٹ چھوڑ دی۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ اسے روک بھی نہ سکا۔ وہ اتنا شل تھا۔

"میں نے سوچا تمہاری یادداشت واپس آجائے' پھر آؤں گی۔" وہ طنزیہ کہتے ہوئے صوفے پہ بیٹھی۔ وہ متحیر سا اس کے پیچھے چلا آیا۔

"میری یادداشت....." لمحے بھر کو وہ بھول ہی گیا تھا۔ پھر سر جھٹکا۔ "وہ تو بس....."

"ہاں ہاں..... وہ تو بس اپنے دوستوں کو خود سے دور رکھنے کا بہانہ تھا۔ اگر تم نے وہ سب نہ کیا ہوتا تو میں بہت پہلے آجاتی۔ گھر اچھا ہے تمہارا۔ کتنا کما لیتے ہو؟" اب وہ گردن موڑ موڑ کے اس کے اپارٹمنٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔ وزن کم ہوا تھا۔ عادتیں نہیں بدلی تھیں۔ ایڈم ایک دم ہنس دیا۔

"جیسے آپ اب تک میرے بینک اکاؤنٹس کو کھنگال نہیں چکی ہوں گی۔"

"میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔" وہ دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔ "تاکہ مجھے بھی معلوم ہو کہ میرے دوست کتنے دولت مند ہیں۔"

"آپ میری دولت کی لالچ میں یہاں نہیں آئیں' داتن۔ آپ میرے لیے آئی ہیں۔" وہ مسکرا کے اس کے سامنے بیٹھا۔

"اور میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میں کتنا خوش ہوں۔ کچھ دیر پہلے میں سوچ رہا تھا کہ میں خود میں کتنا اکیلا ہوں۔ لیکن نہیں۔ اچھا ہوا جو اتنے سال میں نے جھوٹے دوست نہیں بنائے۔ انسان کے دوست کم ہوں تو بھی وہ ایک نعمت ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے کھوٹے لوگوں سے محفوظ رکھا ہوتا ہے۔"

وہ اتنی صاف گوئی سے کہہ رہا تھا کہ داتن نے ابرو اچکا کے اسے دیکھا۔

"تم نے سچ بولنا نہیں چھوڑا' ایڈم بن محمد۔ میں سمجھی تھی اب تک اس دنیا سے کچھ سیکھ چکے ہو گے۔"

اور ایڈم بے اختیار ہنس دیا۔ ایک عرصے بعد اس کے سامنے کوئی آیا تھا جس کے لیے وہ ایک سیلیبریٹی نہیں تھا۔ تالیہ کی بات اور تھی۔ لیکن داتن... داتن کے لیے وہ برابر کا ایک دوست تھا۔

☆☆☆

سکندر ان دونوں کو آتے دیکھ کے اندر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ملازم اسے بلانے آیا تو وہ تیوریاں چڑھائے باہر آیا۔

تالیہ اس وقت لاؤنج کے ایک سنگل صوفے پہ بیٹھی تھی۔ دوسرے پہ فاتح بیٹھا تھا۔ وہ مسکرا کے سامنے بیٹھی جولیانہ کو تالیہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ جن دنوں وہ وان فاتح کی چیف آف اسٹاف تھی اور کس طرح وہ ہر کرائسسز میں کوئی نہ کوئی حل نکال لیتی تھی۔ جولیانہ مسکرا کے سن رہی تھی۔ اس کے انداز سے تالیہ کا اعتماد بڑھا تھا۔ اور تب اس نے سکندر کو آتے دیکھا۔ اس نے مسکرا کے سر کے خم سے سکندر کو گڈ ایوننگ کہا۔ وہ بظاہر ایک اٹھارہ انیس برس کا لڑکا تھا لیکن اس کے ماتھے کے بل اتنے پکے تھے کہ تالیہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ اس نے فوراً فاتح کو دیکھا۔ فاتح نے سکندر کے انداز کو دیکھ لیا تھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ بہت وقار سے اس کو نظر انداز کر گیا تھا۔

لاؤنج میں ایک دم تناؤ کی سی کیفیت در آئی۔ ایسے میں جولیانہ نے فضا کو خوش گوار بنانے کی کوشش کی۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ ہمارے گھر آئیں۔ مجھے تھوڑا تھوڑا آپ کا ہمارے گھر میں آنا یاد ہے۔" وہ آگے ہو کے بیٹھی' ہاتھ باہم ملائے قدرے شرما کے بولی۔

"مجھے بھی یاد ہے۔" سکندر سرد سا بولا۔ "بالخصوص جب آپ ماما کے انتقال والے دن آئی تھیں۔ شور کی آواز سارے گھر نے سنی تھی۔"

تالیہ کی رنگت زرد ہوئی۔ اس نے فاتح کو دیکھا۔ اس کے ماتھے پہ شکن در آئی تھی۔ مگر سکندر

اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ تالیہ کی طرف متوجہ تھا۔

''ویسے آپ اتنے سال کہاں تھیں؟'' لہجہ بالکل ٹھنڈا اور سپاٹ تھا۔

''میں جہاں تھی' اپنی مرضی سے نہیں تھی۔'' وہ مدھم سا مسکرا کے بولی۔ اس عورت میں ایک مقناطیسی قوت تھی۔ وہ دیکھتی تھی تو سامنے والا خود بخود سب بھول کے اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ لیکن سکندر کی آنکھوں کی چبھن غائب نہیں ہوئی۔

''میں نے سنا ہے آپ نے میری ماما کے سارے نوادرات بیچ دیے ہیں۔''

''ہاں۔ وہ اب مجھ سے بہتر کلیکٹرز کی ملکیت ہیں۔ میں ان کی حفاظت ویسے نہیں کر سکتی جیسے وہ کریں گے۔''

ماحول کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ فاتح خاموشی سے ان دونوں کو بات کرتے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتی منتظر تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو ٹوکے گا لیکن اس نے مداخلت نہیں کی۔

''بہت مہنگے بکے ہوں گے وہ۔'' سکندر کا انداز عجیب تھا۔

''بہت۔'' اس کی مسکراہٹ اب بالکل غائب ہو چکی تھی۔

''آپ خوش ہوں گی۔''

''میں کورٹ میں ایک کیس کا سامنا کر رہی ہوں۔ ابھی خوشی منانے کا وقت نہیں ملا۔'' وہ سپاٹ انداز میں بولی۔ وہ جس طرح صوفے کے کنارے بیٹھی تھی' اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ شدید غیر آرام دہ محسوس کر رہی ہے۔

''معلوم نہیں آپ کی کب اس سے جان چھوٹے گی۔'' سکندر کے کچھ بولنے سے پہلے جولیانہ تیزی سے بولی۔ گویا تناؤ کم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

''چھوٹ جائے گی۔'' فاتح نے اسی اطمینان سے کہا۔ ''ویسے بھی تالیہ ہمت نہیں ہارا کرتی۔''

تالیہ پھیکا سا مسکرا دی۔ اس کی شام بدمزہ ہو چکی تھی۔

''میں نے تالیہ کو اس لیے انوائیٹ کیا ہے کیونکہ....'' فاتح اسی نرم مگر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''تالیہ ہمارے لیے فیملی ہے۔ اور میں تالیہ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس گھر میں اس کے لیے جگہ ہمیشہ رہے گی۔''

سکندر نے محض کندھے اچکا دیے۔ جولیانہ نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں آتی ہوں۔''

ان کو وہیں چھوڑ کے جولیانہ وہاں سے نکلی اور راہداری کی طرف چلی آئی۔ ایک کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا تو ہیشا کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ بالوں کو ہیئر بینڈ میں باندھتے ہوئے مسکرا کے بولی۔ ''آؤ جولی۔''

''ایمی سو گئی؟'' جولی نے پیچھے سے کمرے میں جھانکا۔ ہیشا نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔ ''ہاں۔ کیوں؟ کوئی کام تھا؟''

''آپ باہر آجائیں نا۔ تالیہ آئی ہے۔'' پھر وہ ہچکچائی۔ ''مجھے تالیہ کے آنے پہ کیسا فیل کرنا چاہیے؟''

''مطلب؟''

''مجھے لگتا ہے تالیہ اور ڈیڈ شادی کرنے جا رہے ہیں۔ اگر آپ کے والد سنگل ہوں اور آپ کو کسی لڑکی سے ملوائیں تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے نا۔''

''کیا تم خوش ہو؟'' ہیشا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ جولیانہ نے اس کے ہاتھ تھامے اور الجھن سے پوچھا۔

''کیا مجھے خوش ہونا چاہیے؟''

''ہاں' جولی۔ تمہیں ایک اچھی لڑکی کی طرح نا صرف خوش ہونا چاہیے بلکہ ان کو سپورٹ کرنا چاہیے۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''دیکھو میں ایک سنگل پیرنٹ ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ سنگل پیرنٹ ہونا کیسا ہوتا ہے۔ تمہاری ماما کی ڈیتھ کو بھی اتنے سال ہو گئے ہیں۔ تمہیں ان کی خوشی میں خوش ہونا چاہیے۔''

''ہاں۔ مجھے خوش ہونا چاہیے۔ ویسی بھی مجھے تالیہ اچھی لگتی ہے۔'' جولیانہ کھل کے مسکرا دی۔ ''اور اگر ڈیڈ اس کے ساتھ خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔''

اس کے پیچھے لاؤنج میں تناؤ کی کیفیت ویسے ہی برقرار تھی۔ پھر سکندر نے ایک دفعہ پھر سامنے بیٹھی تالیہ کو مخاطب کیا۔ فاتح نے بات کا آغاز پھر سے کرنا چاہا تو سکندر نے اچانک سے بات کاٹی۔

''ویسے آپ اس سے پہلے کیا کرتی تھیں؟''

''سکندر۔'' وان فاتح کا ضبط اب جواب دے گیا تھا۔ اس نے برہمی سے اسے تنبیہ کی۔

''میں نے صرف ان کی جاب پوچھی ہے۔'' وہ شانے اچکا کے بولا۔

تالیہ مسکرائی۔ اب کے یہ مسکراہٹ مصنوعی نہیں تھی۔ تلخ تھی۔

''وہی کرتی تھی جس کے بارے میں اشعر نے تمہیں بتایا ہوگا۔ اور یقیناً بہت کچھ بتایا ہوگا۔''

اب کے فاتح نے قدرے تعجب بھری ناراضی سے تالیہ کو دیکھا۔ ''تالیہ! کیا ہم کسی اور موضوع پہ بات نہیں کر سکتے؟''

''مگر مجھے لگ رہا ہے کہ سکندر کو مجھ سے بہت سے سوال پوچھنے ہیں۔ آپ اسے پوچھنے دیں۔'' اس کا لہجہ اب کے زخمی تھا۔

سکندر نے ایک ناراض نگاہ باپ پہ ڈالی' پھر کچھ بڑبڑاتے ہوئے اٹھا اور سیدھا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

تالیہ نے گلہ آمیز نظروں سے فاتح کو دیکھا۔

''آپ نے کہا تھا آپ کے گھر میں میرے لیے جگہ ہے۔'' کچھ دیر پہلے کی چمکیلی رات کا فسوں اب تک غائب ہو چکا تھا۔

''میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔'' وہ آگے ہو کے بیٹھا اور اسی سنجیدگی سے تالیہ کو دیکھا۔ ''میری زندگی میں تمہاری جگہ کا تعین میں نے کرنا ہے۔ میرے بچوں نے نہیں۔ ہمیں اپنے فیصلے کسی دوسرے کے مطابق نہیں بدلنے۔ دوسروں کو ان فیصلوں کے مطابق خود کو تبدیل کرنا ہوتا ہے۔''

وہ کچھ کہنے لگی لیکن خاموش ہونا پڑا۔ راہداری سے میشا اور جولیانہ آ رہی تھیں۔

''ہے تالیہ.... آپ کو یہاں دیکھ کے بہت خوشی ہوئی۔'' میشا گرمجوشی سے اس کے قریب آئی۔

تالیہ نے سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا اور محض سر کے خم سے سلام کہہ دیا۔ وہ جو تیزی سے آگے آ رہی تھی کہ تالیہ سے مصافحہ کرے' خفیف سی ہو کے وہیں رک گئی۔ پھر سر جھکا کے سلام کہا۔

''بیٹھیے' میشا۔'' فاتح نے بغور اس کے انداز کو دیکھا اور پھر میشا کی خفت دور کرنے کو کہا۔ ''تالیہ .... یہ میشا ہیں۔ جولیانہ کی ٹیچر۔ اور ہمارے لیے فیملی کی طرح ہیں۔''

''جی۔ میں ان کو جانتی ہوں۔'' تالیہ کے چہرے پہ ایک تلخ مسکراہٹ در آئی۔ (فیملی کی طرح؟ واہ اتنا آسان ہے کسی کو فیملی بنا لینا؟)

''جی۔ ہم نمائش پہ ملے تھے۔'' میشا سامنے والے صوفے پہ بیٹھی اور مسکرا کے کہنے لگی۔ وہ اخروٹی بالوں کو پونی میں باندھے ہوئے تھی۔ گلابی باجو کرنگ پہنے' سر پہ اسٹول اوڑھے وہ سادہ سے حلیے میں بھی کافی دلکش لگ رہی تھی۔

''آپ یہاں رہ رہی ہیں' مسز میشا؟'' تالیہ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جولیانہ بغور تالیہ کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ وہ میشا کے ساتھ صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

''جی۔ کچھ دن کے لیے۔'' اس کی گہری چبھتی نظروں کے جواب میں میشا کی نظروں میں صرف اپنائیت اور سادگی تھی۔

(یہ سب ایک ناٹک ہے!) اس نے افسوس سے سر جھٹکا اور فاتح کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کیا آپ کا سیکیورٹی پروٹوکول آپ کو خونی رشتے داروں کے سوا کسی اور کو یوں گھر میں ٹھہرانے کی اجازت دیتا ہے؟''

''یہ فیصلہ گھر کے سربراہ کو کرنا ہوتا ہے' تالیہ۔ سیکیورٹی آفیسر کو نہیں۔'' اب کے وہ تنبیہ کرنے والے انداز میں بولا۔ اسے جیسے تالیہ کے رویے کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ییشا کی خفت میں اضافہ ہونے لگا۔

''آپ لوگ بیٹھیں۔ میں بس سونے جا رہی تھی۔'' وہ اٹھنے لگی تو جولیانہ نے روک دیا۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟ ڈیڈ نے کہا تھا سب کھانا اکٹھا کھائیں گے۔''

ییشا متذبذب سی واپس بیٹھی۔ پھر سفید ساڑھی والی لڑکی کو دیکھا جو اسے یوں گھور رہی تھی جیسے اس کے اندر تک اتر جائے گی۔

''جی مسز ییشا.... آپ بیٹھیے۔'' تالیہ ان ہی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ویسے بھی مجھے آپ سے آپ کی فوٹوگرافز کے بارے میں ایک بات پوچھنی تھی۔'' ساتھ ہی وہ ذرا سا مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ سے ماحول کا تناؤ قدرے کم ہوا۔

فاتح کے ماتھے کی شکنیں بھی ڈھیلی ہوئیں۔ ییشا کا چہرہ کھل اٹھا۔

''اوہ رئیلی.... آپ کو میرا کام کیسا لگا؟''

''بہت اچھا۔ کتنے عرصے میں یہ فوٹوگرافز کھینچی تھیں آپ نے؟''

''قریباً چھ ماہ میں۔'' وہ خوش دلی سے بتانے لگی۔ ''مجھے گھوڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں جہاں کوئی گھوڑا دیکھتی اس کی تصویر کھینچ لیتی۔''

''انٹرسٹنگ۔ ویسے آپ نے کبھی گھوڑے پالے ہیں؟''

ییشا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔''

''میں نے پالے ہیں۔'' وہ نظریں ییشا سے ہٹائے بغیر بولی۔ ''اور جو گھوڑے نہیں پالتا اس کو لگتا ہے کہ سارے گھوڑے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جیسے دوسری قوموں کے لوگ ہمیں ایک جیسے لگتے ہیں۔ سارے چائنیز' سارے افریقی ایک سی شکلوں والے لگتے ہیں لیکن ان میں رہو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کی شکل مختلف ہے۔ ایسے ہی ہر گھوڑے کا چہرہ اور جسم مختلف ہوتا ہے۔ مجھے گھوڑوں کی شکلیں یاد رہتی ہیں۔''

''اچھا۔ گڈ۔'' ییشا کو جیسے اس بات کی میں سمجھ نہیں آئی تھی۔ تالیہ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

''یو نو... میں ویسے ہی ایک سنگاپورین فوٹوگرافر پیٹر ہوانگ کا کام دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی سیاہ گھوڑوں کی تصاویر لیتا ہے۔ آپ کی اور اس کی تصاویر میں صرف پس منظر کا فرق تھا۔ گھوڑے ایک سے تھے۔ ان کے کھڑے ہونے کا انداز تک ایک ہی تھا۔''

''آپ کہہ رہی ہیں کہ میں دوسرے فوٹوگرافرز کا کام چراتی ہوں۔'' ییشا افسوس سے بولی۔ اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ مجھے سیاہ اور سفید دونوں گھوڑوں کی پہچان ہے۔''

''تالیہ۔'' فاتح نے تعجب سے تنبیہ کی۔ وہ کسی اور مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے تھے مگر گفتگو غلط سمت جا رہی تھی۔

''ایک ہی گھوڑے کی تصویر دو لوگ بھی لے سکتے ہیں۔'' جولیانہ ناگواری سے بولی۔ وہ شام بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔

تالیہ کچھ کہنے والی تھی کہ ییشا سنجیدگی سے بولی۔

''پیٹر کے گھوڑے کا نام رزالی ہے۔ اور پیٹر میرا اچھا دوست اور استاد رہا ہے۔'' ییشا نے فون پہ بٹن دبائے۔ اور ایک تصویر نکال کے اس کے سامنے کی۔ ''یہ پیٹر کھڑا ہے میرے ساتھ اس کی نمائش پہ۔ وہ مجھے گائیڈ کرتا رہتا ہے۔ آپ اس سے بھی پوچھ سکتی ہیں۔ میں نے صرف اس کے گھوڑے کی تصاویر بنائی ہیں۔ اس کا کام نہیں چرایا۔'' وہ سنجیدگی سے وضاحت دے رہی تھی۔ فاتح نے افسوس سے اسے دیکھا۔ تالیہ کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس نے محض شانے اچکائے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نصرت یوسف

رنگِ تعبیر

"رب ایسے بھی من چاہی خواہش پوری کرتا ہے۔"

وہ اپنے ناخنوں پر بنے دلکش ڈیزائن کو دیکھتے سوچ رہی تھی۔ دراز گردن میں فکس سسرال سے آئے چنے برابر ہیروں کی مالا کسی بے آرامی بنا اس کی کھال کے ساتھ چپکی تھی۔ وہ میسرہ رضی تھی۔ رضی الٰہی کی تیسری، بقول ماں باپ کے سب سے ضدی بیٹی، جس نے اپنے لیے آئے ہر رشتے سے انکار کرتے یہ کہا تھا کہ اسے کوئی "پریکٹسنگ مسلم" (عملی مسلمان) چاہیے۔

وہ خود کچھ عرصہ قبل ہی مقامی دینی تنظیم سے جڑنے کے بعد پریکٹسنگ مسلمہ بنی۔ فہم آیا تو سارے ملبوسات نئے سرے سے بنوائے، زندگی کا ڈھب تبدیل کیا۔

حلال کا نظریہ خاصا واضح تھا اس گھر میں، اس لیے سب نے اس کی اس تبدیلی کو نوٹ تو کیا لیکن اعتراض نہیں اٹھایا۔ کسی کی ذاتی پسند ناپسند پر رائے دینا اس کی ذاتیات میں مداخلت گردانا جاتا تھا سو میسرہ رضی نے جب باب ہیئر کٹ پر اسکارف لیا تو کوئی آواز گھر سے نہ اٹھی اور پھر جب سول سروس سے جڑے دامادوں کے بعد میسرہ کے لیے میجر صاحب کے بیٹے کا رشتہ آیا تو اس نے فوراً ہی انکار کردیا۔

"چلو، اچھا ہوا میسرہ نے خود منع کردیا، اس لڑکے میں پینے پلانے کا شوق سننے میں آیا ہے۔"

سلیمہ رضی نے صبح سویرے لان سے توڑے موتیا کے پھولوں کو پیالہ میں بھرتے میاں سے کہا جو راکنگ چیئر پر بیٹھے تسبیح کے دانے گراتے بیوی کی بات سن کر خاموش رہے۔

نوکری بطور شہری ہوابازی کے ایمان دار افسر کرنے پر وہ پچھلے دو برس سے عدالتی مقدمہ بھگت رہے تھے۔ مصالحت ہر وقت سامنے تھی۔ "عہدہ چھوڑ دو یا عہد ایمان داری" دونوں سے رضی الٰہی کے انکار نے معاملہ کو لٹکا رکھا تھا، یہ سال خاصا نازک تھا، کیس جج اچانک تبدیل کردیا گیا، اور اس کا لہجہ اور تاثر دونوں ہی پچھلے جج سے مختلف اور تیکھے تھے۔

ایسے میں میسرہ کی زوج کے حوالے سے فرمائش بھی ان کے لیے دردِسر بن رہی تھی۔ اس کے مطلب کا لڑکا ان کے اردگرد نہ تھا۔

چار بیٹیاں وہ بیاہ چکے تھے، ان کی ایسی کوئی پسند نہ تھی مگر میسرہ دو چھوٹی بہنوں کی شادی بعد بھی "نیک مرد" کے تصور سے دستبردار نہ ہوئی اور نیک مرد تھا کہ کہیں غائب تھا۔ بظاہر اچھے رشتے وہ مسترد کردیتی کہ ان کے ہاں دین نہیں ہے۔

سلیمہ رضی کو میسرہ کی عمر کے ستائیس ویں برس بڑی جدوجہد سے اس کی شرائط پر پورا اترنے والا رشتہ مل ہی گیا۔ لڑکا شہر کے مشہور ہسپتال میں ڈاکٹر، اور والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ناک نقشہ بڑا بھلا تھا، اتنا بھلا کہ میسرہ رضی اس کے سامنے دب سی گئی، لیکن جس چاہت سے رشتہ کی ابتدا ہوئی، میسرہ نے ہر آن الحمدللہ کی تسبیح رواں رکھی۔ اس کا خیال تھا ہر اچھی شے پر نظر لگتی ہے اور اس کا ہونے والا شوہر حمزہ بھی بہت سارے پہلوؤں سے بہت اچھا ہے۔

نسبت طے ہونے سے شادی کے دوران ماہ بھر کا وقفہ تیزی سے گزر کر نکاح اور رخصتی تک پہنچ گیا۔

میسرہ رضی نے گھونگھٹ تو بے شک نہیں نکالا تھا لیکن عروسی کمرے میں پہنچ کر بھی نگاہیں ضرور جھکائے رکھیں، اور پھر حمزہ کی پہلی بات سنتے ہی جس تیزی سے اس کی پلکیں اوپر ہوئیں، دیکھنے والا ان میں بے یقینی صاف دیکھ سکتا تھا۔

"میری چار بہنیں ہیں اور ایک ماں، تم مجھے اپنی پانچویں نند اور دوسری ساس ہی سمجھنا۔"

یہ تھا پہلا جملہ جو نئے دولہا نے اپنی نئی دلہن کی رونمائی کرتے ہی بے حد سنجیدگی سے کہا تو میسرہ رضی کی گزشتہ دو ماہ سے جاری تسبیح کو جھٹکا لگا اور وہ گنگ ہی ہوگئی۔ اسے فوری طور پر سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ شوخی ہے یا سنجیدگی۔

وہ بہت سنجیدہ طبع تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کی توقع نہیں کررہی تھی۔ کوئی میٹھی بات، کوئی شوخ جملہ نہ سہی ایک توصیفی نظر بھی نہیں۔ اس کے دل کو شدید ٹھیس لگی تھی۔

پھر اس کی بات کا مطلب بھی وہ نہیں سمجھ پائی تھی۔ ان ہی سوچوں میں الجھتے پوری رات گزر گئی تھی۔ اس کا کھردرا رویہ اسے بہت چبھا تھا۔

☆☆☆

بڑی بیٹی پابندی سے باپ کو ان کے طبیب کے پاس چیک اپ کے لیے لے کر جاتی، وقت،

سواری، ٹیسٹس رپورٹس سب کے انتظامات اور دیکھ بھال میں اس کے شوہر کا پورا تعاون ہوتا۔

دوسری دن میں دو بار آتی بلا ناغہ...... امی ابو کو تنہائی کا احساس نہ ہو، اس کے شوہر نے اپنے گھر کی اس عارضی بے ترتیبی کا کوئی شکوہ نہ کیا۔ لیکن یہ ان دونوں کے لیے ہی ممکن تھا کیونکہ وہ بالکل خودمختار تھیں۔ یہ دونوں چھوٹیاں اس حد تک نہ کر رہی تھیں اور نہ کر سکتی تھیں۔ میسرہ کا تو ہر ہفتہ آنا ہی بہت تھا۔

جب وہ آتی تو اکیلے ہی آتی، حمزہ شادی کی رسومات کے بعد ساس سسر سے ملا ہی نہیں تھا۔

میکہ میں میسرہ کو طعنے تو نہ دیتا لیکن جب بھی کوئی یہ کہتا کہ ''ان پریکٹسنگ مسلم (باعمل مسلمان) سے تو ہمارے نان پریکٹسنگ گھرانے بہتر'' تو وہ کٹ کر رہ جاتی۔

وہ سب جانتے تھے کہ حمزہ اور اس کے گھر والوں کا اپنا قصور ہے۔ دین کا نہیں، لیکن اخلاق کا علم تھامنے والوں میں کجی دیکھنے والے کے عقیدے کو متاثر کر جاتی ہے۔

میسرہ اپنے گھر کے ماحول کے سبب کھانے پکانے میں خاص طاق نہ تھی، ان سب کاموں کے لیے اس نے آنکھ کھولتے ہی مددگار دیکھے تھے۔

شادی کے بعد اس نے نئے ماحول میں ضم ہونے کے لیے پکانا چاہا تو کم ذائقہ پکانے پر اس کا کچن میں جانا ممنوع کر دیا گیا۔

''بی بی! چیزوں کا ستیاناس نہ کیا کرو، رزق ضائع ہوتا ہے۔''

ساس نے مہنگے ٹماٹروں کی پتیلا بھر چٹنی کو زبان پر رکھتے ہی کڑے تیور سے گھورتے کہا تو وہ گھبرا گئی۔ چٹنی واقعی عجیب سے ذائقہ کی بنی تھی۔

''نہ جانے بوا حنانہ امی کے گھر اسی ترکیب سے کیسے بناتی تھیں؟ ڈھیر بناتی تھیں، اور پھر بھی ختم ہو جاتی تھی دو دن میں۔''

میسرہ نے دکھے دل سے چولھے پر رکھی ٹماٹر کی چٹنی پر افسردہ نگاہ ڈالی، ساس امی کی ڈانٹ نے پیروں کو سن کر دیا تھا۔ تعریف کی امید پر شروع کیا کام سرزنش پر ختم ہو گیا۔

حمزہ کو شام کام سے آ کر پنیر سینڈوچ کے ساتھ ٹماٹر کی طلب ہوئی تو ٹماٹر چٹنی اور رزق کے ستیاناس کرنے کا قصہ بھی دوبارہ چھڑ گیا۔

''بہو بیگم سے کہہ دیا میں نے، کہ آئندہ کچن جانے کی ضرورت نہیں کچھ پکانے کے لیے۔''

امی کی بات سن کر حمزہ نے سینڈوچ پر ہی توجہ مرکوز رکھی اور سامنے بیٹھی میسرہ کے پیر پھر سن ہو گئے۔ اس نے آس بھری نگاہ حمزہ پر ڈالی کہ وہ اس کے لیے کوئی توڑ ڈھال مہیا کرے لیکن اس کی بے تاثر کیفیت سے میسرہ کے دل میں شوہر کے لیے بدظنی پیدا ہو گئی۔

اسے کبھی ترحم والا تعجب ہوتا کہ میسرہ رضی کیا اتنی ارزاں کہ اس سے اس کی ہر مرضی چھین کر بس منکوحہ کا لیبل دیا جائے۔ لیکن اس کی ان باتوں کا جو جواب اس کے میکے کے پاس تھا، وہ دراصل اس کے انتخاب پر ہی اعتراض تھا۔

''سوئیٹ ہارٹ یہ جو نیک دکھتے ہیں نا، یہ ہی سب سے زیادہ فیک نکلتے ہیں۔''

بڑی بہن نے اسے اتنی محبت سے چمٹاتے سرگوشی کی تھی کہ وہ بس اس کو دیکھے گئی۔

''کچھ عرصہ اور دیکھ لو لیکن کوئی فیملی بنانے کی حماقت مت کرنا۔''

''تم سمجھ رہی ہو نا، میں کیا کہہ رہی ہوں؟''

بہن نے میسرہ کے ہاتھ تھامے جو سرد تھے۔

''ہوں!''

رات آئی، لیکن راحت نہ لائی، عورت کو قرب سے قبل محبت مطلوب ہوتی ہے، جو اسے حمزہ سے روز بہ روز گھٹتی جا رہی تھی۔

اسے لگتا وہ ایک خریدی شے کے مانند اس گھر میں ہے، جس پر ہر ایک اپنے حساب سے حاکمیت جتاتا ہے۔ کسی نے بھی اس کی کسی بھی بات کو سراہا نہیں، اس کو الفت سے نوازا نہیں۔ بس ایک حمزہ تھا

جو اس کو نگاہ اور الفاظ کی سوئی نہ چبھوتا لیکن چبھونے والوں سے اسے محفوظ بھی نہ کرتا، ایسے میں میسرہ کا رنگ روپ کیا سنورتا، وہ زرد پڑنا شروع ہو گئی۔
جذبات کی شدت کے دوران میسرہ کا گریز حمزہ پر کھل کر واضح ہونے لگا تھا، وہ چڑ کر اس کے ساتھ تکلیف دہ حرکت کر جاتا، میسرہ کی کھال پر خونیں نشانات جا بہ جا تھے، میسرہ تکلیف سے جب ہوش میں آتی تو اس کا دل چاہتا کہ کاش ایک بل ڈاگ وہ بھی حمزہ پر چھوڑ سکتی لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا اور فیملی بڑھنے کے آثار شروع ہو گئے۔
اسے بہن کی محبت بھری نصیحت یاد تھی سو اس نے زندگی کو بہتر دیکھنے سے قبل اس معاملے کو ختم کرنا مناسب سمجھا۔ وہ اپنے نومولود کو زندگی افزا ماحول میں شیر مادر پلانا چاہتی تھی اور حمزہ کے ساتھ نہ اس پر گل پاشی ہوئی تھی اور نہ اس کے بچے پر۔
بس ذرا سی ہی چوک ہوئی اس سے اور رپورٹ کی ہارڈ کاپی حمزہ کے ہاتھ لگ گئی۔

☆☆☆

وہ میکے گئی ہوئی تھی۔ وہاں امی ابو کے پاس بیٹھی پورے چھ ماہ بعد ہنس رہی تھی۔ شاید دل میں کیے فیصلے نے اسے اتنا شانت کر دیا تھا کہ چہچہاہٹ اس کی آواز میں در آئی تھی۔
"تمہارا انتخاب کیسا رہا میسرہ؟"
ابو نے اتنے اچانک غیر متوقع سوال کیا کہ وہ سوال کا پس منظر سمجھتے بھی سرعت سے بولی۔
"ابو وال ڈیزائن اچھا نہ بنا۔
"میں تمہارے پینٹ کا نہیں تمہارے ہمسفر کا پوچھ رہا ہوں۔"
وہ چپ کی چپ رہ گئی۔
"ابو! زندگی بہت ٹف ہے، اور ٹف نیس کا آخری سرا کدھر ہے، مجھے دکھائی نہیں دیتا۔" اس کی آواز میں آزردگی تھی۔
باپ نے اپنی بیٹی کو بے قرار نگاہوں سے دیکھا جس نے انسان کی نیکی چاہی تھی۔ اور اب وہ غمگین تھی۔
"میسرہ! تم کیا چاہتی ہو اب؟"
وہ چپ رہی۔
"ٹھیک ہے، میں حمزہ سے بات کرتا ہوں، ہو سکتا ہے، بہتری کی کوئی راہ نکل آئے، والدین کی نگاہ بیٹیوں کے حالات پر رہنی بہتر رہتی ہے۔"
میسرہ نے ستے ہوئے چہرے سے باپ کو دیکھا، اسے کہیں موہوم سی امید تھی کہ ابو حمزہ سے اس کی علیحدگی پر سوچیں گے لیکن یہ تو گفتگو کا سوچ رہے ہیں۔

☆☆☆

اسے آئے تیسرا دن تھا، رضی صاحب نے حمزہ کو بڑی محبت سے کھانے کی دعوت دی، جسے وہ کچھ پس و پیش بعد مان گیا۔
حمزہ آیا، کھانا اچھے ماحول میں کھایا گیا، میسرہ سرخ لپ اسٹک کے ساتھ سرخ آویزوں میں بہت دلکش لگ رہی تھی، میاں کی نگاہیں اس پر گاہے بگاہے اٹھتیں مگر وہ بے نیازی سے کھانے اور پھر کام میں مصروف رہی۔
وہ اپنی پسند کے حساب سے تیار ہوئی تھی، حمزہ کی موجودگی سے اسے کوئی فرق نہ پڑ رہا تھا، اس کا دل بہت زخمی تھا۔
"ہاں تو بیٹا! میسرہ آپ کو کیسی بیوی لگیں؟" ابو نے قہوہ پیتے سرسری انداز میں حمزہ کو مخاطب کیا۔
"میسرہ اچھی بیوی نہیں ہیں انکل۔" اس کے اتنے سپاٹ جواب نے کمرے میں یک دم سناٹا طاری کر دیا، سلیمہ رضی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میاں کے تاثرات پہچان کر خاموش رہیں۔
رضی صاحب نے لمحہ بھر کے سکوت کے بعد قہقہہ لگاتے داماد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"میسرہ بیٹی تو بہت اچھی ہے، بیوی اچھی اگر نہیں تو مطلب ہے کہ میاں سے شکایت ہوگی اسے بھی۔ اور بیٹا! مجھے ان ساری شکایتوں کا علم ہے۔"
حمزہ نے پہلو بدل کر میسرہ پر نظر ڈالی اور کھڑا

ہوگیا۔

''ٹھیک ہے جب ان کو شکایتیں نہ رہیں تو بھیج دیجیے گا میرے گھر۔''

رضی اللہ صاحب نے چھڑی کے سہارے کھڑے ہوتے بیٹی پر نگاہ ڈالی جس کے چہرے پر جالا سا بن رہا تھا۔

''حمزہ! میری بیٹی نے نیک مرد چاہا تھا، اور نیک مرد بیوی کو مارجن دیتے ہیں، ان کی کمزوریوں کے باوجود۔ ہماری بیٹی میسرہ بھی اچھی انسان ہے۔''

کچھ توقف کے بعد وہ مضبوط لہجے میں بولے تو حمزہ نے گردن گھما کر بے اختیار بیوی کو دیکھا۔

پرفیوم کی بھینی بھینی خوشبو اس کے وجود کو سحر انگیز کر رہی تھی۔

''چلو۔'' اس نے یک دم میسرہ کی کلائی پکڑ لی۔

ماں باپ دونوں ہی خاموش تھے، وہ چاہتی تھی کہ جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لے لیکن ابو نے مداخلت کی۔

''تم باہر چلو، یہ اپنا ہینڈ بیگ لے کر آ رہی ہے۔''

رضی صاحب کی بات سن کر وہ لب بھینچتا باہر کی جانب روانہ ہوا تو وہ بے اختیار ماں کے گلے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔

''ماما! میرا وہاں دم گھٹتا ہے، وہ لوگ مجھے بلیڈ جیسے لگتے ہیں۔''

''میری بیٹی! میری میسرہ! مجھے امید ہے تمہاری زندگی میں بہتری کے آثار نظر آنے شروع ہونے والے ہیں ان شاء اللہ۔''

''ہم تمہارے ساتھ ہیں بیٹا۔'' باپ نے اسے کندھے سے لگا کر ماتھا چوما اور گیٹ کے باہر کھڑی گاڑی میں اس کو بیٹھتا دیکھ کر آسمان کی جانب دیکھا جو بہت روشن تھا۔ لگتا تھا کہ پچھلی رات تہجد میں میسرہ کی آسانیوں کے لیے مانگی دعا رب تک پہنچ چکی ہے۔

☆

عفت سحر طاہر

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد اور اگلی نشست پر ہی بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لاشیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔

ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے سجی گاڑی پوش ایریا کے ایک بنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈ روم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

نرمین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

نرمین کی سہیلی نجل کہتی ہے کہ تمہیں عباد وسیم پوچھ رہا تھا۔

نرمین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر ابا اسے جانے کی اجازت

دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔
زمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ تھیم پر تھی) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ بجل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔
راستے میں بجل رانا سعید سے عباد وسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے زمین کی دوستی کرا دے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں زمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ یمنیٰ الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگلی ملاقات میں بجل بتاتی ہے کہ عباد وسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ زمین بے یقین ہوتی ہے۔
وہ اپنے حواس میں نہیں تھی فیملی ڈاکٹر فریحہ کے ولیمے کی صبح اس کا چیک کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شاکڈ اور ڈپریسڈ ہیں۔ میڈیسن دیں آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔
بجل، زمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آ جاتی ہے زمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عباد وسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عباد وسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ زمین کو برا لگتا ہے۔
نصرت، زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ زمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تجھ سے شادی سے انکار کر دے گی۔ زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔
زمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ زمین، بجل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔
عباد وسیم کے ساتھ ایک بھرپور دن گزار کر زمین خوشی خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔ زمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔
زمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے زمین کو فون کرتی ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر بجل کے نمبر پہ کال کرتی ہے، اسے مبارک باد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ ابا آ جاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔
زمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں تھی، زمین سچ اسے بتا دیتی ہے۔
عباد وسیم، رانا سے ملتا ہے تو زمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔ عباد ہنسنے لگتا ہے۔
مائرہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عباد وسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔ مائرہ اور نزہت کی معنی خیز باتوں سے انجان بنتا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔
حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔
نزہت گھر واپسی پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔
حریم عباد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آ جاتی ہے عباد اسے دھمکاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ تم خراب کیریکٹر کے ہو۔ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ زمین پتا چلنے پر ناراض ہوتی ہے اور عباد سے معذرت کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔
مارک ڈینکیل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکے سے دوستی ہے۔ نصرت پھپھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور شادی شدہ بیٹی کو لے کر آتی ہیں۔ زمین گھر میں نہیں ہوتی۔
حریم کو وہ اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوبیٰ بہت خوش ہوتی ہیں لیکن ابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔
عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر تنہا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد زمین کو باپ کی بات یاد آتی ہے کہ دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔
عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر بلاتا ہے۔ اس کے قریب آنے پر وہ وہاں سے واپس آ جاتی ہے۔ عبد کی پرکھ کہ وہ پورا اترتی ہے۔ ادھر نصرت پھپھو تاریخ لینے آ جاتی ہیں۔ اماں اور حریم کے پوچھنے پر زمین شادی کی ہامی بھر لیتی

ہے۔ نصرت پھپھو اور زلفی خوش ہو جاتے ہیں۔ سجل فون کر کے زمین کو لاتی ہے۔ وہاں عباد وسیم موجود ہوتا ہے اور اسے پروپوز کرتا ہے۔ زمین خوشی خوشی گھر آتی ہے۔

رات میں حریم نریم سے کہتی ہے کہ شادی کا کارڈ پسند کرلو۔ وہ کہتی ہے پہلے لڑکا تو پسند کرلوں۔ پھر اسے بتاتی ہے کہ عباد وسیم نے اسے پروپوز کیا ہے۔ دروازے میں کھڑی اماں یہ سن کر بے سدھ ہو کر گر پڑتی ہیں۔

تیرہویں قسط

لان اب روشنی سے بھر گیا تھا۔

حریم نے دہشت اور خوف کا شکار ہو کر پہلے ردعمل کے طور پر بے اختیار ہلکی سی چیخ کے ساتھ میرب کو پیچھے دھکیلا۔

پھر پھٹی نگاہوں سے میرب کے ہونٹوں اور ٹھوڑی سے ٹپکتے خون کو دیکھا تو تڑپ کر اسے بانہوں میں بھرنا چاہا اسی اثنا میں وہ تیزی سے آگے آیا تھا۔

''اووہ...... مائے...... گاڈ......'' اس کے اعصاب جھنجھنا اٹھے، صدمے سے کہتے ہوئے اس نے حریم سے پہلے لپک کر میرب کو اٹھالیا جو زاروقطار روئے چلی جارہی تھی۔

''کیا ہوا ہے میرب کو؟'' نزہت نے پریشان ہو کر پوچھا جو ابھی مائرہ کے ساتھ آئی تھیں۔

''مم...... ممانے...... ممانے...... مارا۔''

میرب زاروقطار روتی اور ہچکیاں بھرتی اٹھانے والے کے شانے میں خون آلود چہرہ چھپاتے ہوئے شاید درد، خوف اور دہشت سے کانپ رہی تھی۔ حریم جو پہلے ہی اس قدر دل خراش واقعہ پر تھرا کر رہ گئی تھی، میرب کی بات سن کر اس کے اعصاب چٹخ اس نے وحشت و بے یقینی سے میرب کی طرف دیکھا تو نگاہ اس کی شعلے اگلتی آنکھوں سے مل گئی۔

''تم...... دور رہو......'' کچھ کہنے کو کھلتے لبوں کو سختی سے بھینچتا تمام کڑواہٹ اندر اتارتا میرب کو شانے سے لگائے وہ تیزی سے پورچ کی طرف بڑھا اس وقت میرب کو ہسپتال لے کر جانا سب سے اہم تھا۔ حریم لان کی سرد نم گھاس پہ بیٹھی رہ گئی۔

نزہت زہر آلود نگاہ اس پر ڈالتی مائرہ کے ساتھ اندر مہمانوں کے پاس چلی گئیں۔ ابھی فی الحال اندر کسی کو اس واقعہ کی خبر نہیں ہوئی تھی ورنہ تو تماشا لگنے میں کوئی کسر نہ رہ جاتی۔

حریم کو اپنا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرب لان کی طرف آئی کیسے...... اندھیرے میں وہ ویسے ہی باہر نکلنے سے ڈرتی تھی اور بالفرض باہر نکل ہی آئی تھی تو لان کے اس طرف اکیلی کیسے چلی آئی اور اتنے زور سے کیسے گری کہ زخمی ہی ہوگئی۔ حریم کا سوچ سوچ کر دماغ سن ہونے لگا۔ تو وہ بدقت تمام اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

وہ ساکت و جامد سی لاؤنج میں بیٹھی میرب کے اس قدر عجیب و غریب بلکہ خوف زدہ کر دینے والے رویے کے بارے سوچنا چاہ رہی تھی لیکن دکھتا ہوا دماغ کسی بھی سوچ پہ مرتکز نہیں ہو پا رہا تھا۔ مہمان ڈنر کے بعد جا چکے تھے۔ خدا جانے نزہت نے ان سب کو کیا بتایا، حریم سیدھی کمرے میں چلی گئی کپڑے تبدیل کیے۔ مہمانوں کی گاڑیوں کے جانے کی آواز پہ وہ باہر نکلی تو مسلسل آنسو بہاتی میرب کے لیے دعاؤں میں مشغول تھی۔

نزہت آ کر اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھیں تو وہ خالی نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔
''بہت خوب...... اچھا کھیل کھیل رہی ہو۔'' وہ استہزاء سے بولیں۔
''میں نے کچھ نہیں کیا...... یقین کریں...... میں تو ڈنر سرو کر رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم میرب کب لان میں گئی۔'' اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے حریم کی آواز بھرا گئی۔
''جھوٹ مت بولو۔ ہم یہاں بے وقوف نہیں بیٹھے ہوئے۔ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بدلہ کس بات کا لے رہی ہو اس معصوم سے۔'' نزہت نے گویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی، تیز لہجے میں بولیں۔ وہ ہراساں ہونے لگی۔
''میری بھانجی ہے وہ۔ میں کیوں اس سے کوئی بدلہ لوں گی۔ مجھے جان سے پیاری ہے وہ۔'' حریم کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے۔
''یہ مگرمچھ کے آنسو اپنے شوہر کو دکھانا۔ فریفتہ ہے تم پر...... یقین بھی کر لے گا۔ میں ان ہتھکنڈوں میں نہیں آنے والی۔'' وہ نخوت سے بولیں۔
''آپ جانتی ہیں میں میرو کا کتنا خیال رکھتی ہوں آنٹی! میں بے گناہ ہوں۔'' وہ تڑپی۔
''تو پھر میرب پاگل ہے؟ اسے دکھائی نہیں دیتا کہ کون مار رہا ہے اسے۔'' وہ تڑخ کر بولیں۔
''یہی تو سمجھ میں نہیں آتا مجھے۔'' حریم پھپھک کر رو دی۔ نزہت اٹھ کھڑی ہوئیں اور ایک سنگدلانہ سی سرد نگاہ حریم پہ ڈال کر بولیں۔
''لیکن میں اچھی طرح سمجھ رہی ہے کہ تمہارا مزید میرب کے پاس رہنا اس کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔'' ان کی بات نے حریم کو گنگ کر دیا تھا۔ وہ ان کا مطلب سمجھ کر تیزی سے اٹھی۔
''نہیں...... آنٹی پلیز۔'' وہ برافروختہ تھی۔ نزہت بے اعتنائی سے اسے دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔
اس واقعہ نے انہیں موقع دے دیا تھا کہ حریم کو گھر سے نکلوا سکیں۔ وہ گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھی اور ہاتھوں میں منہ چھپا کے آنسو بہانے لگی۔
''دیکھ لیا۔ اپنے بیٹے کی بے جا جذباتیت کا نتیجہ...... اس وقت اگر آپ میرا ساتھ دیتے تو دو گھریوں تباہ نہ ہوتے۔''
نزہت کمرے میں آتے ہی وسیم صاحب سے الجھنے لگیں۔ وہ خود حریم کی اس ظالمانہ حرکت پر مشتعل تھے لیکن چاہتے تھے کہ بیٹا سب کچھ دیکھ کر خود فیصلہ کرے کہ اس کی آئندہ زندگی میں حریم کی گنجائش ہے یا نہیں۔
''نزی پلیز...... میرا سر پہلے ہی دکھ رہا ہے میں مزید کوئی ڈرامہ نہیں چاہتا۔'' وسیم صاحب نے مدافعانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر قطعیت سے کہا۔'' اس نے اپنی زندگی بگاڑی ہے تو اس میں اتنی صلاحیت ہونی چاہیے کہ اسے سنوار بھی سکے۔ لائٹ آف کر دو اور سو جاؤ تم بھی۔''
''اسے آ تو لینے دیں۔ اللہ جانے بچی کا کیا حال ہے۔'' نزہت ان کے غیر جذباتی انداز پہ جزبز ہوئیں۔
''کال کی تھی میں نے۔ میرب ٹھیک ہے۔ ابھی آنے والے ہی ہوں گے۔'' وسیم صاحب نے کمبل اوڑھتے ہوئے بتایا اور آنکھیں موند لیں تو وہ گہری سانس بھر کے رہ گئیں۔

☆☆☆

وہ میرب کو لے کر بیڈروم میں داخل ہوا تو حریم تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی جبکہ حریم کو اٹھتے دیکھ کر اس نے

سرد تاثرات کے ساتھ وہیں سے ہاتھ اٹھا کر حریم کو روک دیا۔ یہ گویا خاموش اشارہ تھا کہ اسے میرب کے پاس آنے کی اجازت نہیں۔ حریم اندر ہی اندر کلس کر رہ گئی۔ وہ سوئی ہوئی میرب کو بیڈ پہ لٹا کر کمبل اوڑھاتے ہوئے حریم کی طرف پلٹا تو بال پیشانی پہ بکھرے ہوئے تھے۔ شرٹ مسکی ہوئی اور شانے پر میرب کے سوکھے ہوئے خون کے گہرے نشان۔

"کیسے...... کہاں چوٹ لگی۔ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟" حریم کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ وحشت زدہ سا اسے دیکھنے لگا۔ پھر دانت پیس کر آواز کو بھینچتے ہوئے بولا۔

"یہ تو تم مجھے بتاؤ گی۔ کیوں میری بیٹی کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہو؟" حریم بے اختیار لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹی اس کا چہرہ فق پڑ گیا تھا۔

"مم...... میں...... ؟"

"ہاں...... تم......" وہ جبڑے بھینچتا سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

"تم بتاؤ۔ کیا کیا ہے تم نے میرب کے ساتھ...... کیوں...... کیوں حریم؟" اس نے حریم کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا تو وہ اس کی بے دردانہ گرفت میں خالی الذہنی کیفیت میں جھولتی ہوئی اسے بے یقینی سے دیکھنے لگی۔

"میرے ساتھ دشمنی ہے نا تمہاری؟ تو مجھے مار دو...... زہر دے دو...... شوٹ کر دو...... لیکن اس معصوم کو بخش دو۔" اس نے آگ اگلتے لہجے میں کہہ کر ایک جھٹکے سے اسے چھوڑا تو وہ دیوار سے جا ٹکرائی۔

"تم...... دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟" حریم ہوش میں آئی تھی تڑپ کر بولی۔

"اب ہی تو ہوش آیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کسی بڑے نقصان سے پہلے تم میرب سے دور چلی جاؤ۔" شعلہ بار نظروں سے دیکھتا وہ حریم کو بے حد ظالم لگا وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی پھر جیسے اس کا دماغ الٹ گیا۔

"تم...... تمہارا ہر فیصلہ یک طرفہ ہوتا ہے۔ تین زندگیاں...... اور فیصلہ صرف ایک...... مسٹر سیٹھی کا کیونکہ تمہارے پاس نام ہے، پیسہ ہے، تمہیں ہر بات کی اجازت ہے۔ دوسروں پہ اپنے فیصلے مسلط کرنے کی، دوسروں کی زندگی کے ساتھ کھیلنے کی۔ میرا کوئی ٹھکانا چھوڑا ہے تم نے جہاں میں واپس جا سکوں؟" غصے اور صدمے سے چلاتے ہوئے حریم کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تو وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتا سائڈ ٹیبل کی دراز سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر لیے بالکونی میں نکل گیا۔ سخت سردی میں بھی سینے میں بھری کثافت سانس لینا مشکل کر رہی تھی۔ سرد ہوا میں گہری سانسیں بھرتے اس نے جیسے خود کو معتدل کرنے کی کوشش کی پھر سگریٹ لبوں میں دبا کر اسے لائٹر سے آگ دکھانے لگا۔ اس نے حریم کو بالکنی میں آتے محسوس کیا تھا لیکن وہ اسے نظر انداز کیے نیچے لان کے اندھیرے میں جھانکتے ہوئے سگریٹ کا دھواں اڑاتا رہا۔

"تم نے یہ کیوں کہا کہ میرب کو میں نے مارا ہے؟" حریم کی آواز صدمے اور سردی سے کپکپا رہی تھی۔ اس نے سویٹر نہیں پہنا تھا ہاں پارٹی والا لباس ضرور تبدیل کر لیا تھا جس کی شال اوڑھے ہوئے بھی وہ ٹھنڈ سے کانپ رہی تھی۔

"کیونکہ تم نے ہی اسے مارا ہے...... اور یہ بات میرب بتا چکی ہے۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "فار گاڈ سیک حریم! ڈرامہ بازی مت کرو میرے ساتھ۔" تیز لہجے میں کہتے ہوئے آخر میں وہ کرخت ہوا تھا۔ اتنے عرصے تک حریم نے ہر معاملے پر اس کا اتنا نرم لہجہ اور انداز دیکھا تھا کہ اب اس کے انداز پہ اعصاب ٹھٹھر سے گئے۔ اس نے محض نفی میں سر ہلایا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"رونا مت۔ آئی ہیٹ یور ٹیئرز (مجھے تمہارے آنسوؤں سے نفرت ہے)۔" اس نے سگریٹ تھامے ہاتھ اٹھا کر خفگی سے اسے تنبیہ کی اور سگریٹ کو جوتے تلے مسل ڈالا۔

"میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔ میرب میری جان ہے۔ میں اس کے ساتھ......"

"شٹ اپ۔" وہ بھڑک اٹھا۔ "یہ جھوٹ کی دوکان کہیں اور جا کر سجاؤ۔ یہ پہلی بار نہیں ہے۔ ہر بار وہ تمہارا نام لیتی ہے۔"

"میں اسے پیار کرتی ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ عادتاً میرا نام لیتی ہو۔" حریم اس کی سوچ کا انداز بدلنے کے لیے آنکھیں رگڑ کر آس سے پر لہجے میں بولی۔

"وہ ڈاکٹر کے سامنے بھی روتے ہوئے یہی کہتی رہی ہے حریم! میں تو شرم کے مارے سر نہیں اٹھا پایا۔ اتنی ظالم ماں؟" وہ صدمے سے پر دھیمی آواز میں بولا تو حریم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں تو کبھی اسے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوؤں۔ اتنی قیمتی ہے وہ میرے لیے۔"

حریم کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"وہ صرف تمہاری ہی نہیں میرے لیے بھی نشانی ہے۔ میری ماں جائی کی نشانی...... مجھے نہیں پتا یہ سب کیا ہو رہا ہے لیکن میرا یقین کرو یہ سب میں نہیں کر رہی۔" وہ تھک کر چپ ہو گئی۔ جیسے اپنے حق میں تمام دلائل دے چکی ہو اور اب کچھ بھی کہنے کو باقی نہ رہا ہو۔

"تمہیں صرف یہ ڈر ہے کہ میں نے تمہیں اس گھر سے نکال دیا تو تم کہاں جاؤ گی۔" کتنی ہی دیر کے بعد اس نے جو نکتہ اس کی ساری گفتگو میں سے اٹھایا اس نے حریم کو صدمے کا شکار کیا۔

"میں میرب سے دور نہیں جانا چاہتی۔" حریم نے بدقت تمام تصحیح کی لیکن وہ اس کی بات کاٹ کر کرختگی سے بولا۔

"تم اب کبھی میرب کے پاس بھی نہیں جاؤ گی ورنہ میں ایک منٹ نہیں لگاؤں گا تمہیں اس گھر سے باہر نکالنے میں۔ میری نرمی کا بے جا فائدہ مت اٹھاؤ حریم مصطفیٰ! میں اتنا بھی اچھا آدمی نہیں ہوں۔"

"ایسا مت کرو۔ میں اس سے دور کیسے رہ سکتی ہوں۔" وہ گھگھیائی۔

"تو پھر اس گھر سے چلی جاؤ۔" وہ بھڑکا تو اس کی بات سن کر حریم اونچی آواز میں رونے لگی اس نے مٹھیاں بھینچے دانتوں پہ دانت جمائے جیسے خود پہ ضبط پانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"لیکن اگر یہاں رہنا ہے تو میں تمہیں میرب کے قریب بھی نہ دیکھوں۔ ابھی میرے ذہن کو پرسکون ہونے دو۔ میں صحیح، غلط کچھ سوچ نہیں پا رہا۔ جاؤ یہاں سے۔ کہیں میں کوئی انتہائی فیصلہ نہ کر بیٹھوں۔" وہ انتہائی سرد و بے مہر لہجے میں بولا تو حریم خائف سی ہو کر کمرے میں چلی گئی۔

وہ دکھ کے گہرے حصار میں گھرا کھڑا کتنی ہی دیر حریم کو پھر سے بے اختیار دیے جانے والے موقع کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے سوچتا رہا۔ بری طرح گرنے کی وجہ سے میرب کی ٹھوڑی پہ گہرا کٹ آیا جس کی وجہ سے ٹھوڑی پہ دو ٹانکے لگے تھے اور اوپر کا دانت نچلے ہونٹ میں کھبنے کی وجہ سے ہونٹ بھی زخمی تھا۔ درحقیقت میرب کی حالت ایسی نہ تھی کہ حریم کے ساتھ کوئی ہمدردی برتی جاتی یا نرمی کا سلوک کیا جاتا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ انتہائی فیصلہ نہیں کر پایا۔ شاید وہ اس کے ساتھ جو کچھ کر چکا تھا اس وجہ سے؟ وہ سر جھٹک کر پیکٹ سے نیا سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ بیڈ پر میرب سے کچھ فاصلے پر بیٹھی اسے دیکھ کر بے آواز آنسو

بہانے میں مشغول تھی۔اس کی رگ وپے میں تیزاب سادوڑ گیا اس نے لپک کر حریم کو بازو سے تھام کر میرب کے پاس سے اٹھایا تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا اب تم اس کے پاس نہیں آؤ گی۔" وہ اس کے کان کے پاس مدھم آواز میں پھنکارا تھا۔حریم کا حلق خشک ہوا۔وہ اسے یونہی بازو سے جکڑے تقریباً کھینچ کر کمرے کی سائڈ پہ لایا اور اسے کاؤچ پر دھکیل دیا۔

"آج تم یہاں سوؤ گی......اور کل سے گھر میں کہیں بھی اپنا روم سیٹ کروالو۔لیکن میری بیٹی سے دور۔ورنہ اس کے بعد جو ہوگا اس کی ذمہ دار صرف اور صرف تم ہوگی۔" وہ جلاد بنا ہوا تھا انگلی اٹھا کر وارننگ دیتا واپس پلٹ گیا تو کتنے ہی آنسو حریم کی آنکھوں سے ٹوٹ کر گرنے لگے۔

☆☆☆

نرمین کے جانے کے بعد اماں گھٹ گھٹ کر کتنی ہی دیر روتی رہیں۔

"اتنا دکھ ہو رہا ہے تو نکالا کیوں اسے اماں! دو گھڑی بیٹھ کے جی بھر کے اسے دیکھ لیتیں باتیں کر لیتیں۔پھر جانے کبھی ملنا ہو یا نہ ہو۔" حریم نے آزردگی سے کہا تو اماں نے گریہ سے لال آنکھوں سے اسے دیکھا اور مکرنے والے لہجے میں بولیں۔

"مجھے بھلا اس کے لیے کیوں رونا آئے گا۔دیکھا نہیں تھپڑ بھی مارا اسے اور گھر سے بھی نکالا ہے۔تمہارے ابا سے کیا وعدہ نبھایا ہے میں نے۔"

"وہ اپنے گھر میں خوش ہے اماں! کیا یہ سوچ کر ہم لوگ خوش نہیں رہ سکتے؟" حریم نے ان کی سوچ بدلنے کی سعی کی۔لیکن ان پڑھ والدین نے اولاد کو پڑھا لکھا کر بھی اپنے اعتقادات نہیں بدلے تھے۔اول برادری خاندان......بعد میں اپنی ذات۔

"جن کی بیٹیاں گھر سے بھاگ کے شادی کریں ان پر تمام عمر کا سوگ واجب ہو جایا کرتا ہے حری! والدین کی عزت کی خاطر اولاد کا اپنی خواہشات دبا لینا اولاد کے لیے باعث ثواب ہوتا ہے۔" ان کی ان پڑھ اماں کبھی کبھار فلاسفر بھی بن جایا کرتی تھی۔اب وہ فلسفہ غلط ہو یا صحیح......اس پہ کوئی اعتراض نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"اماں! ایک بات پوچھوں؟" ان کا سر دباتے ہوئے حریم نے جھجک کر پوچھا۔

"ہم۔"

"آپ کو......زلفی بہت پسند تھا نرمین کے لیے؟ مطلب......اس کے جوڑ کا لگتا تھا؟" حریم نے اٹک کر پوچھا۔اماں نے آنکھیں کھول کر گہری نگاہ اس پہ ڈالی تو حریم پسینہ پسینہ ہوئی۔

"ماں باپ کی زبان بیٹیوں کے لیے جان سے زیادہ پیاری ہونی چاہیے حری! اس کمبخت سے ایک دل نہ مارا گیا۔"

(دل مارنے کے لیے پہلے خود مرنا پڑتا ہے ماں) حریم کا دل کرلایا۔مگر وہ خاموشی سے ان کا سر دباتی رہی۔

"ہم نے تم لوگوں کو پڑھایا لکھایا اس لیے ہے تاکہ اپنا اچھا برا جان سکو۔زمانے کے ساتھ چل سکو۔اس لیے نہیں کہ اپنی من مرضی پہ اتر آؤ۔تم بھی حری! دھیان رکھنا۔تم نے دھوکا دیا تو تمہارا اباپ ڈھے جائے گا اور ماں جیتے جی مر جائے گی۔" اماں کی بات پر وہ جھرجھری لے کر ان سے لپٹ گئی۔اسے نہیں معلوم تھا کہ اس روز اماں کے منہ سے نکلے الفاظ آنے والے وقت میں سچ ثابت ہو جائیں گے۔

"ایسے مت کہیں اماں!......بس آپ مینو کو معاف کر دیں۔ماؤں کی بددعا اولاد کو بڑی آزمائش میں ڈال

دیا کرتی ہے۔ اس لیے کہہ رہی ہوں۔ میں نے عزت رکھ لی نانا ابا کی۔ پھپھو کو ہاں کر کے (اپنے دل اور خود کو مار کے)۔"

اس نے آنسو پیتے ہوئے ان سے منت کی تھی اماں نے چپ کر کے آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹ بھی۔ جیسے اب مزید ایک لفظ بھی نہ بولنے کا ارادہ ہو۔ حریم آہ بھر کے رہ گئی۔

☆☆☆

تمہیں پتا ہے "انت الحیات" کا مطلب؟
اس کا مطلب ہے "تم زندگی ہو میری"
سانس لینے کو؟
نہیں......
زندہ رہنے کو؟
نہیں......
تمہاری آواز کو تمہاری دید کو نہیں کہتے ہیں زندگی!
"تم" ہو انت الحیات......
سنو!
اب دعا کرو میری عمر دراز ہو
اور عمر دراز تب ہوتی ہے جب "اسباب" میسر ہوں
تمہاری صحبت
درازی عمر کا "سبب" ہے
تو ذرا خیال رکھنا اپنا
کہ "انت الحیات" ہو تم

ابھی کل ہی اس نے کیتھی کو اس خوب صورت نظم کا انگلش ترجمہ سنایا تھا اور وہ ہزاروں میل دور موبائل کان سے لگائے مسمرائز سی اس کے دلکش لب و لہجے کو اپنی سماعتوں میں جذب کر رہی تھی۔ اور آج صبح ناشتے سے فراغت پاتے ہی نزہت نے گویا چھوٹا موٹا بم ہی پھوڑ دیا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم واپس جانے سے پہلے مائرہ کے ساتھ منگنی یا نکاح کر کے جاؤ۔"

زیاد کا دل اچھل کر حلق میں آیا۔ اس نے شکایتی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا تو انہوں نے کھنکھارتے ہوئے اخبار جھٹک کر منہ کے آگے کر لیا۔

"مما پلیز! آپ ایک ہی بات کو لے کر ضد پہ کیوں اڑی ہوئی ہیں...... نہ تو میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں اور نہ ہی مائرہ۔" وہ خفگی سے بولا تو وہ مسکرائیں اور پھر لاڈ دکھانے لگیں۔

"ارے میرے شہزادے! میں نے کب کہا کہ تم کہیں بھاگ رہے ہو۔ بس میرا اپنا دل کرتا ہے کہ اس گھر میں شہنائیاں گونجیں۔ خوشیاں آئیں۔ عباد نے تو نالائقی دکھا دی۔ اب تو میری ساری خوشیاں اور امیدیں تم ہی سے وابستہ ہیں۔"

"مما......" زیاد بے بس ہونے لگا۔ اگر وہ عباد جیسا ایک فیصد بھی خود غرض ہوتا تو بنا ماں کا دل ٹوٹنے کی پروا کیے یہیں صاف اس رشتے سے انکار کر دیتا۔ اور وسیم سیٹھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے تب ہی اخبار لپیٹ کر سائڈ پہ رکھتے ہوئے آنکھوں سے چشمہ اتار کر نزہت کی طرف متوجہ ہوئے۔

''لو بھلا...... پہلے کہا ہوتا بیگم!! ارے بھئی۔ بیٹے نہیں تیار شہنائیاں بجوانے کو...... تو میں موجود ہوں بلکہ یوں سمجھو سر تسلیم خم ہے۔ ابھی تین کی گنجائش باقی ہے۔ ایک ایک کر کے رونق لگالیں گے تو آپ کا کافی عرصہ نکل جائے گا خوشیاں مناتے ہوئے۔'' وہ خوش مزاجی سے بولے تو اتنے سنجیدہ ماحول میں بھی زیاد نے بے ساختہ قہقہہ لگایا جبکہ نزہت نے برا مان کر شوہر کو دیکھا۔

''آپ کی ان ہی نان سیریس باتوں نے آپ کی اولاد کو چھوٹ دی ہوئی ہے۔''

''بچوں پہ اپنی خواہشات منوانے کے لیے اتنا دباؤ مت ڈالو کہ ان کی اپنی خوشیاں ان کے دل میں ہی دبی رہ جائیں۔'' وہ قدرے سنجیدہ ہوئے۔

''اب میں سوچتا ہوں کہ عباد نے شاید ٹھیک ہی فیصلہ کیا۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ جتنا خوش ہے اتنا اپنی مرضی کے برخلاف مائرہ سے شادی کر کے خوش نہ ہوتا۔'' نزہت تلملا کر پہلو بدلنے لگیں۔

''حد ہے وسیم صاحب! اب آپ اس کے غلط فیصلے کی بھی داد دیں گے۔ مائرہ کے ساتھ شادی کر کے کچھ عرصے بعد وہ اس لڑکی کو بھول بھال جاتا۔''

''نزہت بیگم! اگر میں تمہیں تمہارا ناپسندیدہ ترین سوٹ زبردستی پہنا کر کسی پارٹی میں لے جاؤں تو تم ایک منٹ کے لیے بھی خوش نہیں ہو پاؤ گی کیونکہ تمہارا دل اس لباس کی بدصورتی میں اٹکا رہے گا۔ یہ تو پھر زندگی کے ساتھی کا معاملہ ہے۔ ہم چند گھنٹوں کے لیے ناپسندیدہ کپڑا جو نہیں پہن سکتے اور بچوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ناپسندیدہ ہم سفر کے ساتھ ساری زندگی گزار دیں۔ وہ بھی خوشی خوشی۔ شکر کرو تمہاری بھانجی کی زندگی خراب ہونے سے بچ گئی۔''

''یہ تو آپ کی سوچ ہے نا۔ اس بے چاری کی حالت دیکھیں ذرا۔''

''وہ بے چاری نہیں بے وقوف ہے۔'' وسیم صاحب نے اطمینان سے کہا تو نزہت کو رونے پہ آمادہ دیکھ کر زیاد نے آنکھ کے اشارے سے انہیں مزید کوئی گوہر افشانی کرنے سے منع کیا۔

''ارے۔ دنیا میں ایک سے بڑھ کے ایک بہترین لڑکا پڑا ہے اور تم ہو کہ اپنی بھانجی کو اپنی نالائق اولاد کے پلے باندھنے پہ مصر ہو۔ یہ اچھی محبت ہے بھائی بھتیجی سے...... واہ بھئی۔'' وہ اسی موڈ میں تھے۔ رونے والا منہ بناتے ہوئے نزہت کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

''کیا فضول باتیں کیے جا رہے ہیں۔''

''فضول بات تو یہ ہے کہ تم بچوں کو کھل کے سانس بھی نہیں لینے دے رہیں۔ عباد نے من پسند لڑکی سے شادی کر لی۔ مائرہ بمشکل ہی سہی لیکن سنبھل گئی تو تم دوسرے بیٹے سے بنا اس کی مرضی پوچھے جا کر بھابی سے اس کے رشتے کی بات کر آئیں۔ مطلب...... حد ہی ہے۔'' وہ اب سنجیدہ تھے۔ نزہت نے باری باری ان باپ بیٹے کو دیکھا۔

''یعنی...... زیاد......! تم بھی راضی نہیں ہو اس رشتے پر؟''

''آ اہم۔'' وہ ہلکا سا کھنکھارا۔ ''میں نے اول روز ہی آپ سے کہا تھا کہ مائرہ مجھے اس لحاظ سے بالکل بھی پسند نہیں مما!! وہ اچھی کزن ہے اور دوست۔ اینڈ دیٹس آل۔'' اس نے سنجیدگی سے بتایا تھا۔

''زیاد! میرے شہزادے۔ شادی تو کہیں بھی کرنی ہی ہے نا تم نے۔ پھر مائرہ سے ہی کر لو۔ تم کون سا کسی کو پسند کرتے ہو۔'' نزہت کی وہی مرغے کی ایک ٹانگ تھی۔ زیاد نے گہری سانس بھری۔

''اچھا...... بالفرض...... یہ کسی اور کو پسند کرتا ہو تو؟'' وسیم صاحب نے اچانک پوچھا تو جہاں زیاد کو تاثرات چھپانے مشکل ہوئے وہیں نزہت آرام سے بولیں۔

"جی نہیں۔ مجھے پورا یقین ہے۔ یہ عباد جیسا بے شرم بالکل بھی نہیں۔"
"لو جی...... کام ہی تمام......" وہ ہنسے۔ "مطلب یہ کہ پسند تمہاری ہی ہوگی ہر حال میں۔"
"فی الحال میں ایسا کوئی سلسلہ نہیں چاہتا مما! جس سے میرا ذہن منتشر ہو۔ مجھے سب کچھ وائنڈ اپ کر کے لوٹ آنے دیں۔ پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔" زیاد نے محتاط الفاظ میں کہتے ہوئے گویا بات ختم کرنا چاہی۔ نزہت ایک ٹک اسے دیکھے گئیں پھر گہرے لہجے میں بولیں۔
"میں نے اپنے بھائی بھابی کو زبان دی ہے زیاد! اس بات کا لحاظ ضرور رکھنا۔" اور زیاد نے محض اثبات میں سر ہلاتے مسکرا کر اس مہلت کو قبول کیا۔ کچھ وقت کے لیے ہی سہی لیکن اسے کوئی حکمت عملی وضع کرنے کا موقع مل گیا تھا۔
عباد کو پتا چلا تو وہ اسے چھیڑنے لگا۔
"مبارک ہو بھئی۔ پتا چلا ہے کہ پھانسی گھاٹ دو قدم پہ تھا جب صیاد نے اپنا ارادہ بدل دیا۔"
"شٹ اپ برو!" وہ بدمزہ ہو رہا تھا۔ "مجھے تو یہ فکر ہے کہ اس مہلت کے بعد کیا ہونے والا ہے۔"
"جو بھی ہوگا اچھا ہی ہوگا تم فکر مت کرو۔" عباد نے اسے تسلی دی۔ "گھر چلو۔ تمہیں زمین کے ہاتھ کی کافی پلواتا ہوں۔ مجھ سے بھی اچھی بنانے لگی ہے۔"
عباد نے موبائل اور کی چین اٹھاتے ہوئے اسے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔
وہ دونوں فلیٹ پہ پہنچے تو نا صرف زمین بلکہ حریم بھی موجود تھی ان دونوں کو دیکھتے ہی حریم جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ زیاد کو اس کا انداز برا لگا۔
"ارے حریم! بیٹھو...... کافی پیتے ہیں۔"
"میں دیر سے آئی ہوئی ہوں میرب کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اب وہ سو چکی اور زمین سے ساری باتیں بھی کرلیں۔ سو جانا ہی بنتا ہے۔" وہ خفیف سا مسکرائی۔
"یہ بے چاری بھی تم جیسی ہی ہے۔ جیسے میری منگیتر تمہارے سر منڈھی جارہی ہے ویسے ہی زمین کا منگیتر اس کے پلو سے باندھ دیا گیا ہے۔"
عباد منہ پھٹ تو تھا ہی لیکن اس کی زندگی کے سب سے حساس معاملے کو مذاق میں یوں اڑائے گا یہ حریم کو قطعاً اندازہ نہیں تھا خجالت اور شرمندگی سے سرخ پڑتا چہرہ لیے وہ زمین کو خدا حافظ کرتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ زمین نے گھور کر تنبیہی نظروں سے عباد کو دیکھا تو اس نے لاپروائی سے شانے اچکا دیے۔
"یہ تم سچ کہہ رہے ہو یا ایسے ہی کہانی بنالی ہے اپنی طرف سے؟" حریم نے اپنے پیچھے عباد کے بھائی کی پر تجسس آواز سنی تھی وہ زمین کے معذرت خواہانہ الفاظ پر مسکراتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی۔

تجھ سے ناراض نہیں زندگی
حیران ہوں میں...... حیران ہوں میں
تیرے معصوم سوالوں سے
پریشان ہوں میں...... پریشان ہوں میں

لیکن حریم مصطفیٰ زندگی سے ناراض بھی تھی اور دنیا کے سوالوں سے پریشان بھی۔ دل تھا کہ کسی پل چین نہیں پاتا تھا۔ وہ سڑک کنارے پیدل ہی چل پڑی۔ سر جھکائے زندگی کے نشیب و فراز پہ غور کرتی وہ یک لخت ایک جگہ رک گئی۔ آتی جاتی ٹریفک، ہنستے مسکراتے کہیں پہ قہقہے لگاتے لوگ، مستی کرتے کالجز کے لڑکے، اسکول وین اور رکشوں میں سے جھانکتی پر تجسس اور زندگی سے بھرپور روشن آنکھیں...... اسے لگ رہا تھا سب کی زندگی

میں حسن ہے۔ خوشی ہے، قہقہے ہیں۔ ماسوائے اس کے۔ وہ خود ترسی کی گہری کیفیت میں گھرنے لگی۔ اسی وقت ایک گاڑی اس کے پاس رکی تو حریم نے چونک کر غائب دماغی کیفیت میں دیکھا۔

"ہیے...... زرمین بھابی کی بہن! آؤ میں ڈراپ کر دیتا ہوں تمہیں۔" وہ نا جانے کیا سوچ کر اسے پہچان کر رک گیا تھا۔ دوستانہ انداز میں آواز دی تو حریم کا اپنی زندگی کے نشیب وفراز پر اتنی دیر کا جمع تمام تر غصہ عود کر آیا، وہ ڈرائیونگ سیٹ کی کھلی کھڑکی کی طرف ذرا سا جھکی۔

"تمہارے ساتھ چلی جاؤں، تا کہ تم یہ سوچنے میں حق بجانب ہو سکو کہ میں ایک دولت کی بھوکی لڑکی ہوں جو اپنا لائف اسٹائل بہتر کرنے کے لیے تم جیسے آدمی کی آفر کو فوراً قبول کر سکتی ہے۔" اس نے نخوت سے کہتے ہوئے اپنا سارا غصہ اس شخص پہ انڈیلا جس کے چہرے کی مسکراہٹ حریم کے الفاظ سن کر سمٹتی چلی گئی اور وہ ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنی کچھ چھوٹی موٹی شاپنگ کرنے آئی تھی، شاپنگ مال سے نکلتے ہوئے کسی نے بڑے جوشیلے انداز میں اسے بازو سے جکڑ لیا۔ حریم خائف سی پلٹی تو سجل کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھ کر پل بھر کو جہاں کی تہاں رہ گئی۔ سجل بڑے پیار سے اسے گلے ملی۔

"تم سے میری دوست کی خوشبو آرہی ہے۔" زرمین کو یاد کرتے ہوئے سجل آب دیدہ ہوگئی تھی حریم کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ واقعی...... سجل کو سامنے دیکھ کر اسے بھی زرمین ٹوٹ کر یاد آئی۔ وہ دونوں مال کے کیفے میں آ بیٹھیں۔

"کہاں ہو...... کیسی ہو...... اماں ابا کیسے ہیں؟ اور زرمین کی بیٹی؟۔ میں نے تو بس جنازے اور قل والے روز دیکھا تھا اسے۔ اب تو بڑی ہوگئی ہوگی۔" وہ تھوڑے وقت میں سب جان لینا چاہتی تھی۔

"سب ٹھیک ہیں۔" حریم عجیب سی کیفیت کا شکار ہونے لگی۔

"ہم دراصل یہیں شفٹ ہوگئے ہیں۔ اب تو اکثر ملاقات رہے گی۔ تم سناؤ۔ شادی ہوگئی تھی تمہاری؟" سجل نے پیار سے میز کی سطح پہ رکھا اس کا ہاتھ تھاما۔

"ہمم......" وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سجل کو دیکھنے لگی۔

"وہ...... کیا نام تھا تمہارے کزن کا۔ شاید زلفی کے ساتھ۔ زرمین نے بتایا تھا مجھے۔" سجل صحیح معنوں میں زرمین کی رازداں تھی۔ ہر بات سے واقف۔ حریم نے گہری سانس بھری۔

"بہت لمبی داستان ہے۔ چائے منگوالو پھر سناتی ہوں۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔ کب سے کوئی ہمدرد ڈھونڈ رہی تھی۔ نہ ماں نہ بہن...... اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اسے جیسے زرمین کا ساتھ مل گیا تھا۔ سجل کھل کر مسکراتے ہوئے چائے اور اسنیکس آرڈر کرنے لگی، اور حریم دل ہی دل میں اپنی داستان حیات کے صفحات ترتیب دینے لگی۔ چائے آنے تک اس کی داستان غم جاری تھی جو چائے اور اس کے آنسوؤں کے ساتھ ہی ختم ہوئی۔

"مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا حریم! میں تمہیں بے وقوف کہوں یا بے جا جذباتیت کی شکار لڑکی۔" سجل نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ یہ حریم کی داستان غم پر اس کا پہلا تبصرہ تھا جو حریم کو بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔

"میں تو خود وکٹم ہوں۔ ہر طرح سے استحصال ہوا ہے میرا۔" حریم نے خفگی سے پر لہجے میں احتجاج کیا تو سجل نے تحیر سے اسے دیکھا۔

"مجھے ڈی گریڈ کیا ہے اس شخص نے...... میرے ماں باپ کے سامنے۔ اس کے ایک غلط فیصلے اور زبردستی

کی اس شادی کی وجہ سے میرے اپنے مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ میں اپنے والدین اپنی سگی بہن سے مل نہیں سکتی۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی۔

"تمہیں زلفی سے محبت تھی؟" وہ تھمی تو تجل نے اچانک غیر متوقع سوال پوچھا۔ حریم جز بز ہوئی۔

"ایک بی اے فیل...... آوارہ مزاج اور نظر باز شخص سے کوئی پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی محبت نہیں کر سکتی۔" اس نے ٹشو سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

"پھر بھی...... آئیڈیل ہوگا وہ تمہارا شاید۔" تجل اپنی بات پہ مصر تھی حریم کو زلفی کے انداز گفتگو یاد کر کے جھرجھری سی آگئی۔ اس کا چھپھورا پن شکل وصورت کا نہیں عادات واطوار کا برا تھا۔ اس کی آنکھ کی گندگی اس کے عورت کو دیکھنے کے انداز ہی سے جھلکتی تھی۔

"اتنے بھی برے حالات نہیں تھے میرے۔ ابا ہی کو خاندان اور اپنی بہن کو دی ہوئی زبان پیاری تھی۔" حریم اداس ہو کر بولی۔

"تو پھر تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم رو کس نقصان پہ رہی ہو؟ تمہارے شوہر نے تمہیں زلفی نامی جہنم سے بچا کر کیا غلطی کی ہے؟" تجل نے دونوں بازو میز کی سطح پہ ٹکاتے ہوئے پوچھا تو حریم نے چونک کر اسے دیکھا۔ تجل کے سوال پر اس کا ذہن ایک دم خالی ہو گیا۔

"کبھی تم نے اپنی خود ساختہ بے چارگی سے ہٹ کر یہ سوچا ہے کہ اپنے شوہر کی وجہ سے آج تم ایک موالی اور بدطینت شخص کے بجائے بلاشبہ ایک کروڑ پتی شخص کی بیوی ہو جس کا اس معاشرے میں باعزت نام ہے۔ شان دار گھر، گاڑی کی مالک ہو۔ کیا تم نے کبھی اپنی بے وجہ کی نفرت اور غصے کو سائڈ پہ رکھ کے اس بات کا شکر ادا کیا ہے کہ اس شخص نے تمہیں زلفی سے نجات کے لیے نرمین جیسا راستہ اختیار کرنے سے بچالیا ہے؟" تجل چند سوالات اس کے سامنے رکھنے کے بعد اب جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ حریم کا ذہن بھک سے اڑا اور پیشانی چمک اٹھی۔

"زندگی میں ہر کسی کو سب کچھ ایک ہی طرح سے نہیں ملا کرتا حریم! اس کا طریقہ مانا کہ غلط سہی...... لیکن نادانستگی میں ہی وہ تمہیں زلفی سے...... اور ایک ان چاہی زندگی گزارنے سے بچا چکا ہے۔ اس سے شادی کے بدلے میں دنیا کی ہر قابل خرید شے تمہارے قدموں میں آچکی ہے پھر بھی وہ تمہارے لیے قابل نفرت ہے۔ مجرم ہے...... اور مزے کی بات یہ کہ وہ تمہاری یہ بے وجہ کی نفرت اتنے حوصلے اور صبر سے سہہ بھی رہا ہے۔ واہ...... کیا ہی برا شخص ملا ہے تمہیں زلفی کے بدلے۔" تجل نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا تو حریم کے ذہن میں بندھی بہت سی گرہیں جیسے یکلخت کھل گئیں۔

"والدین خفا ہو گئے...... چھوٹ گئے...... بہت برا ہوا۔ لیکن اب تو یہ سب ہو چکا نا؟ تو جو "ہو چکا" اس پہ کیا ساری عمر روتی رہو گی؟ بے وقوفی مت کرو اور جو ملا ہے اسے بچانے اور اپنانے کی کوشش کرو حریم! وہ تمہارے اماں ابا کو بھی منانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ تم اسے اپنے ساتھ کا احساس تو دلاؤ۔ الٹا تم اس پر یہ ظاہر کر رہی ہو کہ زلفی جیسے خوابوں کے شہزادے سے بچھڑ کر تم ساری عمر اسی کے سوگ میں گزار دو گی۔"

"نن...... نہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا۔" حریم خفیف ہوئی۔

"تمہارا رویہ کافی ہے یہ سب جتانے کے لیے بے وقوف لڑکی! اس نے بہتر سمجھا کہ میرب کی پرورش کسی غیر کے بجائے اس کی محبت کرنے والی خالہ کرے تو اس میں برا کیا تھا؟ اسے اس کے سرکل کی کریم میں سے کوئی بھی لڑکی مل جاتی۔ تم لوگوں کی گلی کے آگے سے تو اس کی گاڑی بھی نہیں گزرتی حریم! نہ وہ تمہارے عشق میں مبتلا تھا۔ پھر کیوں اس نے تم سے شادی کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اپنایا؟ وجہ صرف ایک ہے، جو تم دونوں

کو ایک زنجیر سے جوڑتی ہے۔ اور وہ زنجیر ہے میرب عباد!'' سجل نے آہستہ آہستہ ساری گتھی سلجھا کر ہر رنگ کا دھاگہ الگ کر کے اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ سارے رنگ جو الجھ کر ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اتنے مہینوں سے حریم کو مایوسی اور خود ترسی کا سیاہ ماتمی رنگ بنا کر دکھا رہے تھے۔ آج سلجھے تو حریم کو بہت خوش رنگ لگے۔ واقعی...... کیا کمی تھی اس کی زندگی میں؟؟

اکثر ہم ایک غم اور کمی پہ روتے اور شکوے کرتے ہوئے کئی سکھوں اور خوشیوں پہ ہنسنا اور ان کا شکر ادا کرنا بھول جاتے ہیں۔

اس نے بے اختیار سجل کا ہاتھ تھام لیا اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ سجل مسکرانے لگی اور دوسرے ہاتھ سے حریم کے ہاتھوں کو نرمی سے تھپتھپایا۔

''اگر وہ کسی اور سے شادی کر لیتا تو تم لوگ نرمین کے بعد میرب کو بھی ترس جاتے۔ انجانے میں ہی سہی...... لیکن تمہارے ساتھ وہ نیکی ہی کر گیا ہے حریم! اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ بگڑے ہوئے حالات پہ کیسے قابو پاتی ہو۔'' سجل نے اسے حوصلہ دینے والے الفاظ کہے تھے حریم نے نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''گھر آنا...... تمہیں تو پتا ہی ہے میرے گھر کا۔''

''ان شاء اللہ...... ضرور۔ اب تو دوبارہ اس گھر سے رشتہ بن گیا ہے میرا۔'' سجل اداسی سے مسکرا دی تھی۔

''میں چلتی ہوں...... ڈرائیور انتظار کر رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر کا کہہ کر آئی تھی شام ہونے والی ہے۔'' حریم اٹھ گئی سجل نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس نے بہت پیار سے حریم کو رخصت کیا تھا۔

☆☆☆

''اب تک تو فیصلہ ہو جانا چاہیے تھا پھپھو! آپ لوگ کس انتظار میں ہیں۔ جب وہ میرب کو جان سے مار ڈالے گی تب ہوش آئے گا آپ لوگوں کو۔'' مائرہ ان کے ساتھ کچن میں کھڑی الجھ رہی تھی۔

''میرے اس بیٹے کا دماغ تم جانتی ہو نا اور ہی طرح کا ہے۔ اب بھی سب کچھ اس کے سامنے ہے لیکن وہ جانے کس بات کی چھوٹ دیے جا رہا ہے اسے۔ شاید نرمین کی بہن ہونے کی وجہ سے۔'' نزہت خود بے بس تھیں ان کا بس چلتا تو وہ شام سے پہلے حریم کو گھر سے نکال کر مائرہ کو بہو بنا کر لے آتیں۔

''آپ نے بھی تو اسے چھوٹ دی تھی پھپھو! اگر اسی وقت لگام کس لی ہوتیں تو اس کی کیا مجال تھی کہ نرمین کے بعد اسی کی بہن کو اس گھر کی بہو بنا کے لے آتا۔'' مائرہ کو ان کی بھی اگلی پچھلی ساری غلطیاں یاد آنے لگیں نزہت نے گہری سانس بھری۔

''اس وقت کی نزاکت سے تم بھی واقف ہو مائرہ! بلکہ پہلا موقع تو تمہیں دیا تھا میرب کو سنبھالنے اور اس گھر کی بہو بننے کا۔ تم خود ہی پیچھے ہٹ گئیں۔''

''کیونکہ آپ کے بیٹے کو ایک بیوی نہیں بلکہ اپنی بیٹی کے لیے ایک آیا کی ضرورت تھی۔'' وہ چیخی۔ نزہت نے اس کی کیفیت سمجھ کر اسے بے اختیار گلے سے لگا لیا۔

''تم فکر مت کرو۔ حالات خود بخود تمہارے حق میں ہو رہے ہیں۔ شاید قدرت کو بھی یہی منظور ہے کہ تم ہی اس گھر کی بہو بنو۔'' اس کے بالوں کو چومتے ہوئے کہا تو ان کی باتیں سن کر امید اور خوش فہمی کی شمع مائرہ کے دل میں پھر سے روشن ہو گئی۔ اسے پورا یقین تھا کہ جو اس کا ہے وہ لوٹ کر اسی کے پاس آئے گا۔

''چائے بن گئی ہے تو چلیے، وہاں لان میں انتظار ہو رہا ہوگا۔'' مائرہ نے مسکرا کر ماحول بدلا تو نزہت مسکراتے ہوئے نسرین کو آواز دینے لگیں۔

"یہ چائے اور اسنیکس ٹرالی میں لگا کر لان میں لے آؤ۔" نسرین کچن میں آئی تو اسے ڈیوٹی سمجھا کر نزہت، مائرہ کو لیے لان میں چلی گئیں جہاں وسیم سیٹھی اپنے بیٹے کے ساتھ چائے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"میرو کہاں ہے؟" اس نے ماں کو دیکھتے ہی پوچھا تھا۔

"اندر ہے ثریا کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ ابھی بس اس کے بھی کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔" نزہت نے بتایا۔ مائرہ عین اس کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھی۔

"حریم نے جو کچھ کیا ہے اس کے بعد تمہیں نہیں لگتا کہ اس کا اس گھر میں رہنا میرب کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔" مائرہ نے پھر سے وہی بات شروع کر دی جس سے دھیان ہٹانے کے لیے نزہت کے پرزور اصرار پر آج وہ اور وسیم صاحب سرشام اس گیدرنگ میں موجود تھے۔

"اس وقت یہ ٹاپک مت چھیڑو مائرہ! میں اس ٹینشن کو چائے کے ساتھ نگلنا نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ چائے پہ صرف خوش گوار باتیں ہونی چاہئیں بھئی...... ویسے یہ چائے ہے کدھر...... کینیا سے براہ راست تو نہیں آرہی؟" وسیم صاحب نے ماحول بدلنے کے لیے خوش گواریت کا مظاہرہ کیا تھا مائرہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

حریم گھر لوٹی تو ایک الگ زاویہ نظر اس کے ہمراہ تھا۔ گیٹ سے گاڑی اندر داخل ہوئی وہ گاڑی سے اتری تو دائیں جانب لان سے اٹھتے خوش گوار قہقہوں نے اس کے قدم ٹھٹکا دیے۔ نزہت نے یقیناً چمکتی دھوپ کو غنیمت جان کر سرشام لان ہی میں چائے کا اہتمام کر لیا تھا۔ رخصت ہوتی نرم سی دھوپ اور نزہت کے مقابل کین چیئر پہ مائرہ کے دائیں جانب بیٹھا وہ۔ جانے کس بات پر قہقہے لگائے جا رہے تھے۔ لیکن حریم کو اپنی نادانی کا شدت سے احساس ہوا۔ اسے دیکھ کر لان میں لحہ بھر کو خاموشی چھا گئی پھر مائرہ نے ہلکی آواز میں کچھ کہا تو نزہت کی ہنسی نے حریم کو بلاوجہ خفیف سا کر دیا وہ شاپنگ بیگ تھامے ان کی طرف دیکھے بنا تیز قدموں سے چلتی کوریڈور کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اس وقت اس کا کسی کو بھی امتحان میں ڈالنے کا ارادہ نہ تھا۔

"مما۔" ثریا کی بانہوں میں مچلتی میرب اسے دیکھتے ہی بری طرح اس کی طرف لپکنے لگی۔

"کیا بات ہے ثریا! کیوں تنگ ہو رہی ہے یہ؟" حریم نے میرب کے اپنی طرف اٹھے ننھے بازوؤں سے نظر چراتے ہوئے ثریا سے دریافت کیا تو وہ بے بسی سے بولی۔

"بے بی کو بھوک لگی ہے لیکن نہ دودھ بنانے دے رہی ہیں نہ نوڈلز۔"

"کیا بات ہے میرو! پرنسس! بھوک لگی ہے آپ کو؟" حریم نے شاپنگ بیگ صوفے پر ڈالتے ہوئے پیار سے میرب کو پچکارا تو اس نے معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو آپ بوا کو نوڈلز بنانے دیں پھر ہم دونوں مل کر کھائیں گے۔" حریم نے اسے للچایا تو وہ کسمسا کر ثریا کی گود سے نیچے اتر آئی۔

"بوا! میرو کو نوڈلز بنا دیں۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ لہرا کر ثریا کی گویا جان بخشی تو وہ مسکراتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ "گڈ گرل۔" حریم نے ہلکی سی تالی بجا کر اس کی تعریف کی تو وہ خوش ہو کر بھاگی اور حریم کے گھٹنوں سے لپٹ گئی۔

"مما! میرو کو اٹھالیں (اٹھالیں)۔" چہرہ حریم کی طرف اٹھائے وہ فرمائش کر کے منتظر نظروں سے حریم کو دیکھ رہی تھی۔ پچھلے دو ہفتوں سے اس نے دل پہ جبر کر کے میرب کو خود سے دور کیسے رکھا تھا یہ وہی جانتی تھی۔ اب اس

نے اتنی معصومیت سے کہا کہ تمام تر احتیاط اور ڈر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حریم نے اسے جھک کر اٹھالیا اور بے تحاشا اس کا منہ چوما۔ گلے سے لگایا تو نم آنکھوں کے ساتھ دل ٹھنڈا پڑ گیا۔

''چلیں بھئی۔ پیاری سی میرو کے لیے جب تک نوڈلز بنتی ہیں ہم اتنی دیر میں میرب کو ایک مزیدار سی فیری ٹیل سناتے ہیں۔'' حریم نے خوش گواریت سے کہا اور میرب کو بازوؤں میں اٹھائے ادھر ادھر چکر لگاتے ہوئے کہانی سنانے لگی تھوڑی دیر ہی گزری تھی جب وہ شاید میرب کو دیکھنے کے لیے ہی اندر آیا تو اسے حریم کی گود میں دیکھ کر آگ بگولہ ہونے لگا۔

''تم...... میں نے تم سے کہا تھا کہ میرب کے پاس مت آنا۔'' لاؤنج میں داخل ہوتے ہی دبے لہجے میں کہتے ہوئے جھپٹ کر میرب کو اس سے چھینا تو حریم کی بے اختیار چیخ نکلی ہی تھی میرب نے بھی اس کے سخت لہجے اور کھردرے انداز سے گھبرا کر رونا شروع کر دیا۔

''گیٹ لاسٹ۔'' حریم کو غصے سے دیکھ کر وہ پھنکارا۔

''ایسے مت کرو۔ بچی ڈسٹرب ہوگی۔'' حریم نے اسے احساس دلانا چاہا۔

''پپا...... مما پاس جانا ہے۔'' میرب نے حریم کی طرف بازو پھیلاتے ہوئے ٹانگیں چلائی تھیں۔

''میری پرنسس کو بھوک لگی ہوگی۔ ابھی ہم کھانا کھائیں گے۔'' وہ حریم کی طرف سے رخ موڑے میرب کو پچکار رہا تھا، حریم گنگ کھڑی صدمے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا واقعی وہ اس کی طرف سے اس قدر بدگمان تھا کہ اسے میرب کی دشمن سمجھنے لگا تھا۔ وہ تو یہی سمجھی تھی کہ وقتی غصہ ہے اترے گا تو وہ دوبارہ سے وہی نرم دل شخص بن جائے گا جو اس کی ہر نرم گرم بات میرب کی خاطر سہہ لیا کرتا تھا۔

''میرو! مما سے کھانا کھائے گی۔'' میرب مچلی۔

''مما سے نہیں...... آج پپا کھلائیں گے میرو کو۔'' وہ جبر سے مسکرایا۔

''نہیں...... نہیں۔'' میرب نے اور شدت سے ٹانگیں چلائیں۔

''میرو! پتا ہے نا۔ یہ مارتی ہے آپ کو۔'' اس نے حریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنگ دلی کی تمام حدود پار کر دی تھیں حریم کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔

''نہیں...... میرو کو مما کے پاس جانا ہے۔'' میرب کی ایک ہی رٹ تھی۔ ثریا نوڈلز کا باؤل لے کر آئی تو حریم جلدی سے منظر سے ہٹ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی ملازمہ کے سامنے بے وقعت ہونا اسے گوارہ نہ تھا حالانکہ وہ جانتی تھی شاید ملازمین اس گھر کے تمام رازوں سے واقفیت رکھتے ہوں۔ لیکن بہرحال...... بظاہر پردہ تھا تو پردہ ہی رہتا۔ اسے اپنے پیچھے میرب کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ دل پہ پتھر رکھتی وہ کمرے میں آکر بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

خوش حال سے تم بھی لگتے ہو
یوں افسردہ تو ہم بھی نہیں
پر جاننے والے جانتے ہیں
خوش تم بھی نہیں
خوش ہم بھی نہیں
تم اپنی خودی کے پہرے میں
اور دام غرور میں جکڑے ہوئے
ہم اپنے زعم کے نرغے میں

انا ہاتھ ہمارا پکڑے ہوئے
اک مدت سے غلطاں و پیچاں
ہم اپنے آپ سے الجھے ہوئے
گوتم نے ستارے ڈھونڈ لیے
جینے کے سہارے ڈھونڈ لیے
طوفان سے سنبھلے ہم بھی نہیں
کہنے کو کنارے ڈھونڈ لیے
خاموش سے تم ہم مہر بہ لب
جگ بیت گئے تک بات کیے
پچھتاوے کے انگاروں میں
محصور تلاطم آج بھی ہیں
سنو! کھیل ادھورا چھوڑتے ہیں
بنا چال چلے بنا مات کیے
جو بھاگتے بھاگتے تھک جائیں
وہ سائے رک بھی سکتے ہیں
چلو توڑو قسم اقرار کرو
ہم دونوں جھک بھی سکتے ہیں

وہ آزردہ تھی...... بے حد آزردہ...... کچھ زندگی کی اتھل پتھل اور کچھ بجل کی ذہن میں ہلچل مچاتی باتیں...... کبھی اپنا آپ بے حد مظلوم لگنے لگتا اور کبھی پہلی بار یہ احساس ہونے لگتا کہ شاید یا واقعی...... حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے بن مانگے اسے سب کچھ دے دیا تھا۔ زلفی سے چھٹکارا...... گھر، گاڑی، روپیہ، ہینڈسم شوہر اور پیاری سی میرب...... زندگی گزارنے کے لیے اور کیا چاہیے ہوتا ہے؟ اُفف...... میرے اللہ۔ کیا صحیح ہے اور کیا غلط...... اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

دروازہ کھلا اور میرب بھاگتی ہوئی اندر آئی تھی۔ حریم نے بے ساختہ ہی جھک کر بانہیں وا کر دیں تو وہ اس کے سینے میں سما گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے حریم سٹپٹائی۔ وہ نوڈلز کا باول ہاتھ میں لیے میرب کے پیچھے تھا۔

"یہ اسے کھلا دو۔ اس کی ضد ہے۔"

وہ باؤل آگے بڑھاتے ہوئے ہارے ہوئے لہجے میں بولا تو اتنے سنجیدہ ماحول میں بھی حریم کا دل چاہا چٹا چٹ میرب کے بوسے لے ڈالے اس نے آرام سے باول تھام لیا اور میرب کو سامنے بٹھا کر نوڈلز کھلانے لگی۔ وہ سامنے کاؤچ پہ سرد تاثرات لیے بیٹھا ان دونوں کی لگاوٹ کے مظاہرے دیکھتے ہوئے یقیناً سچ جھوٹ کی تمیز نہیں کر پا رہا تھا۔ میرب کے الفاظ اور انداز آپس میں میل نہیں کھاتے تھے۔ اتنی ظالم ماں کے لیے میرب کی بے ساختہ اور والہانہ محبت اگنور کیے جانے والی نہیں تھی۔ وہ لاشعوری طور پہ حریم پر نظر جمائے سوچوں کے اژدھام میں گم تھا۔ پھر اسی خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ حریم نے گویا کب کی روکی سانس آزادانہ سینے سے خارج کی تھی۔

میرب کے معاملے میں وہ کسی بھی طور سہی لیکن حریم پر بھروسا کرنے پر مجبور تھا۔ شک کے ساتھ ہی سہی۔ حریم کے ہونٹوں پر مغموم سی مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

''اب بس بھی کردو۔ دیکھ لیا نا تم نے اپنی من مانی کر کے۔ کیا ملا اپنی اور میرب کی زندگی برباد کر کے تمہیں۔'' نزہت اس پر خفا ہو رہی تھیں ابھی وہ مائرہ کو گھر ڈراپ کر کے آیا تھا۔

''مما پلیز...... اس وقت نہیں۔ میرا موڈ آل ریڈی بہت خراب ہے۔'' وہ تھکا تھکا سا صوفے میں دھنس گیا۔ ''سارے راستے مائرہ میرا دماغ کھاتی گئی ہے۔''

''اب کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ...... میرب کے ساتھ اس لڑکی کے ظالمانہ رویے نے فیصلہ بہت آسان کر دیا ہے تمہارے لیے۔ مائرہ بھی بہت بدل گئی ہے۔ اب وہ میرب کو سنبھال سکتی ہے بیٹا۔'' نزہت یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھیں۔

''میں اس وقت ذہنی طور پہ بہت ڈسٹربڈ ہوں مما! مجھے کوئی بھی بات اچھی نہیں لگ رہی... اور میں نہیں چاہتا کہ جذباتیت میں آ کر مزید غلط فیصلے کر ڈالوں۔'' اس نے بلاواسطہ نزہت کو اس لایعنی بحث سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''زندگی برباد کرنے والا فیصلہ تو کر ہی چکے ہو اب ہمت کرو اور دوبارہ سے زندگی آباد کر لو اپنی۔ یہ لڑکی ہمارے گھر کو برباد کر دے گی۔ اپنی بہن کی طرح۔'' نزہت نے اسے نئی راہ دکھائی۔

''مما پلیز۔'' نا چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی آواز اور لہجے کو تیز ہونے سے روک نہیں پایا تھا۔

''اب تو معاف کر دیں اسے۔ جو اس دنیا میں موجود ہی نہیں۔'' وہ ضبط کی تصویر بنا تھا نزہت خفیف سی ہو گئیں۔

''مجھے صرف تمہاری اور میرو کی خوشی اور سکون عزیز ہے۔ اس لیے جذباتی ہو جاتی ہوں بیٹا۔'' انہوں نے فوراً اپنا انداز بدلا اور پیار سے بولیں۔

''اٹس او کے۔'' اس نے بھی خود کو نارمل کیا۔ ''بس یہ موضوع چھوڑ دیں۔ میں اس معاملے کو خود سکون سے حل کرنا چاہتا ہوں مما! پلیز۔'' اس نے آخر میں ان سے التجا کی تو نزہت بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

وہ کمرے میں آیا تو ذہنی کیفیت پراگندگی کا شکار تھی نزہت کی باتیں اور حریم کا میرب کے ساتھ ناروا سلوک اس کے سکون کو درحقیقت درہم برہم کر چکا تھا۔

میرب کو سلاتی حریم نے سر گھما کر اسے اندر آتے دیکھا۔ وہ اچٹتی نگاہ بیڈ کی طرف ڈال کر کپڑے تبدیل کرنے ڈریسنگ روم میں چلا گیا پھر باہر آ کر اپنا لیپ ٹاپ لیا اور بیڈ پہ ٹیک لگا کر بیٹھ کر اپنی دراز کی ہوئی ٹانگوں پہ لیپ ٹاپ رکھتے ہوئے آن کر لیا۔ میرب کو سلا کر حریم بھی کپڑے تبدیل کرنے کے ارادے سے اٹھی۔ کل تو وہ نیچیں کاوچ پر سو گئی تھی لیکن آج کے لیے صاحب کا حکم تھا کہ وہ کہیں اور بندوبست کر لے وہ ڈریسنگ روم سے کپڑے تبدیل کر کے نکلی تو وہ اپنے کام میں منہمک تھا حریم سست روی سے چلتی بیڈ کی طرف آئی اور ہاتھ بڑھا کر اپنا تکیہ اٹھا لیا۔ وہ چونک کر حریم کی طرف متوجہ ہوا تو وہ گڑبڑائی۔

''آہم۔'' اس نے کھنکھارتے ہوئے بات شروع کی۔ ''میں ڈریسنگ روم میں سونے کے لیے جگہ بنا لیتی ہوں۔''

''ہمم...... جو تم کر چکی ہو ان حالات میں یہی بہتر ہوگا۔'' وہ بے رخی سے بولا تو حریم کا دل دکھ سا گیا۔ ناجانے کیوں اب اس کا بدلا ہوا رویہ بے حد محسوس ہونے لگا تھا۔

''میں اپنی صفائی میں مزید ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔ میرب کا مجھ سے لگاؤ تم دیکھ چکے ہو۔ اگر میں مجرم

ہوتی تو تم میرب کی مجھ سے نفرت اور خوف دیکھتے۔" حریم کو اس کے انداز نے تکلیف دی تھی لیکن وہ بہت تحمل سے کہتی پلٹ گئی۔

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی جو میں نے میرب کے لیے تمہیں چنا۔ لیکن مجھے امید ہے ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں بہت جلد کوئی بہتر فیصلہ کرلوں گا۔ مما چاہتی ہیں کہ میں مائرہ سے شادی کرلوں۔ مائرہ یقیناً میرب کے لیے بہترین ماں ثابت ہوگی۔" وہ پرسکون انداز میں کہہ رہا تھا حریم تڑپ کر بے اختیار اس کی طرف پلٹی۔

"تم یہ بات دعوے سے کیسے کہہ سکتے ہو؟ مائرہ کو بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بالخصوص میرب سے۔" حریم نے تیز لہجے میں احتجاج کیا۔

"تمہیں میرب میں جتنی دلچسپی ہے اور جتنا اس کا خیال ہے وہ بھی سب دیکھ رہے ہیں۔" اس نے کڑا طنز کیا تھا جسے حریم نے بڑے حوصلے سے برداشت کیا۔

"میری سچائی کا گواہ صرف اللہ ہے۔ میں اپنے لیے مزید قسمیں نہیں کھاؤں گی۔ لیکن میں میرب کو کبھی بھی مائرہ کے حوالے نہیں کروں گی میرب میری بہن کی بیٹی ہے۔ اور معذرت کے ساتھ مائرہ کے لیے میرب کی حیثیت اس کی سوتن کی بیٹی سے زیادہ ہرگز نہیں۔ مجھ سے زیادہ میرب سے کوئی بے غرض پیار نہیں کرسکتا۔ مائرہ کو "تم" چاہیے ہو جبکہ مجھے صرف میرب۔" آج پہلی بار اپنے حق کے لیے لڑتے ہوئے حریم کا دل عجیب سی بے چینی اور بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"اپنے فضول کے تجزیے اپنے پاس ہی رکھو۔ میں اپنے کسی فیصلے کے لیے تمہاری اجازت اور مرضی کا محتاج نہیں ہوں۔" اس کے الفاظ سن کر وہ خفیف سا جھڑکا۔

"تم نے جس طور میرے قدموں تلے سے زمین نکالی ہے۔ مجھے بے یارومددگار کیا ہے اس کے بعد اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ اتنی آسانی سے مجھے چھوڑ کر مائرہ کو میری جگہ دے دو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔" حریم نے ایک بار پھر سے بے ترتیب ہوتے تنفس کے ساتھ بڑی ہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ پہلے تو شاید اس کی ہمت پہ حیران ہوا پھر لیپ ٹاپ زور سے بند کر کے سائڈ پہ ڈالتا اٹھ کر حریم کے مقابل آیا۔

"تمہاری جگہ......؟" وہ عجیب سے انداز میں بولا اور بازو سینے پر لپیٹے۔

"ان چھ ماہ میں تم نے کبھی غور کیا ہے کہ تم نے میری زندگی میں خود کو کس جگہ پہ رکھا ہوا ہے......اور ہمارا آپس میں رشتہ کیا ہے؟"

حریم نے دم سادھ لیا۔

"تم ایک امتحان کے لیے آئی تھیں حریم! اور مجھے افسوس ہے کہ تم زیرو بٹا زیرو ہو۔ یعنی مکمل فیل۔" وہ اس کے بالمقابل کھڑا اس کی ذات کے پرخچے اڑا رہا تھا اور حریم بے بسی سے اسے دیکھنے پر مجبور تھی۔

"امید ہے ان سب باتوں پر غور کرتے ہوئے تمہیں اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے آسانی ہوگی۔" وہ سنگ دلی سے کہہ رہا تھا حریم کا دم حلق میں اٹکنے لگا۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

ہنسی کے گماں میں رُلائے محبت
کبھی راکھ میں گُل کھلائے محبت

کبھی پوری دُنیا لگے مختصر سی
کہیں اک نظر میں سمائے محبت

یکایک کرے سبز بنجر زمینیں
کبھی آگ جل میں لگائے محبت

ہوا کو خبر دے، کبھی مانگے بارش
دِلوں میں دیے پھر جلائے محبت

ہینوال نے سیکھا کچے گھڑے سے
چنابوں میں سوہنی بہلائے محبت

زلیخا جنوں میں کرے چاک دامن
بڑی ہی نڈر ہے تو ہائے محبت

فقیروں کو کر دے سخی اک نظر میں
گدا بادشاہ کو بنائے محبت

سزا ہے جزا ہے خطا ہے عطا ہے
صبا کون تجھ کو بتائے محبت

صبا بٹ

بہت سادہ ہے وہ
اور اُس کی دُنیا میری دُنیا سے
سراسر مختلف ہے
الگ ہیں خواب اُس کے
زندگی میں اُس کی ترجیحات ہی
کچھ اور لگتی ہیں
بہت کم بولتا ہے وہ
مجھے اُس نے لکھا ہے
صبح میں نے لان میں
کچھ خوبصورت پھول دیکھے
مجھے بے ساختہ یاد آگئیں تم
مجھے معلوم ہے
میں عمر کے اُس ملگجے حصّے میں ہوں
جب میرا چہرہ کسی بھی پھول سے
قربت نہیں رکھتا
مگر جی چاہتا ہے اُس کی باتوں پر
ذرا سی دیر کو ایمان لے آؤں

پروین شاکر

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ نے فرمایا ہے۔ اے آدم کے بیٹے! تو خرچ کر، تجھ پر خرچ کیا جائے گا۔" (بخاری مسلم)

فائدہ:۔
اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے پر خرچ کیا جائے گا کا مطلب ہے۔ اللہ اسے فراخی اور بہتر بدلہ عطا فرمائے گا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔" بدترین دوست وہ ہے جس سے مجھے معذرت اور تکلف کرنے کی ضرورت پڑے۔"

دوستوں کے درمیان تکلف،

حضرت جنید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔" میں نے بہت سے بھائیوں کو دیکھا ہے مگر کہیں بھی ایسے دوست نہیں دیکھے جن کے درمیان بلاوجہ کے حشمت و تکلف کا سلوک و معاملہ ہو۔"
(کیمیائے سعادت، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ)

عفو و درگزر،

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ اللہ نے حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا۔
"میں نے تیرا مرتبہ اور نام اس بنا پر بلند کیا کہ تو نے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا۔"
(کیمیائے سعادت)

تحمل اور بردباری،

احمد بن قیس رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا۔ آپ نے تحمل اور بردباری کس سے سیکھی ہے؟"
فرمایا۔" قیس بن عاصم سے۔ کہ ایک دفعہ ان کی لونڈی بکری کا بھنا ہوا بچہ لوہے کی سلاخ میں لگا کر لا رہی تھی کہ اتفاقاً اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لڑکے پر گر پڑا اور وہ مر گیا۔ لونڈی ڈر کے مارے بے ہوش ہو کر گر گئی۔"
حضرت قیس بن عاصم رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔
"سنبھل تیرا کوئی قصور نہیں اور میں نے تجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں آزاد کر دیا۔"
(کیمیائے سعادت)

انصاف،

انگریز جج نے کوئی سوا دو ہزار سال پہلے لاطینی زبان کے ایک اصول کو اپنے فیصلے میں شمولیت ہوئے تاریخ رقم کی تھی۔
(انصاف ہر حال میں ہونا چاہیے چاہے آسمان ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے۔)

بیوی کو راضی کرنا،

بیوی:۔" میں ذرا میکے جانا چاہتی ہوں۔"
خاوند:۔ اللہ کی امان ہو، سب کو میرا سلام کہنا۔"
بیوی:۔" تم تو مجھ سے جان چھڑانے کے لیے بیٹھے ہوتے ہو۔"

خاوند: "لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔"

بیوی: "میں ذرا میکے جانا چاہتی ہوں۔"
خاوند: "آج ادھر ہی رہو، میرے ساتھ کسی اور دن چلی جانا۔"
بیوی: "تم تو بس مجھے ہر وقت اسی گھر میں ہی قید رکھنا چاہتے ہو۔"
خاوند: "لاحول ولاقوۃ۔"

بیوی: "میں ذرا میکے جانا چاہتی ہوں۔"
خاوند: "جیسے تمہیں اچھا لگے۔"
بیوی: "تو گویا میرا ہونا نہ ہونا تمہارے لیے ایک برابر ہے۔ میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں اس گھر میں۔"
خاوند: "لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔"

بیوی: "میں ذرا میکے جانا چاہتی ہوں۔"
خاوند: "کہو تو میں تمہارے ساتھ چلوں۔"
بیوی: "یعنی میں میکے اس لیے جا رہی ہوں کہ میری آپ سے وہاں پر ملاقات طے ہے؟ مجھے کچھ آرام چاہیے، اس لیے جا رہی ہوں۔"
خاوند: "لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔"

نتیجہ،

ہر علم ہر عالم، بشر، جن، بھوت، نباتات اور ساری جمادات ابھی تک کوئی ایسا جواب ڈھونڈنے سے قاصر ہیں۔ جس سے بیوی راضی ہو جائے۔

اعتبار،

میٹنگ میں میرے دائیں طرف ایک لڑکا اور بائیں طرف گوری چٹی لڑکی بیٹھی تھی۔

میٹنگ شروع ہوئی۔ کچھ دیر میں میرے جوتے سے پاؤں ٹکرایا۔ میں نے نیچے دیکھا۔ کالے رنگ کا ایک پاؤں تھا۔

میں نے لڑکے سے کہا۔ "یہ میٹنگ ہال ہے۔ تیرے والد صاحب کی بیٹھک نہیں جو اتنا ریلیکس ہو کر بیٹھا ہے۔ پیچھے کر اپنا پاؤں۔"

لڑکے نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "یہ میرا پاؤں نہیں ہے۔"

یہ سنتے ہی میں نے لڑکی کا گورا چٹا منہ دیکھا اور اس کا کالا سیاہ پاؤں دیکھا۔ میرا رہا سہا اعتبار بھی انسانیت سے اٹھ گیا۔

رائے،

پطرس بخاری مرحوم کو کالج چھوڑنے کے کئی سال بعد یاد آیا کہ انہوں نے کالج کینٹین کے کھاتے کی ادائیگی نہیں کی تھی۔ اب کچھ جسمانی و مالی فراغت میسر تھی تو سوچا بنفس نفیس کالج جا کر کھاتہ کلیئر کیا جائے۔ اور یادیں بھی تازہ کی جائیں۔

پطرس کالج گئے۔ کینٹین مالک کو اپنا تعارف اور تعلیمی سال یاد کرواتے ہوئے کھاتہ رجسٹر کھلوایا تو ان کے ذمہ بیس روپے واجب الادا نکلے۔

بخاری صاحب نے بصد شکریہ و معذرت بیس روپے پیش کرنا چاہے تو کینٹین والے نے تاریخی جملہ کہا۔

"بخاری صاحب! آپ کا کیا خیال ہے کہ پچھلے بائیس سال سے جو رائے میں نے آپ کے بارے میں قائم کی ہے یہ بیس روپے لینے کے بعد بدل جائے گی۔"

اقوال زریں،

☆ تعلیم کا آغاز تو ماں کی گود سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت کا ہر لفظ بچے کے کردار کی تعمیر پر اثر ڈالتا ہے۔ ہر ماں باپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے۔ (بیکن)

☆ ہر مذہب کسی نہ کسی وجہ سے قابل احترام ہے دوسرے مذہب کا احترام کر کے انسان اپنے مذہب کو اونچا اٹھاتا ہے۔ (اشوک)

☆ غصہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کی غلطیوں کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں۔ یہ

کتنی حیرت انگیز اور مضحکہ خیز بات ہے۔
(پوپ)

☆ نصیحت حقیقی خیر خواہ ہے جس پر ہم توجہ نہیں دیتے اور خوشامد صریح دھوکا ہے جسے ہم غور سے سنتے ہیں۔
(شیکسپیئر)

☆ نیکی کرنا میری عادت ہے اور خدا کے سامنے جھکنا میرا مذہب۔
(والٹیئر)

نادیہ یاسر۔ گوجر خان

ماسٹر تو ماسٹر ہوتا ہے

ماسٹر صاحب اسکول سے تھک کر گھر واپس آئے اور کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ کھاتے کھاتے اپنی بیوی کو بتایا۔

"کھانا اچھا نہیں ہے، کوئی ذائقہ نہیں آ رہا۔"
بیوی اپنی برائی کا بدلہ لینے کے لیے اٹھی اور کووڈ ہیلپ لائن کو فون کیا اور ایمبولنس کو بلا لیا اور کہا۔ "ان کو کھانے کا ذائقہ نہیں آ رہا ہے۔"
ایمبولنس ماسٹر کو کووڈ اسپتال لے گئی اور انہیں قرنطینہ کر دیا۔ اس طرح بیوی نے اس کا بدلہ لیا۔
دوسری طرف ماسٹر صاحب سے یہ پوچھا گیا۔
"آپ کے ساتھ کس کس کا رابطہ ہوا؟"
ماسٹر صاحب نے بالکل سکون سے کہا۔
"میری بیوی، میرے سسر، میری ساس، میرے دو سالے، میری تین سالیاں، میرے تین ساڑھو اور خالہ نذیراں، جنہوں نے میرا رشتہ کروایا۔"
اب یہ سارے لوگ بھی کووڈ اسپتال کے بستر پر بیٹھے ہوئے ماسٹر صاحب کو گھور رہے ہیں اور ان کی اہلیہ سوچ رہی ہیں کہ کاش میں نے انہیں اچار دے دیا ہوتا۔
ماسٹر تو ماسٹر ہوتا ہے۔

باپ

ایک باپ نے اپنے بیٹے کو دو تین تھپڑ رسید کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو جلد سے اپنے بیٹے کو سوری بول دیا۔
بیٹا: "ابو جان! ایک کاغذ لیں، اس کو اچھی طرح رول کریں۔ پھر واپس اس کاغذ کو کھولیں۔ کیا وہ پہلے جیسا ہی کڑک اور نیا ہے؟"
باپ: "نہیں..."
بیٹا: "صحیح کہا۔ رشتے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں سوری یا معذرت کرنے سے کام نہیں چلتا۔"
باپ: "اچھا بیٹا ایک کام کرو۔ باہر میرا اسکوٹر کھڑا ہے؟ جاؤ اور اس پر ایک کک مارو۔" بتاؤ وہ اسٹارٹ ہوا؟"
بیٹا: "جی نہیں...!"
باپ: "اب اسے تین چار کک مارو۔"
بیٹا: "ہو گیا اسٹارٹ۔"
باپ: "تو بھی وہی اسکوٹر ہے کوئی کاغذ نہیں۔ اٹھ بغیرتا اینڈا توں اشفاق احمد۔"
نمرہ، اقرا۔ کراچی

عظیم مفکرین کے اقوال

☆ میں تصنع اور بناوٹ کے ساتھ الفاظ کا جادو جگانے سے قاصر ہوں لیکن اپنی خوش گفتاری سے لوگوں کے دل موہ لیتا ہوں۔
(شیکسپیئر)

☆ مصیبتیں اور دکھ ہمیں اپنی کم ہمتی کے باعث زیادہ خوف ناک نظر آتے ہیں۔
(ارسطو)

☆ انسان کی قدر و قیمت اس چیز سے نہیں جو اسے حاصل ہو جائے بلکہ اس چیز سے ہے جس کے حصول کے لیے وہ تڑپتا رہے۔
(خلیل جبران)

☆ جب تمہیں اپنے آپ کو بلند کرنے کی خواہش ہوتی ہے تو تم نظر اوپر اٹھاتے ہو، مگر میں نیچے کی طرف دیکھتا ہوں کیونکہ میں خود بلندی پر ہوں۔
(نطشے)

فضہ بلال۔ ڈیفنس گارڈن

خالدہ جیلانی

صبا کرن ____ محراب پور

جانتے ہیں کہ یقین ٹوٹ رہا ہے دل پر
پھر بھی اب ترک یہ وحشت نہیں کی جا سکتی

ارم کمال ____ فیصل آباد

بھیڑ میں اکیلے پن کا احساس ہوتا ہے
تیرے بن یہ حال ہے میری تنہائی کا
تم ہی نے ہماری کوئی خبر نہ لی جاناں
ورنہ ہمیں دعویٰ تھا تیری دلربائی کا

رابعہ گل، حنا گل ____ کراچی

ٹھٹھرتی ہوئی شب سیاہ اور وہ بھی طویل تر
محسن ہجر کے ماروں پہ قیامت ہے دسمبر

مفضہ بلال ____ ڈیفنس

کہتے کہتے کچھ بدل دیتا ہے کیوں باتوں کا رخ
کیوں خود اپنے آپ کے بھی ساتھ وہ سچا نہیں

افشاں ریحان ____ کراچی

اپنی تو محبت کی بس اتنی کہانی ہے
ٹوٹی ہوئی کشتی ہے ٹھہرا ہوا پانی ہے
اک پھول کتابوں میں دم توڑ چکا ہے
کچھ یاد نہیں آتا یہ کس کی نشانی ہے

ستیدہ نسبت زہرا ____ کہروڑ پکا

ابھی تک پاؤں سے چمٹی ہیں زنجیریں غلامی کی
دن آ جاتا ہے آزادی کا آزادی نہیں آتی

نشاء اویس ____ کراچی

محبت کی زنجیر سے ڈر لگتا ہے
کچھ اپنی تقدیر سے ڈر لگتا ہے
جو مجھے آپ سے جدا کرتی ہے
ہاتھ کی اس لکیر سے ڈر لگتا ہے

آسیہ جاوید ____ علی پور چٹھہ

اپنی مٹھی میں چھپا کر کسی جگنو کی طرح
ہم تیرے نام کو چپکے سے پڑھا کرتے ہیں

نوال افضل گھمن ____ گجرات

یقیں کی راہ کوئی کیسے اختیار کرے
تمہارے بعد کوئی کس کا اعتبار کرے

نادیہ یاسر ____ گوجر خان

ہار جاتا ہے جب وہ میری دلیلوں کے سبب
کوئی تہمت میرے کردار پہ رکھ دیتا ہے

فاکہہ سہیل ____ کراچی

محبت نرم لہجوں میں ہمیشہ سانس لیتی ہے
ذرا جو سخت ہوں لہجے تو الفت روٹھ جاتی ہے

بشریٰ رضوان ____ بہاول پور

کتنا مشکل ہوتا ہے اس شخص کو منانا
جو ناراض بھی نہ ہو اور بات بھی نہ کرے

شہرین اسلم ____ بہاول پور

تو سورج ہے تجھے کہاں معلوم رات کا دکھ
تو کبھی روز اتر میرے گھر میں شام کے بعد

ثمرہ، اقرا ____ کراچی

حکم یہ ہم کو ملا اس کے سوا کچھ مانگیں
اٹھ گئے دست دعا اب یہ دعا کچھ بھی نہیں
تیری خاطر عمر بھر کا رت جگا ہم کو قبول
چاہتوں میں ایک شب کا جاگنا کچھ بھی نہیں

سعدیہ عرفان ____ شریف آباد

رات چپکے سے دسمبر نے یہ سرگوشی کی
پھر سے ایک بار رلا دوں تجھے جاتے جاتے

امتُ الصبُور

حمدہ خان — کی ڈائری سے

جاوید اختر کی شاعری زندگی کی شاعری ہے۔ وہ زمینی حقائق اور لطیف احساسات پر مبنی ان کی شاعری دل کو چھو لیتی ہے۔ ان کی یہ غزل جو موجودہ حالات کی ترجمان ہے۔ قارئین کی نذر۔

جینا مشکل ہے کہ آسان، ذرا دیکھ تو لو
لوگ لگتے ہیں پریشان، ذرا دیکھ تو لو

یہ نیا شہر تو خوب بسایا تم نے
کیوں پرانا ہوا ویران، ذرا دیکھ تو لو

ان چراغوں کے تلے ایسے اندھیرے کیوں ہیں
تم بھی رہ جاؤ گے حیران، ذرا دیکھ تو لو

پھر مقرر کوئی سرگرم سرِ منبر ہے
کس کے ہے قتل کا سامان، ذرا دیکھ تو لو

تم یہ کہتے ہو کہ میں غیر ہوں پھر بھی شاید
نکل آئے کوئی پہچان، ذرا دیکھ تو لو

واصفہ سہیل — کی ڈائری سے

وہ لوگ جو انسانوں کو مار کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے ان کو ختم کر دیا۔ ہمارے جرائم کا گواہ کوئی نہیں۔ مگر ہمیشہ ایسے نہیں ہوتا۔ محسن نقوی کی یہ غزل تمام پڑھنے والوں کے نام۔

میرے سوا سرِ مقتل مقام کس کا ہے
کہو کہ اب لبِ قاتل پہ نام کس کا ہے

یہ تخت و تاج و قبا سب انہیں مبارک ہوں
مگر یہ نوکِ سناں احترام کس کا ہے

ہماری لاش پہ ڈھونڈو نہ انگلیوں کے نشان
ہمیں خبر ہے عزیزو! یہ کام کس کا ہے

فنا کے ہانپتے جھونکے ہوا سے پوچھتے ہیں
جبینِ وقت پہ نقشِ دوام کس کا ہے

تمہاری بات تو غلط تھی مٹ بھی گئی
اُتر گیا جو دلوں میں کلام کس کا ہے

وہ مطمئن تھے بہت قتل کر کے محسن کو
مگر یہ ذکرِ وفا صبح و شام کس کا ہے

ماہ تاب خان — کی ڈائری سے

کرشن بہاری نور کی یہ غزل مجھے ایک دوست نے بھیجی تھی۔ آپ سب کی نذر کر رہی ہوں۔

زندگی سے بڑی سزا ہی نہیں
اور کیا جرم ہے پتا ہی نہیں

اتنے حصوں میں بٹ گیا ہوں میں
میرے حصے میں کچھ بچا ہی نہیں

چاہے سونے کے فریم میں جڑ دو
آئینہ جھوٹ بولتا ہی نہیں

ہے ہر درد کا درماں یوں تو مگر
اک ہمارے روگ کی دوا ہی نہیں

یوں تو آنسوؤں کی کمی نہ تھی
اک دل تھا اپنا کہ بھرا ہی نہیں

دھن کے ہاتھوں بک گئے ہیں سب ہی
اب کسی جرم کی سزا ہی نہیں

تحریر ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ خوبصورت نظم آپ
سب کی نذر

تمہیں کس نے کہا پگلی
مجھے تم یاد آتی ہو
بہت خوش فہم ہو تم بھی
تمہاری خوش گمانی ہے
میری آنکھوں کی سرخی میں
تمہاری یاد کا مطلب!
میرے شب بھر کے جگنے میں
تمہارے خواب کا مطلب
یہ آنکھیں تو ہمیشہ سے ہی
میری سرخ رہتی ہیں
تمہیں معلوم ہی ہوگا
اس شہر کی فضا کتنی آلودہ ہے
اور یہ سوزش اس فضا کے باعث ہے
تمہیں کس نے کہا پگلی
کہ میں شب بھر نہیں سوتا
مجھے اس نوکری کے سب جھمیلوں سے
فرصت ملے تو تب نا
میری باتوں میں لرزش ہے
میں اکثر کھو سا جاتا ہوں
تمہیں کس نے کہا پگلی
محبت کے علاوہ اور بھی تو درد ہوتے ہیں
فکر معاش، سکھ کی تلاش
ایسے اور بھی غم ہیں
اور تم
ان سب غموں کے بعد آتی ہو

تمہیں کس نے کہا پگلی
مجھے تم یاد آتی ہو
یہ دنیا والے پاگل ہیں
ذرا سی بات کو یہ افسانہ سمجھتے ہیں
مجھے اب بھی یہ پاگل
تیرا دیوانہ سمجھتے ہیں
تمہیں کس نے کہا پگلی
مگر شاید!!
مگر شاید میں جھوٹا ہوں
میں ریزہ ریزہ ٹوٹا ہوں

نادیہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: Info@khawateendigest.com

سلمیٰ مسرت...... راولپنڈی

دسمبر کا شمارہ میں نے بہت چاہت سے کھولا کہ میرا باورچی خانہ سب کو کیسا لگا، کوئی ذکر نہیں۔ صرف بہن ریحانہ چوہدری نے پراٹھوں کی تعریف کر کے میرا سارا شکوہ دور کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں آپ نے پھر میرا دل توڑ دیا کہ یہ باورچی خانہ گل مردان کا ہی تھا، سہواً سلمیٰ مسرت کا نام لگ گیا۔ فہرست میں بھی گل کا ہی نام تھا۔ اب آپ خود بتائیں، ایک قاری اس محفل کو پینتیس سال سے پڑھے، وہ اس محفل میں پتا نہیں کتنے مرحلوں سے گزر کر شریک ہو، اس کے ساتھ آپ یہ سلوک کریں۔ اس کا دوبارہ آنے کو دل چاہے گا۔ باقی خطوط میں لڑکیاں جو مجبوریاں، مشکلیں بتاتی ہیں، میں نے شادی کے بعد اور شادی سے پہلے بھی اس سے زیادہ مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ میرے شوہر نے دو دو تین جابز کر کے اس گھر کو مکمل کیا، بچوں کو پڑھایا۔ ایک وقت تھا، والدین اکیلے تھے، ساس کو فالج تھا اور بچے بہت چھوٹے تھے۔ اس وقت کس طرح پیسے جمع کر کے یہ رسائل خریدتی تھی اور کس طرح وقت نکالتی تھی ان کو پڑھنے کے لیے کیونکہ یہ میرا حوصلہ تھے۔ میری ٹینشن کو کم کرتے تھے۔ آج الحمدللہ خوش حالی ہے، نیک صالح اولاد ہے اور یہ سب میرے والدین اور میری ساس سسر کی دعاؤں کی بدولت ہے اور قرآن کی برکتیں ہیں کہ میرے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت رکھ دی ہے۔

☆ پیاری بہن! ہمیں بے حد افسوس ہے، بلکہ شرمندہ ہیں۔ واقعی آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ اب اس کی تلافی اس طرح کر رہے ہیں کہ آپ کا خط پہلے نمبر پر لگا رہے ہیں تاکہ قارئین نوٹ کر لیں، باورچی خانہ آپ نے لکھا تھا۔ جہاں تک قارئین کی تعریف کا تعلق ہے تو آپ یقین کریں ہمیں ہر ماہ اتنی بڑی تعداد میں خط موصول ہوتے ہیں کہ ہم سارے خط شامل ہی نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے خطوں میں قارئین نے تعریف کی ہو اور وہ خط شامل نہ ہو سکے ہوں۔ آپ دل میں ملال نہ رکھیں۔

ممتاز بنت حسن...... کراچی

فاخرہ جبیں کا انٹرویو پڑھا، پسند آیا۔ پلیز نمرہ احمد کا تفصیلی انٹرویو لیں اور حالم سے متعلق اور ان کی پرسنل لائف کے بارے میں بھی پوچھیں۔ حنا بشریٰ کے ناولٹ "سب کھیڈ نصیباں دا" میں یہ بات پسند نہیں آئی کہ جب حکیم عبدالمتین برسر روزگار تھے، حکیم بھی تھے، نکاح خواں بھی۔ بیوی کپڑے سینے والی درزن تو نور فاطمہ کی شادی میں گاؤں والوں نے کیوں کر اشیائے ضرورت لا کر دیں۔ تحریر اچھی تھی۔ "آواز کا ڈھول" اچھی تحریر تھی۔ قرۃ العین خرم ہاشمی! آپ نے بہت اچھا لکھا۔ راحت جبیں کی "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" بہت خوب لکھا۔ پہلی ہی قسط زبردست، جس طرح انہوں نے نرمین کے گھر کا بیک گراؤنڈ لکھا، بہت اچھا لکھا۔ دوسری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

☆ ممتاز بہن! آپ اتنا اچھا اور اتنا صحیح صحیح تبصرہ کرتی ہیں کہ پڑھ کر مزا آجاتا ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ خواتین کو کتنی محبت اور توجہ سے پڑھتی ہیں۔ آپ ہر ماہ باقاعدگی سے لکھیں، ہمیں خوشی ہوگی۔

آپ کو گاؤں کی غربت کا اندازہ نہیں ہے۔ حکیم صاحب ویسے بھی پیسے کے لالچی نہیں تھے، انہیں جو دے جاتا رکھ لیتے۔ جہاں تک کپڑے سینے کا تعلق ہے تو شہر میں بھی گھر میں کپڑے سینے والی خواتین کو مرد درزیوں کی نسبت کم پیسے ملتے ہیں تو پھر گاؤں کا اندازہ لگالیں۔ کیا ملتا ہوگا۔

عابدہ وحید...... نامعلوم شہر

اب جب رسالہ آتا ہے تو پہلے ہمارے ہاتھ میں نہیں آتا بلکہ بیٹیاں اچک لیتی ہیں۔ میں مسکرا کے دیکھتی ہوں، اپنا وقت یاد آتا ہے۔ جب ہوش سنبھالا تو امی، خالہ اور بڑی بہن کو ڈائجسٹ پڑھتے دیکھا۔ دھیرے دھیرے ہم بھی پڑھنے لگے۔ شادی ہوئی تو میری ساس، میری امی سے زیادہ شوقین نکلیں خواتین پڑھنے کی۔ گویا کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ملی ہمارے اس شوق کو۔ میاں بے چارے ایسے فرماں بردار (ہمارے بھی اور اپنی اماں کے بھی) جیسے ہی خواتین آتا دوسرے یا تیسرے دن ہمارے گھر میں موجود ہوتا۔ میں بھی بڑے پیار سے ترتیب وار جمع کر کے رکھتی۔ اب بیٹیاں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔ لاک ڈاؤن کے دنوں میں (بلکہ مہینوں میں) جب نہیں ملا تو عجیب بے چینی سی، اک کمی سی ہوگئی جیسے۔ یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی نہ ملا تو کیا کریں گے۔

خواتین ہاتھ میں آئے تو سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" پڑھتی ہوں۔ اس کے بعد ہمیشہ انشا جی کو پڑھتی ہوں، اب بھی پڑھا۔ سائرہ رضا کا "برسبیل تذکرہ" پڑھ کر اچھا نہیں لگا۔ کم از کم سائرہ سے ہم ایسی امید نہیں کرتے۔ سائرہ جی! قوم اپنی تاریخ کو سجا سنوار کے پیش کرتی ہے۔ بہت سی قومیں تو مبالغہ آرائی تک چلی جاتی ہیں۔ اپنی تاریخ کے عیب کون دکھاتا ہے۔ شاید ہم وہ واحد قوم ہیں جو ڈھونڈ ڈھونڈ کے اپنے عیب سامنے لاتے ہیں۔ اگر ترک اپنی تاریخ کو سجا سنوار کے اور بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں تو کیا برا ہے؟

ہمارے مرد وہاں کی عورتوں کے حسن کو سراہ رہے ہیں، جملہ پڑھ کر ہنسی آگئی۔ ہمارے مرد ہر جگہ کی عورتوں کے حسن کو سراہتے ہیں سائرہ جی! ترکوں نے اپنی تاریخ کو ہوشیاری سے پیش کیا ہے اور اسے آج کے دور کے دیکھنے کے لائق بنایا ہے۔ اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

ہمارے پاس بھی تاریخ سے بہت کچھ ہے دکھانے کے لیے۔ لیکن ہمارا میڈیا ساس بہوؤں کے جھگڑے سے نکل ہی نہیں رہا۔ ریٹنگ کے چکر میں جو کچھ دکھایا جارہا ہے وہ ایک خاص مائنڈ سیٹ کے لیے ہے، ہر کسی کے لیے نہیں۔ راحت جبیں کے ناول کی پہلی قسط تھی، اچھی لگی۔ راحت کے قلم میں ایک بے مثال روانی ہے۔ اس کے مقابلے میں نمرہ احمد کا ہر لفظ نپا تلا ہوتا ہے۔ سوچ سمجھ کے، ناپ تول کے۔ "حالم" ایک بے مثال تحریر ہے، میری پسندیدہ۔ نعیمہ ناز کی "آدم وحوا" اچھی تھی۔ "آواز کا ڈھول" بھی اچھی لگی۔ قرۃ العین نے جس بات کی طرف نشان دہی کی، اس طرف ہم عورتیں اکثر دھیان نہیں دیتیں۔

☆ عابدہ بہن! بہت زبردست تبصرہ۔ کچھ باتوں سے ہم متفق نہیں پھر بھی آپ کے طرز بیان کی داد دینے پر مجبور ہوگئے۔ بلا کی روانی ہے۔ ہمیں خوشی ہوگی اگر آپ ہر ماہ شرکت کریں۔

پری وش مری بلوچ...... ضلع کوہلو، بلوچستان

شگفتہ ودسسٹرز اور ناہید اسماعیل بہت شکریہ یہ عزت افزائی (یاد کرنے) کا۔ اگست کے شمارے میں اپنا "خامشی کو بیاں ملے" دیکھ کر سوچنے لگی کب بھیجا تھا تو گھر کے بچوں کی گنتی کی اور پتا چلا کہ اب تو خیر سے اڑتیس بچوں کی آنٹی ہوں اور اس سلسلے میں پینتیس ہیں تو اس کا مطلب ہے تقریباً دو سال پہلے بھیجا تھا۔ مارچ کے خواتین میں "عشق زادہ" کافی سبق آموز کہانی رہی۔ میرا خیال ہے حقیقی عشق صرف اللہ تعالیٰ کی پاک ذات سے ہی کیا جاتا ہے۔ جنوری کے شمارے میں ثمینہ فرحان کا مکمل ناول "شہ رگ" ہلکی پھلکی مگر انتہائی دلچسپ اسٹوری تھی۔ مارچ میں

فرح بھٹو کا "سحراب دور نہیں" ایک یادگار تحریر تھی۔ "رنگ ریز میرے" کو نہ دیکھ کر آپ سے اگلے مہینے کے لیے مکمل اور سخت ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور جناب پورے سال کے مکمل ناولز کا سردار "ہوا سہیلی چلی پیا کی حویلی" بھی پورے چار، پانچ سال بعد جا کر ایسی کہانی پڑھنے کو ملی۔ سحرش خان بھٹو صاحبہ آپ بس صرف ایسی تحاریر ہمارے لیے لے کر آئیں۔ فائزہ بھٹی کو ایک شان دار تحریر اور منگنی کی مبارک باد اور آپی! کیا فرح بھٹو اور سحرش خان بھٹو بہنیں ہیں؟ نئی جتنی بھی رائٹرز ہیں، اس وقت، بہت شان دار لکھ رہی ہیں۔

☆ پیاری پری! آپ نے 2020 کی اپنی پسندیدہ تحریروں کے بارے میں لکھا، ہم کوشش کریں گے 2021 میں آپ کی تمام پسندیدہ مصنفین کی تحریریں ضرور شامل کریں۔

آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی آپ کے اگلے خط کا انتظار رہے گا۔

صبا راجپوت......گاؤں سدو جا سندھ

ٹائٹل اچھا تھا۔ سمپل ہی رکھا کریں۔ "کرن کرن روشنی" اچھی تھی، فاخرہ جبیں سے ملاقات بھی اچھی تھی۔ "بزمِ بیل تذکرہ" سوچا نہ تھا، 2020 کے لاسٹ خط میں موڈ آف کرنے کا، پر کیا کہوں۔ اللہ ان کی مشکل آسان کرے، آمین۔ انہوں نے کہا کہ ترک وحشی جاہل تھے، ہوں گے پر میں نے اب تک اچھا ہی پڑھا ہے۔ اور جہاں تک اس کو ٹی وی پر دکھانے کی بات ہے تو آج کل لوگ کم ہی کتابیں پڑھتے ہیں، اچھا ہے جتنے لوگ دیکھیں گے اتنا اچھا۔ اور بحیثیت مسلمان ایک سپاہی ایک شخص وہ اپنے دین کے ساتھ اپنے معاملات کو کیسے ہینڈل کرتا ہے۔

پاکستانی مووی اور سیریل میں کیا دیکھیں وہی روتی ہوئی عورت، کالا جادو کرتی عورت اور شوہر بیوی میں آگ لگاتی ہوئی عورت......یعنی ہر کردار میں عورت بری، کمزور یا پھر ایک لڑکا دو لڑکیاں......یا دو لڑکے ایک لڑکی۔ یعنی وہی اسٹوری۔ کسی اور ہی کلچر اور زبان کو پرموٹ کر رہے ہیں۔ ہم ارطغرل اپنے ابو کے ساتھ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ مجھے پتا ہے آپ یہ شائع ہی نہیں کریں گی اتنی بڑی رائٹر جو ہے، پر یہ ہمارا بھی رسالہ ہے، ہے نا؟ صدف ناز اور ناز انصاری کا مشورہ پسند آیا۔ گوشی آپی! میں نے آپ کے لیے اللہ سے بات کر لی ہے، ٹینشن نہ لو اب سب بہتر ہوگا ان شاء اللہ۔

بھائی اپنا نام دیکھ کر بول رہے ہیں، واہ میں تو مشہور ہو گیا، ہاہاہا۔ اب بول رہے ہیں، میں بھی پڑھا کروں گا۔ انجینئر ہیں بھائی۔

☆ پیاری صبا! آپ کو سائرہ رضا کا تبصرہ اچھا نہیں لگا۔ انہوں نے جو کچھ لکھا، وہ تاریخ کے حوالے سے لکھا۔ یہ تو حقیقت ہے کہ اصل تاریخ ڈرامے سے مختلف ہے۔ آپ کی رائے ہمارے لیے قابل احترام ہے، ہم اسے شائع کر رہے ہیں۔

فرازنہ انصاری......کراچی

میں پتا نہیں اکتوبر یا نومبر 26 اپنی بھانجی کی شادی میں حیدر آباد گئی تھی، وہیں میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ آج 16 دسمبر 2020ء بروز بدھ ہے۔ ٹھیک دو سال پہلے میں اس تاریخ کو ڈلیوری کے سلسلے میں کودھرا اسپتال میں داخل تھی۔ حذیفہ 16 اور 17 دسمبر 2018ء کی درمیانی رات کو صبح چار بجے اس دنیا میں آیا۔ تب سے ہی میں گردش دوراں، بیماریاں، اثرات کے درمیان گھوم رہی ہوں۔ تھوڑا کڈنی پرابلم بھی ہے۔ نفسیاتی بیماری تو ہے ہی، فزیکل بھی ہے دماغ کے پچھلے حصے میں تکلیف ہے۔ حرام مغز، ریڑھ کی ہڈی اوپر سے نیچے تک درد محسوس ہوتا ہے۔ زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ بیٹھ کر آرام ملتا ہے یا لیٹ کر اور یہی میں نہیں کرتی۔ میری نظر بھی تھوڑی کمزور ہو گئی ہے۔ چشمہ لگ جائے گا تو پڑھنے لکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ میں آپ سے کبھی ملی نہیں، کبھی دیکھا نہیں۔ اس کے باوجود آپ سب مجھے اپنے لگتے ہیں۔ میں بھی آپ کی فیملی کا حصہ ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ نے تو قدم قدم پر ہماری رہنمائی کی۔ میری تھوڑی دماغی صحت ٹھیک ہو جائے پھر میں بھی لکھوں گی، ان شاء اللہ۔

☆ پیاری فرزانہ! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت سے نوازے اور ہر طرح کی بیماریوں سے محفوظ رکھے۔ اچھی

بات یہ ہے کہ آپ اپنی بیماریوں کو شکست دینے کا عزم رکھتی ہیں۔ اپنا حوصلہ ٹوٹنے نہ دیجیے گا۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

نازلی فیصل......لاہور

آپ کی بزم کی حسن آرائی بہت خوب۔ میری بڑی بہن پروین یوسف شامی تو آپ کے ڈائجسٹ کی پرانی افسانہ نگار تھیں۔ ویسے وہ ناول نگاری میں بھی اپنا ایک مقام رکھتی تھیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''سوز دروں'' خواتین ڈائجسٹ سالگرہ نمبر میں شائع ہوا تھا اور اس پر انہیں خصوصی انعام سے بھی نوازا گیا اور مئی 1982ء میں انٹرویو آپ کے ڈائجسٹ کی زینت بنا۔ انہوں نے ہی مجھے اپنی تحریریں شائع کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ ان کا ہر مشورہ میرے لیے قابل احترام تھا کیونکہ میں ان سے بہت چھوٹی تھی، ان کی شادی کے وقت میں صرف پانچ سال کی بچی تھی۔ وہ حساس دل و ذہن اب ہم میں نہیں لیکن ان کی رہنمائی نے ہی حوصلہ دیا کہ 1974ء میں میرا افسانہ ''اے جذبہ دل گر میں چاہوں'' آپ کے ڈائجسٹ میں نازلی عارف کے نام سے شائع ہوا یعنی بات پرانی اور شناسائی نئی ہے۔ شادی سے پہلے نازلی عارف پھر شادی کے بعد نازلی فیصل کے نام سے بہت لکھا۔ آپ سوچیں گی، اتنی مدت بعد قلم اٹھایا۔ لمبی کہانی ہے۔ جون 1984ء میں اپنے بیٹے کی اسکول جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ میں وفات کے بعد قلم کاغذ کا رشتہ ایسا منقطع ہوا کہ دوبارہ جوڑ نہ سکی۔ سب چیزیں بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ خود کو بیٹیوں کی پرورش میں ایسا محو کیا کہ بھول ہی گئی کہ میں بھی کبھی لکھتی تھی۔ 1984 تا 2020ء ایک لمبی مدت ہے۔ جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر ہے، وہ عمر کی چڑھتی ہوئی دھوپ تھی۔ یہ عمر کی ڈھلتی ہوئی شام ہے۔ اتنے سال قلم و کاغذ کھولنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اس سال موذی وبا ''کرونا وائرس'' نے اس قدر دل دہلایا کہ ذہن و دل دعاؤں کے حصار میں آیا۔ میرا سالوں کا سویا ہوا قلم رواں ہو گیا۔

☆ نازلی بہن! آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ آپ ہمارے ہاں افسانے لکھتی رہی ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ پروین یوسف شامی ہمارے پرچوں میں لکھتی تھیں۔ اب بھی پرانے پرچے کھولتے ہیں تو ان کی تحریریں نظر آتی ہیں۔ بہت اچھی مصنفہ تھیں۔ آپ نے دوبارہ کاغذ قلم سے رشتہ استوار کیا، بہت اچھا کیا۔ آپ کا سروے بہت طویل ہے، کوشش کریں گے کہ کچھ حصہ ایڈٹ کر کے شائع کر سکیں۔

اقراء ممتاز......سرگودھا

ٹائٹل گرل بس نارمل ہی تھی۔ فاخرہ جبیں سے ملاقات کی۔ ماشاء اللہ سے ان کی طرح ان کی فیملی بھی بہت خوب صورت ہے۔ حامد نوید ان سے پہلی دفعہ ملاقات کی ہے جو کہ بہت بیسٹ رہی۔ نئے نئے لوگوں سے ملتے رہنا چاہیے۔ ''آدم حوا کا ساتھ'' نعیمہ ناز نے کیا بیسٹ اسٹوری لکھی۔ ''تخت اور بخت'' عنایہ شکر ہے تم اپنی ساس جیسی ثابت نہیں ہوئیں۔ نیا ناول ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' امید ہے اچھا ناول ثابت ہو گا۔ ''حالم'' نمرہ احمد ہمیشہ کی طرح ہر قسط سپرہٹ ہوتی ہے۔ فائزہ بھٹی، فوزیہ ثمر بٹ، ماریہ نذیر کدھر غائب ہو۔ فائزہ بھٹی بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کی کہانی بھی شائع ہوئی۔ دوسری مبارک باد منگنی کی۔ مٹھائی تو بنتی ہے۔

☆ پیاری اقراء! کہاں غائب تھیں آپ؟ دو سال بعد شرکت کی ہے، آپ نے۔ بہت اچھی لگی آپ کی دوبارہ آمد۔ اب ہر ماہ باقاعدگی سے خط لکھیے گا۔

ربیعہ نسرین......ماڈل ٹاؤن، لاہور

رسالہ خرید کر بس میں سوار ہوئی تو فاخرہ جبیں سے تفصیلی ملاقات میں رستہ کٹا۔ گھر پہنچ کر دھوپ میں بیٹھ کر ''کرن کرن روشنی'' سے نمازوں کے بارے میں معلومات ملیں (سچ، پچھلے کئی دنوں سے تہجد کی رکعات کے بارے میں خلش تھی) شکریہ۔ ''رنگ ریز میرے'' مدھم چال میں کچھوا بنا ہوا ہے۔ فائزہ ثمرین کے ناول ''رقص شرر'' نے متاثر کیا۔ یہ ایک عمدہ کاوش ہے۔ افسانے سب ہی عمدہ تھے۔ سائرہ رضا کے ''بر سبیل تذکرہ'' نے سوچنے پر مجبور کیا۔

''ہمارے نام'' میں ممتاز بنت حسن اور گوشی جمال کے خطوط نے افسردہ کردیا۔ گوشی! اگر آپ کی والدہ اور بہنیں سمجھتی ہیں کہ یہ جادو کا کرشمہ ہے تو صبح وشام سات سات بار سورۃ فاتحہ، سورۃ اخلاص، معوذتین اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے آپ اور گھر والوں اور گھر پر دم کریں۔ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ ہر روز سورۃ بقرہ پڑھیں، چاہے تھوڑا تھوڑا سہی کہ سورۃ بقرہ جس گھر میں پڑھی جاتی ہے شیطان وہاں سے نکل جاتا ہے۔

آخر میں ایک شکوہ پچھلے کئی مہینوں سے دال میں کچھ کنکر آنے لگے ہیں مثلاً ہر ایک درست ہے، ہر کوئی غلط ہے۔ ''نذر'' نذرانہ ہے اور ''نظر'' دیکھنا ہے ''اچھے'' سے کی جگہ اچھی طرح سے جی کرنا نہیں دل چاہنا۔ براہ کرم بول چال کی زبان کو لکھتے ہوئے احتیاط برتیں اور ہاں ''تخت اور بخت'' میں عنایہ 137 پر زارا ہوگئی ہے۔

☆ پیاری ربیعہ! جن غلطیوں کی طرف آپ نے توجہ دلائی، ہم ان کا خود بہت خیال رکھتے ہیں اور جہاں بھی مصنفین لکھتی ہیں ہم صحیح کر دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی نظر چوک جاتی ہے اور اس طرح کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ خط لکھنے کا شکریہ۔ آپ جیسی قارئین ہمارے لیے قابل قدر ہیں، ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

عظمیٰ مجید...... سیٹھی ٹاؤن، پشاور

صاحب قلم لوگوں کے انٹرویو اور ان کی باتیں ''بر سبیل تذکرہ'' بہت مزاج سے تال میل کھاتے ہیں (راحت اور سائرہ رضا)۔ سائرہ جی، واقعی دل کی آواز سنتے ہوئے لکھنے اور کسی غرض واسطے لکھنے میں یہ بہت فرق ہے۔ قدرتی شہد اور کیمیکل زدہ چینی کے درمیان جیسا۔ فاخرہ جبیں ٹھیک فرماتی نظر آئیں کہ ''پہلے کلینڈر بدلتا تو اس کے صفحے پہلے بوسیدہ ہوجایا کرتے'' اب تو آج لگایا تو کل اتارا وہی نیا نکور۔ قیام اللیل کی فضیلت پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے مزید جانی، (اللہ توفیق دے)۔

عفت سحر کے ''رنگ ریز میرے'' قارئین کو ان کی غیر حاضری سے بہت گلے ہیں۔ راحت جی! ایسی خوب صورت محافل میں، ایسی پیاری جگہوں پر روز روز کا آنا قدر گھٹاتا نہیں بڑھاتا ہے۔ ''حالم'' کی تکمیل کے منتظر ہیں ۔ حنا بشریٰ ٹھیک کہتی لگیں کہ نصیبوں کے کھیل ہیں سارے۔

لوری خوری تخت بہ زدہ درکم بخت داللہ در کی۔
(بیٹی، بہن! تخت میں دے دوں گی، بس بخت اللہ دے دے)

ویسے خطوط بھی بہت سی ملگری (سہیلیاں) بہت اچھے لکھتی ہیں۔ میری پسندیدہ کوثر خالد، ریحانہ چودھری، فوزیہ ثمر بٹ، گوشی جمال (آپ کے لیے دل سے دعائیں بھی) تبسم، ماہا، ثمینہ اکرم، ثریا راجپوت وغیرہ وغیرہ۔ شاعری ساری دل کو بھائی، آپ کو بتاؤں کہ خود بھی تھوڑی بہت شاعری کر لیتی ہوں۔

☆ پیاری عظمیٰ! آپ کا خط پڑھ کر بہت مزا آیا۔ خصوصاً اردو کے ساتھ پشتو کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، بہت اچھے لگے۔ ہمیں آئندہ بھی ایسے ہی خط لکھیے گا۔ ڈالر کی قیمت بڑھنے سے کاغذ کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے، اس کی وجہ سے سلسلوں کے صفحات بھی کم ہوگئے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ اپنی اتنی ذہین اور اتنے خوب صورت ذہن کی مالک قارئین کے خط جب ہم ایڈٹ کرتے ہیں تو دلی تکلیف سے گزرتے ہیں۔ ہم کسی کی برائی یا اچھائی نہیں کرتے لیکن دنوں کے حساب سے بڑھتی مہنگائی نے سب کچھ گڑبڑ کر دیا ہے۔ کہا تو انہیں ہی جائے گا جن کی یہ ذمہ داری ہے۔ اور جو اس مہنگائی کے ذمہ دار ہیں۔

شاعری ضرور کریں لیکن افسانہ نگاری پر بھی توجہ دیں۔ ہمیں لگتا ہے آپ اچھے افسانے لکھ سکتی ہیں۔

ناہید اسماعیل...... کراچی

''کہنی سنی'' میں محترم مدیر کی اچھی سچی باتوں کے ساتھ دل کو باغ باغ کر دینے والی خوش خبری بھی ملی یعنی ''تتلی جیسا پیار'' کے فوراً بعد راحت جبیں کا ایک اور زبردست ناول واہ۔ ''کرن کرن روشنی'' فلاح و کامیابی کا رستہ دکھلاتا بلاشبہ اہم اور بہترین سلسلہ ہے۔ ''رنگ ریز

میرے'' بہت سلو ہے۔ راحت جبیں کے خوب صورت عنوان سے سجے ناول کی پہلی قسط نے ہی تہلکہ مچا دیا۔ تمام ہی کردار زبردست لگ رہے ہیں۔ استاد امانت علی (مرحوم) ہمارے وطن کا قیمتی اثاثہ، فائزہ ثمرین کے قلم سے ان کی داستان ''رقص شرر'' کی صورت ہم تک پہنچی اور کیا خوب پہنچی۔ حنا بشریٰ کی تحریر سبق آموز تھی۔ حکیم صاحب کا کردار اچھا لگا۔ عنبرین ابدال کا اختتام کچھ ادھورا سا لگا، تھوڑا اور بڑھا کر لکھا جاتا تو مزید اچھا لگتا۔ کہیں پڑھا تھا کہ روپ والی روئیں اور بھاگ والی کھائیں، عندلیب زہرا کی تحریر میں وہی مثال فٹ ہوتی نظر آئی۔ ''آواز کا ڈھول'' بہت اچھی سبق آموز تحریر تھی۔ اور جناب فاخرہ جبیں سے ملاقات نے تو رسالے کی رونق بڑھا دی۔ بہت ہی اچھا انٹرویو دیا۔ سائرہ رضا میری موسٹ فیورٹ ہیں لیکن پہلی بار سائرہ رضا کی باتیں دل کو نہیں بھائیں۔ آپ نے بالکل سچ کہا بلکہ پوچھا کہ کیا پیسہ کمانا چھوڑا جا سکتا ہے؟ پیسہ کمانا بالکل غلط نہیں، لیکن محبت کرنے والے قارئین کو وقت نہ دینا بھی تو درست نہیں۔ آپ جلدی سے ایک مزیدار سا ناول لکھ ڈالیں۔ یہ باتیں بخدا تنقید نہیں بلکہ آپ تمام ہی مصنفین کی محبت میں لکھی ہیں پھر بھی اگر کوئی بات گراں گزری ہو تو معذرت۔

خطوط سارے ہی اچھے تھے لیکن گوشی جمال کا خط جو ہمیشہ ہنساتا تھا اس بار ان کے خط نے دکھی کر دیا، ان کا پچھلا خط پڑھ کر محسوس ہوا تھا کہ چھوٹی آپا کا مسئلہ گھر والے سمجھ نہیں پا رہے۔ بہرحال نصیب کا لکھا پورا ہو کے رہتا ہے۔ بہن بھائی تو اس دکھ سے سنبھل ہی جائیں گے لیکن چھوٹی آپا خود کو کیسے جوڑ پائیں گی، میں نے ان کے لیے دل سے دعا کی۔ نفسیاتی الجھنیں میں بہن نادیہ کا مسئلہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ ان کے لیے بھی دل سے دعا نکلی۔ ثوبیہ قطب کی ڈائری اچھی لگی، باقی مستقل سلسلے ہر ماہ ہی اچھے ہوتے ہیں۔ نظمیں غزلیں میں ن۔م کی نظم پسند آئی۔

☆ پیاری ناہید! آپ نے تین ماہ بعد شرکت کی۔ ہم نے نہ صرف آپ کی کمی محسوس کی بلکہ آپ کی طویل غیر حاضری سے ہم تشویش میں بھی مبتلا ہو گئے تھے۔ اگر آپ کا فون نمبر ہوتا تو فون کر کے آپ کی خیریت ضرور دریافت کرتے۔

آپ کا تبصرہ اتنا اچھا ہوتا ہے۔ یقین کریں دل پر پتھر رکھ کر ایڈٹ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خیر و عافیت سے رکھے، آمین۔

نسرین افضل......لاڑکانہ

خط لکھنے کی وجہ کہانی ''ہجر زادہ'' ہے۔ رائٹر شمائلہ ذوالعباد نے ایک بے حد حساس اور سلگتے ہوئے موضوع پر قلم اٹھایا۔ میں نے اپنے گھر میں یہ مسئلہ دیکھا ہے، میری نند نے اپنے شوہر سے خلع لے لی۔ ایک بیٹا بھی تھا۔ وہ بھی یہ سب کرتی تھی۔ رونا دھونا، چیخنا چلانا، گھر سے باہر نکل جانا۔ اپنے کپڑے پھاڑ لینا وغیرہ۔ میری شادی سے پہلے خلع لے چکی تھی، میری اتنی جرأت نہیں تھی کہ مشورہ دیتی کہ اس کی شادی کر دیں۔

بالآخر نند کی قسمت نے یاروی کی اور اس کے لیے ایک رشتہ آ گیا۔ ان صاحب کی بیگم مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئی تھیں۔ ان کے رشتے کو شرف قبولیت بخشا گیا اور نند کی پچاس سال کی عمر میں دوبارہ شادی کر دی گئی۔ خیر دیر آید درست آید۔ اس کے بعد نند کے مزاج میں حیرت انگیز طور پر تبدیلی آ گئی۔ اس نے رونا دھونا، کپڑے پھاڑنا وغیرہ چھوڑ دیا۔ یہی عقد ثانی جلد کر دیا جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔ یہ سب لکھنے کا مقصد کسی کا گلہ شکوہ یا غیبت نہیں بلکہ صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ خدانخواستہ کسی کی فیملی میں ایسا مسئلہ ہو تو پلیز دوسری شادی کر دیجیے گا۔ مردوں کے لیے پھر دل بڑا کر لیا جاتا ہے، خواتین کے لیے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری شادی کی اجازت یوں ہی نہیں دی، بڑا کرم کا معاملہ فرمایا ہے اپنے بندوں کے ساتھ۔ نند کی وجہ سے میں نے بھی بہت ٹف ٹائم دیکھا۔ ہر جگہ ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتی۔ باقی مسائل آپ سب نے پڑھے ہیں۔

دوسری کہانی ہے ''اجنبی کون ہو تم'' کہانی کے اختتام پر میں ہیروئن کے فیصلے سے متفق نہیں ہو سکی۔ خاتون (ہیروئن) کے بیٹے کو باپ کی وفات کے بعد حویلی لے جا کر دادی اسے یقیناً اچھی طرح پالتی۔ میرے خیال میں ہیروئن کو حویلی جانے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

☆ پیاری نسرین! دونوں کہانیوں پر آپ کا تبصرہ بہت لیٹ ہے لیکن آپ کی فرمائش پر ہم نے شامل کرلیا ہے۔

بیوہ کی شادی میں سب سے بڑا مسئلہ رشتے کا ملنا ہے۔ جہاں کنواریوں کو اچھے رشتے نہ ملتے ہوں۔ وہاں بیوہ کی شادی میں کتنی دشواری ہوسکتی ہے۔ دوسرا مسئلہ بچے ہیں، لوگ دوسرے کے بچے کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

شازیہ ستار...... ڈی آئی خان

آپ لوگوں نے ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا، نہ ہی کسی بہن نے کہ شازیہ ستار کدھر گئی ہے، کیا کریں۔ ہماری قسمت۔ اس دفعہ پہلے کہنی سنی سے ہوکر سائرہ رضا کے ''بر سبیل تذکرہ'' پر نظر پڑی۔ بس پھر کتنے ہی سوچوں کے دروازے وا ہوئے۔ میں شاید ابھی بھی خط نہ لکھ پاتی مگر سائرہ رضا کا بھلا ہو کہ انہوں نے مجبور کردیا آج لکھنے پر۔ کیونکہ ان کی باتیں سو فیصد ٹھیک ہیں۔ بھلا ہو آپ خواتین ڈائجسٹ والوں کا کہ آپ نے ماشاءاللہ اتنے الفاظ لکھا دیے ہیں کہ ٹوئٹر پر ہم نے دھوم مچادی مگر سائرہ رضا کی باتوں نے ہمیں شرمندہ کرکے آئینہ دکھا کے واپس آپ کی دنیا میں لا پٹخا۔

☆ پیاری شازیہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے دل کو ٹھیس پہنچی۔ آئندہ کبھی غیر حاضر ہوئیں تو ہم آپ کا احوال ضرور پوچھیں گے۔

طاہرہ حمزہ بلوچ......سنانوال (ضلع مظفر گڑھ

مڈل کلاس سے خواتین پڑھنا شروع کیا اور اب شادی شدہ ہوکر بھی ساتھ ہے۔ میرے شوہر میرے ساتھ بہت کوآپریٹو ہیں، تب ہی تو ہر ماہ بلاناغہ رسالہ میرے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہماری فیملی میں (جہاں بیاہ کر آئی ہوں) کسی کو ڈائجسٹ سے لگاؤ نہیں تھا مگر میری دیکھا دیکھی میری ساری کزنز شوق سے پڑھتی ہیں۔

لطف روٹین میں گھریلو امور ہی نہیں بلکہ تین سالہ محمد زمان اور میرے ننھے منے ٹوئنز شاہ میر اور ایمان فاطمہ کی مصروفیت بھی ہے، جس کہانی نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ نعیمہ ناز کا ''آدم وحوا کا ساتھ'' ہے۔ یہ کہانی مجھ سے دو سال بڑی بہن کے جیسی ہے جن کی 2010ء میں شادی ہوئی اور 2013 کے دسمبر میں مل میں ہونے والے حادثے میں ہمارے بہنوئی، ہماری بہن اور دو ننھے منھے بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ دن اور آج کا دن ہماری بہن بیوگی کی چادر اوڑھے اپنے ننھے پھولوں کو لیے سسرال کی دہلیز پر بیٹھی اپنے ''آج'' کو بچوں کے آنے والے ''کل'' کے لیے گزار رہی ہے۔

☆ پیاری طاہرہ! آپ کی بہن کے ساتھ جو سانحہ ہوا اسے جان کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے زندگی کے راستے کھولے اور وہ خوشیوں بھری زندگی گزاریں۔ قارئین بھی ہماری ان بہن کے لیے دعا کریں۔

آپ نے اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر خط لکھا، بہت شکریہ۔ آپ خواتین ڈائجسٹ کے لیے جو لکھنا چاہتی ہیں، ضرور لکھیں پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

خولہ سعید جاوید......نامعلوم شہر

ٹائٹل پر نازک اندام حسینہ ناز و ادا کے ساتھ اچھی لگی۔ ''کرن کرن روشنی'' سے مستفید ہوکر فاخرہ جبیں سے ملاقات کی۔ ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' بہت ہی اچھا اسٹارٹ ہے۔ ان دونوں بہنوں کی تحریریں اس لیے بھی زیادہ پسند آتی ہیں کہ میرا تعلق بھی ساہیوال سے ہے۔ جہاں شادی سے پہلے کی زندگی ایک خوب صورت خواب معلوم ہوتی ہے جو اس وقت بہت مشکل لگتی تھی۔ ''آواز کا ڈھول'' بہت اچھی تحریر تھی۔ جس بات کی طرف عام طور پر خیال نہیں جاتا۔ نعیمہ ناز نے بھی خوب لکھا۔ ''بدلے گا زمانہ'' بھی چھوٹی چھوٹی خود غرضیوں پر مبنی اچھی تحریر تھی۔ حنا بشریٰ نے نوعمر جذباتی لڑکیوں کے جذبات کی صحیح عکاسی کی ہے جو ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھتی ہیں۔ ''احساس ندامت'' بہت خاص تحریر تھی۔ ''یوں ہی بر سبیل تذکرہ'' سوچ کے کئی در وا کر گیا۔ رائٹر جو جس طرح سے دکھانا چاہے، دیکھنے والے ذہن بند کرکے آنکھیں کھول کر وہی دیکھتے ہیں۔

☆ پیاری خولہ! آپ نے خواتین کی محفل میں شرکت کی، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا تبصرہ بھی بہت اچھا لگا۔ ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔

طوبیٰ ممتاز...... خانیوال

نومبر 2020ء کا خواتین ڈائجسٹ دیکھ کر بے ساختہ ماشاء اللہ کہا اتنی من موہنی صورت کہ دل میں اتر گئی۔ شاہین رشید صاحبہ کو جتنے بھی فنکاروں، ہدایت کاروں اور دنیا نے انٹرویو دیے ہیں، مجھے ان سب میں سید عارض الدین احمد سے ملاقات بہت پسند آئی۔ "ہمارے نام" ارے بھئی بخاری سسٹرز کو بھی آپ سب یاد ہیں مگر سیدہ بخاری درس و تدریس کے سلسلے میں ہاسٹل میں مقیم ہیں۔ پھر جب آتی ہیں تو کہانیاں پڑھ کر ہمارے ساتھ ہی اظہار خیال کر لیتی ہیں۔ خط سارے ہی اچھے تھے۔

"نفسیاتی ازدواجی الجھنیں" میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں عدنان بھائی کو خراج تحسین پیش کرسکوں۔ انہوں نے ہماری اس وقت راہنمائی کی جب سب نے ہمیں بدتمیز سمجھ کے ہمارے حال پر چھوڑ دیا (خیر اتنی بھی بدتمیز نہیں تھی بس ذرا منہ پھٹ کہہ لیں) میں ہر خواتین کے شمارے میں سب سے پہلے یہی سلسلہ پڑھتی ہوں۔ میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ "رقص شرر" اف ف...... کیا خوب ناول لکھا، ایک طرف مذہبی گھرانا اور دوسری طرف گائیکی۔ جب قاری صاحب کی ریلش تر ہونے لگی تو ہمارے بھی آنسو چھلکنے کو بے تاب ہی تھے۔ "لیکن وہ میرے خواب" فرح بھٹو نے کمال کر دیا۔

اوہو آپ کو ایک بات تو بتائی ہی نہیں۔ بھئی مادولت نکاح شدہ ہو چکے ہیں 25 اکتوبر کو۔

☆ پیاری ممتاز! نکاح شدہ ہونے پر ہماری طرف سے دلی مبارک باد قبول کریں، ڈھیر ساری دعاؤں کے اللہ تعالیٰ آپ کو نئی زندگی میں خوشیوں سے نوازے، آمین۔

☆ سیدہ بخاری کو ہمارا پیغام پہنچا دیں۔ ہم اور ہماری قارئین ان کی کمی کو محسوس کر رہی ہیں۔ کبھی کبھی ہمارے لیے بھی وقت نکال لیا کریں۔

صفیہ منیر احمد، سویرا خان بشیر...... پشاور

میں خواتین، کرن، شعاع کی 16 سالہ پرانی اور خاموش قاری ہوں۔ میں تیرہ سال کی عمر سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں، اس سے پہلے تعلیم و تربیت، نونہال، بچوں کا اسلام، آنکھ مچولی، عمرو عیار تو سات سال کی عمر سے امی ہی منگوا کر دیتی تھیں۔ میری امی بھی ڈائجسٹ پڑھتی تھیں۔ امی کے بارے میں کبھی ماں والے سلسلے میں شرکت کر کے تفصیل سے لکھوں گی۔ میری کزن سویرا بھی ڈائجسٹ کی دیوانی ہے، ہم مل کر منگواتے ہیں اور باری باری پڑھتے ہیں۔ میں عالمہ ہوں لیکن شادی کے بعد پڑھانا چھوڑ دیا ہے، اب تو ماشاء اللہ سے میرے تین بچے ہیں، میرے شوہر ڈائجسٹ لے کر آتے ہیں، اپنی پیدائش سے پہلے کے بھی پڑھ چکی ہیں۔ اس ماہ کا پورا ڈائجسٹ تو ابھی پڑھا نہیں بس سلسلہ وار ناول ہی پڑھ سکی ہوں۔

عف سحر بہت چھوٹی قسط لکھتی ہیں۔ نمرہ جی اب حالم کا اینڈ کر دیں۔ سمیرا حمید کہاں غائب ہیں آپ؟ اور سائرہ رضا محبت کے موسموں کے ساتھ لوٹ آئیں۔

☆ پیاری صفیہ! خواتین کی محفل میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں، بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ اتنا طویل عرصہ خاموش رہیں۔ آپ ہمارے دوسرے سلسلوں میں بھی شرکت کریں۔ ہمیں خوشی ہوگی اور اپنے شوہر کو ہمارا جواب ضرور پڑھائیں۔

ڈاکٹر فریال خان...... ڈی جی خان

میں آپ سے ناراض ہوں۔ آپ ساری باجیاں، بہنیں مجھے گلے لگائیں تو مانوں گی ورنہ نہیں۔ چھوڑیں کرونا کو، میں الحمدللہ کرونا فری ہوں۔ یہ کوئی بات ہے بھلا، مجھے خواتین ڈائجسٹ میں کسی ایک نے بھی یاد نہیں کیا، کیوں؟ میں آپ سے، آپ کے پرچے سے مطلب بہت پیار کرتی ہوں۔ بچی، اصلی والا۔ اس لیے ارمان لگا کہ آپ نے نہ یاد کیا نہ بلایا۔ ہے کوئی مجھے آئس کریم والے پکوڑے کھلائے، جلدی سے۔ لیکن کوئی کیوں آپ ہی کیوں نہ کھلائیں۔ اب مجھے جلدی سے کھلائیں تاکہ میں کچھ لکھوں۔ اب ناراضی ختم کیونکہ آج چار دن کے بعد مجھے موقع ملا، بزی رہی۔ اس وجہ سے تبصرہ کرلوں پرچے

پر۔سب سے پہلے "حالم" کیا بات ہے نمرہ جی۔ ہم ان کی یاد میں دبلے پتلے ہو گئے، کسی کو پرواہی نہیں۔

ادی ہم تو کہہ کہہ کے تھک گئے، آپ ہی کہہ دیں عفت سحر کچھ تو صفحات زیادہ لکھا کریں۔ نعیمہ ناز کا ہمیشہ کی طرح اچھا لگا "آدم وحوا کا ساتھ"۔ ناولٹ میں حنا کا "سب کھیڈ نصیباں دا" اللہ کرے سب کو سمجھ میں آجائے تو کافی لوگ سکون میں آجائیں گے۔

☆ ڈاکٹر فریال! آپ نے یہ کیسے سوچا کہ ہماری قارئین نے آپ کو یاد نہیں کیا۔ ہماری قارئین نے آپ کو یاد کیا، ہم تو ابھی آئس کریم والے پکوڑوں پر غور کر رہے تھے کہ آپ نے راضی ہونے کا اعلان کر دیا۔ ویسے آپس کی بات ہے یہ آئس کریم والے پکوڑے ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئے۔

آپ کے پسندیدہ مصنفین گم نہیں ہوئے۔ گم ہوتے تو ڈھونڈ لاتے وہ تو ٹی وی کو پیارے ہو گئے ہیں۔

گوشی جمال ...... یزمان

دسمبر کی مناسبت سے ٹائٹل بے حد دلکش لگا۔ ویسے سال 2020ء کے موسٹلی ٹائٹل دیدہ زیب تھے۔ "کہنی سنی" بے حد عمدہ تحریر دوبار پڑھی۔ دو بڑی خوشیوں سے مزین شمارہ دل میں اتر گیا ایک تو راحت جبیں صاحبہ کا نیا ناول جس کا نام ہی اتنا خوب صورت۔ "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" زندگی نے ہمیں بہت گزار لیا اب میں نے بھی پکا ارادہ باندھ لیا ہے کہ زندگی ہم اب تجھے گزاریں گے۔ تعلیمی سلسلہ بھی میں نے جاری کر لیا اور ساتھ ساتھ جاب کے لیے بھی اپلائی کیا ہے۔ اب جو ہماری پچویشن ہے، اس میں مجھے یہی بہتر لگا۔ اماں جاب کے خلاف تھیں لیکن اب انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ بھائی صائم نے ہمت بندھائی، اللہ ان کو ڈھیروں خوشیاں دے، وہ اس وقت ہمارے گھر کے واحد کفیل ہیں۔ ان کا ہاتھ بٹاتا ہے آخر ان پر تین بہنوں، دو بھانجوں اور ایک عدد اماں کی ذمہ داری ہے۔ جو اس وقت گھر کی حالت ہے ان کی شادی کا مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ سوچ سوچ کر اماں اور میں ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔ ماشاء اللہ گڈ لکنگ ہیں، اچھا بزنس ہے۔ ایک گھر کے اتنے اخراجات۔ اوپر سے چھ خواتین کی ذمہ داری اللہ مالک۔ آپ نے کہا کہ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ تائی نے جادو کیا ہے تو یہ خیال ہوتا تو کب کا دور پھینک دیتے، یہ تلخ حقیقت ہے، جادو برحق ہے۔ یہ تو جس کے ساتھ بیتتی ہے وہی جانتا ہے، اللہ سب کو بچائے آمین۔ پچیس سال پہلے جب کسی کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اس وقت تائی کی پیش گوئی آج پوری ہو چکی ہے دونوں آپا کے دو بار گھر ٹوٹے۔ تیسری کی شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ اس تلخ حقیقت سے ہم چاہیں بھی تو منہ نہیں موڑ سکتے اور تائی اماں کو متعدد بار تایا ابا نے رنگے ہاتھوں پکڑا اور دھلائی بھی کرتے رہے۔ لیکن وہ باز نہ آئیں تایا ابا اپنی بیوی کا یہ روپ برداشت نہ کر سکے اور اس جہان فانی سے کوچ کر گئے اور تائی اماں ایک روز ویران روڈ پر اوندھے گری چل بسیں۔ کسی نے دیکھ کر پہچان کر ان کی بیٹی جو پاس کے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی اس کو اطلاع کی۔

"یہ کوئی خیال، سوچ یا افسانہ نہیں ہم جیتے جاگتے کردار ہیں۔"

بہرحال چھوڑیں جی، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ شمارے کی ایک خوشی کا تذکرہ ہو گیا اب دوسری خوشی بھی جان لیں اور وہ ہے۔ "فاخرہ جبیں" سے ملاقات۔ بہت مزہ آیا ان سے ملاقات کر کے۔

ج: پیاری گوشی! آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ اپنی بڑی آپا اور چھوٹی آپا سے کہیں وہ بھی کوئی ہنر سیکھ لیں۔ سلائی وغیرہ یا کہیں جاب کر لیں۔ آج بھائی ان کی ذمہ داری اٹھا رہا ہے۔ کل اس کی شادی کے بعد حالات دوسرے ہوں گے۔ آپ کے اور آپ کے گھر والوں کے ساتھ ہماری ہی نہیں ہمارے قارئین کی بھی دعائیں ہیں۔ بیشتر خطوط میں آپ کے اور آپ کی بہنوں کے لیے قارئین نے دعا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے تمام مسائل حل کر دے۔ (آمین)

رانی سونیا...... دیرلوئر۔ دیر 2

"کہنی سنی" کے بعد بہنوں کی محفل میں چھلانگ لگائی۔ صدف ناصر! ڈائجسٹ نہ صرف ہاؤس وائف کے لیے بلکہ ورکنگ وومن کے لیے بھی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا

ہے۔ فریحہ اشتیاق ارے آپ نے کیا کہا، وزن بڑھ گیا ہے۔ اف میرے اللہ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے اب میری مثال لو، میں نے بہت کوشش کی وزن بڑھانے کی لیکن وزن ہے کہ بڑھنے کا نام نہیں لیتا جب بھی کوئی نئی جاننے والی سے آشنائی ہوتی ہے تو وہ تو پہلے شادی شدہ ہونے پر مشکوک ہوتی ہے اور پھر پتا چلنے پر حیرت کا اظہار کرتی ہے کچھ تو رشتہ لانے کی بات کرتی ہیں۔ میاں جانی کہتے ہیں تم لوگوں کی پروامت کرو جو بھی کہتے ہیں کہتے رہیں مجھے تو تم ویسے ہی بہت پیاری لگتی ہو۔ اور پھر تمہاری جاب بھی ایسی ہے کہ موٹی ہو کر تم ڈیوٹی ہرگز نہیں کر سکو گی۔ لیکن اس کے باوجود پلیز پلیز مجھے موٹا ہونے کا کوئی پلان بتادیں یا بیوٹی ٹپس میں ہی کوئی پلان دیں۔

ج: پیاری سونیا! خواتین کی بزم میں خوش آمدید لوئر دیر سے ہمیں شاذونادر ہی خط ملتے ہیں۔ آپ نے پہلی بار شرکت کی اور اتنا دلچسپ خط لکھا۔ آپ اور آپ کے میاں صاحب دونوں ہی بہت خوش مزاج ہیں۔ ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ آپ ہمیشہ اسی طرح خوش وخرم رہیں۔ آمین۔ آپ ہماری طرف سے مبارک باد قبول کریں آپ تو انتہائی خوش قسمت ہیں جن کا وزن نہیں بڑھتا اور جو وزن بڑھانے کی کوششوں میں ہلکان ہو رہی ہے۔ ہمارے حساب سے آپ کا وزن انتہائی مناسب ہے۔ آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔ موٹاپا نہ صرف دیکھنے میں برا لگتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے بہت سی بیماریاں بھی ہوتی ہیں۔

سمارا انعم بھٹی...... ڈیرہ غازی خان

انٹرویو دونوں خوب رہے فاخرہ جی کی شخصیت بہترین لگی...... سائرہ رضا کا یونہی بر سبیل تذکرہ "یونہی تو ہرگز نہیں لگا۔ افف...... "ہمارے نام" جس کا شدت سے انتظار ہوتا ہے کیونکہ آپ کے جوابات ہمیں امید کی کرن لگتے ہیں سو اس سلسلے کو دل سے پڑھتی ہوں۔ آج کل خصوصی دعائیں گوشی جمال کے لیے کرتی ہوں۔ اللہ گوشی جمال کو خوشیوں بھری آسان زندگی سے نوازے۔

ج: پیاری سمارا! ہم میل باقاعدگی سے چیک کرتے ہیں۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ ہماری قارئین کا تعلق زیادہ تر ایسے علاقوں سے ہوتا ہے جہاں خط پوسٹ کرانا بڑا مسئلہ ہوتا ہے پھر وہ گھروں سے بھی نہیں نکلتیں نہ بھائیوں کی خوشامد کر کے خط پوسٹ کرتی ہیں اس لیے ہماری پہلی ترجیح ڈاک سے آئے خط ہوتے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ صفحات محدود ہیں۔ میلو کی باری آتے آتے صفحات ختم۔ اس لیے میل شامل نہیں ہو پاتیں۔

رشیدہ یاسر...... محب بانڈہ

آپی! آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ اگر ہم کہانی بھجوادیں تو شائع ہوگی اور ہمارے اپنے نام سے یا قلمی نام ہونا چاہیے؟ اور دوسرا سوال اگر عدنان بھائی سے کچھ پوچھنا ہو تو آپ ہی کے پتے پر بھیجیں یا کوئی اور ایڈریس ہے؟

پیاری رشیدہ! آپ نے ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی، عدنان بھائی کو آپ اسی ایڈریس پر خط بھجوائیں جس پر یہ خط لکھا ہے۔ لفافے پر عدنان بھائی کا نام ضرور لکھیں۔ کہانی آپ کسی بھی نام سے لکھیں اچھی ہوئی تو شائع ہوگی اصلی یا قلمی نام سے فرق نہیں پڑتا۔

دعائے مغفرت

آپ کی پسندیدہ مصنفہ نمرہ احمد کی والدہ محترمہ زاہدہ نیازی طویل علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ماں جیسی ہستی کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہم نمرہ احمد کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں، مرحومہ زاہدہ نیازی کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور نمرہ احمد اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے، آمین۔

قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیں۔

باتیں رئید عالم سے

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''
''محمد رئید عالم۔''
2 ''نام کا مطلب؟''
''میرا یہ نام میرے والد صاحب نے رکھا تھا اور اس کا مطلب ہے ''سپہ سالار۔''
3 ''پیار کا نام؟''
''کچھ بھی نہیں سب نام سے ہی پکارتے ہیں۔''
4 ''تاریخ پیدائش؟''
''31 اکتوبر 1988ء۔''
5 ''قد/ستارہ؟''
''5 فٹ 11 انچ/اسکار پیو (عقرب)۔''
6 ''مادری زبان؟''
''اردو۔''
7 ''فیملی ممبرز؟''
''آٹھ فیملی ممبرز ہیں اور میرا نمبر بھائیوں میں دوسرا ہے۔''
8 ''شادی؟''
''جی الحمدللہ اور دو بچے بھی ہیں۔''
9 ''تعلیمی قابلیت؟''
''ایم بی اے اور اے سی سی اے مکمل ہونے والا ہے۔''
10 ''شوبز میں آمد/گھر والوں کا ردعمل؟''
''بچپن سے شوق تھا شوبز میں آنے کا تو لڑائی کرتا رہتا تھا۔ اللہ نے ایک موقعہ بنا دیا چانس مل گیا اور یوں راستے بنتے چلے گئے۔ امی کافی سپورٹ کرتی تھیں اور کرتی ہیں اور والد صاحب ......تو گھر والوں کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔''
11 ''پہلا ڈرامہ؟ پہچان کس نے دی؟''
''کانچ کی گڑیا'' پھر لمبا گیپ آ گیا......اور ڈرامہ سیریل ''بے قصور'' سے میری پہچان ہوئی اور ''ماں صدقے'' اور ''جو تو چاہے'' نے بہت زیادہ شہرت دی۔''
12 ''پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟''
''پہلی کمائی تو ٹیوشن کی فیس تھی جو کہ بہت کم تھی کیونکہ مجھے پاکٹ منی چاہیے ہوتی تھی تو میں ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ تو پہلی کمائی اپنے پاس ہی رکھی۔''
13 ''شوبز کے علاوہ آپ کی مصروفیات؟''
''میں گاڑیوں کی ڈیلنگ کا کام کرتا ہوں گاڑیوں کا کام کرنا پسند ہے۔ اچھی گاڑی رکھنا پسند ہے اور یہ سب میں شوقیہ کرتا ہوں۔ باقی شوبز کی اپنی مصروفیات ہیں۔''
14 ''آپ کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟''
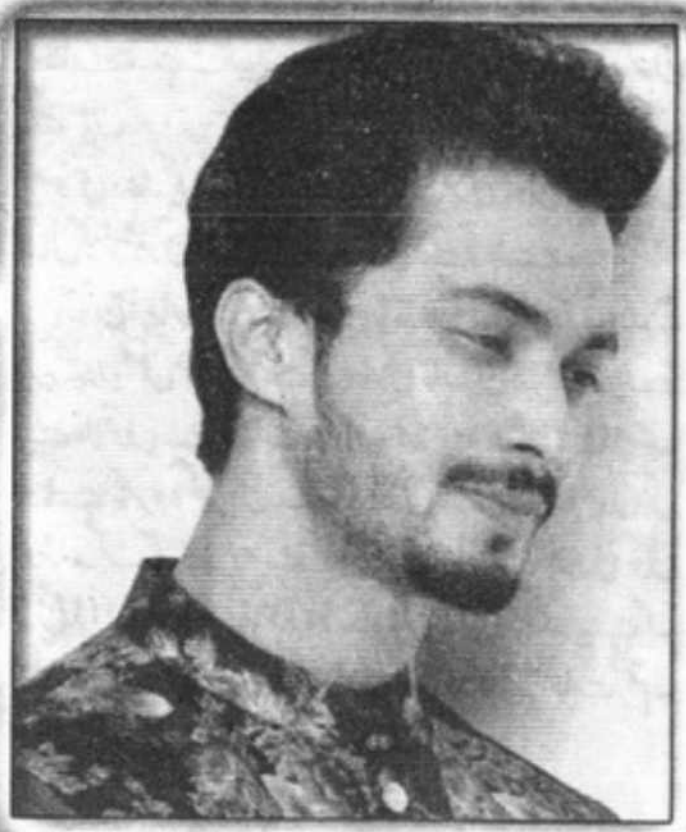
''کامیابی کے سورج کے بارے میں تو وقت بتائے گا کہ کب طلوع ہوگا بہت آگے تک جانا ہے اور میری صبح کی شروعات سات ساڑھے سات بجے تک ہو جاتی ہے۔''

15 ''صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی ؟''
''نہیں ایسا کچھ نہیں ...... البتہ اپنے جم کا بیگ خود تیار کرتا ہوں۔ بس صبح اسی کو پہلے دیکھتا ہوں۔''

16 ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ ؟''
''دونوں ہی چیزیں برداشت ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی جھوٹ بولے تو بالکل برداشت نہیں ہوتا۔''

17 ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''
''پاکستان کے لیے ہی سوچتا ہوں۔ میں جو اتنی محنت کر رہا ہوں وہ پاکستان والوں کے لیے نہیں پاکستان کے لیے کر رہا ہوں۔''

18 ''سیاست میں کون پسند ہے؟''
''کوئی بھی پسند نہیں ہے۔''

19 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''
''بالکل بھی کوئی خواہش نہیں ہے۔ پاکستانی ہونا میرے لیے فخر کی بات ہے۔ ہاں گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ میری خواہش ہے کہ آسانی سے ویزہ مل جائے اور ہر ملک گھوم سکوں۔''

20 ''کیا آپ کو کورونا ہوا؟ لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا؟''
''ہاں میں کورونا کا شکار ہوا تھا، اور لاک ڈاؤن کا وقت اچھا گزرا، اپنے آپ کو دیکھنے کا پرکھنے کا موقعہ ملا۔''

21 ''شوبز میں کیا اچھا ہے یا کیا برا ہے؟''
''بہت خطرناک سوال ہے۔ اس کا میں ایک ہی جواب دوں گا سمجھنے والے سمجھ جائیں گے نہیں سمجھنے والے نہیں سمجھیں گے، جواب یہ ہے کہ ''شوبز میں جو آپ چاہتے ہیں وہ اچھا ہے جو آپ نہیں چاہتے وہ برا ہے۔''

22 ''اسپورٹس سے آپ کا لگاؤ؟ کونسا گیم پسند ہے؟''
''بہت زیادہ ہے۔ کرکٹ بہت شوق سے کھیلتا ہوں۔''

23 ''زندگی سے کیا سیکھا؟''
''زندگی سے انسان جو سیکھتا ہے وہ قبر میں جا کر پتا چلتا ہے کہ کیا سیکھا اور زندگی نے کیا دیا۔ اس سے پہلے تو ہر بندہ اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے۔''

24 ''ایک نصیحت جو لڑکیوں کو کرنا چاہتے ہیں؟''
''کہ جذباتی نہ ہوا کریں کیونکہ عورت سے گھر بگڑتا بھی ہے اور سنورتا بھی ہے تو ان کے اندر صبر زیادہ ہونا چاہیے۔''

25 ''گزشتہ دو سالوں میں کون سا ڈرامہ سیریل پسند آیا؟''
''کن فیکون'' جس کا بعد میں نام ''جو تو چاہے'' ہو گیا تھا وہ پسند آیا۔''

26 ''پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟''
''میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں، میرے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ مجھے ڈائیلاگ یاد نہیں ہو رہے تھے۔ ڈائیلاگ یاد کرتا تو اداکاری بھول جاتا تھا اور اداکاری پہ توجہ دیتا تو ڈائیلاگ بھول جاتا تھا۔''

27 ''تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟''
''کبھی بھی نہیں، تنہائی میں میرے ساتھ میرا اللہ ہوتا ہے اور اس پر میرا پورا ایمان ہے۔''

29 ''دل کی دھڑکن کب تیز ہو جاتی ہے؟''
''جب کوئی نیا چیلنجنگ رول ملتا ہے اور اس کے بارے میں سوچتا ہوں کہ اسے کرنا کس طرح ہے۔''

30 ''زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو آپ کیا واپس لینا چاہیں گے؟''
''اسکول لائف۔''

31 ''گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے کرتے ہیں؟ ڈانٹ کس کی کھاتے ہیں؟''

''گھر میں، میں اپنی ماں سے، اپنی بیوی سے کرتا ہوں اور ڈانٹ ابا سے بہت پڑتی ہے مگر میں ان سے پیار بھی بہت کرتا ہوں۔''

32 ''بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟''

''بیماری کو ایکسٹرا آرڈنری سیریس لے لیتا ہوں۔''

33 ''آپ کے اب تک۔ کے ڈراموں کی تعداد؟''

''کافی ہیں۔ ''بے قصور، ماں صدقے، بدنام، چمک دمک، جو تو چاہے، فطرت، تم سے کہنا تھا'' اور بھی ہیں، مگر فی الحال نام یاد نہیں آرہے۔''

34 ''رومینٹک رول آسانی سے کر لیتے ہیں یا نگیٹو؟''

''رومینٹک کا بھی اپنا مزا ہے اور نگیٹو بھی آسانی سے کر لیتا ہوں دونوں ہی میری پہلی ترجیحات ہیں۔''

35 ''ادب سے لگاؤ، کس کو پڑھتے ہیں؟''

''کوئی خاص نہیں ہے۔''

36 ''کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟''

''اللہ کا شکر ہے کوئی فیصلہ غلط نہیں ہوا۔ ہر فیصلے میں میرا رب میرے ساتھ ہوتا ہے۔''

37 ''کچن سے لگاؤ، کبھی شیف بننے کی خواہش ہوئی؟''

''کچن سے بالکل بھی لگاؤ نہیں ہے حالانکہ میرے سب بہن بھائیوں کو، میرے والدین کو بہت اچھا کھانا پکانا آتا ہے۔ مجھے صرف کھانا آتا ہے۔''

38 ''آپ برانڈ کونشس ہیں؟''

''نہیں بالکل نہیں، جو چیز اچھی لگتی ہے خرید لیتا ہوں۔''

39 ''ایک خواہش جو حسرت بن گئی؟''

''ابھی تو خواہشات شروع ہوئی ہیں ابھی تو گراؤنڈ میں اترا ہوں، ابھی تو پورا میچ باقی ہے۔''

40 ''کس کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟''

''اگر تین چار سال پہلے یہ سوال پوچھتیں تو کہتا کہ زندہ رہنے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مگر اب مذہب کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوا ہے کہ جتنی زندگی میرے رب نے لکھ دی ہے اتنا ہی زندہ رہنا ہے مجھے...... یہ زندگی تو فانی ہے۔''

41 ''ایک نصیحت جو گرہ میں باندھ لی؟''

''کہ اپنے رب اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسی کو کس کر تھام لو سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔''

42 ''مجھے نفرت ہے؟''

''نفرت صرف جھوٹ سے ہے۔''

43 ''کبھی غربت میں وقت گزارا؟''

''اگرچہ میرا فیملی بیک گراؤنڈ بہت اسٹرونگ ہے لیکن اس کے باوجود میں نویں جماعت سے خود کمار ہا ہوں تو اونچ نیچ ہے زندگی میں۔''

45 ''ڈرائیونگ کے دوران کون سا گانا زیادہ سنتے ہیں؟''

''موڈ پر منحصر ہے۔''

46 ''ڈاکٹر، حکیم یا ہومیو پیتھک کس پر یقین ہے؟''

''ہومیو پیتھک۔''

47 ''پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے؟''

''ایمان داری...... یہاں ایمان داری خریدنی پڑتی ہے۔''

48 ''کیا دل سے اترا ہوا شخص دوبارہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے؟''

''بالکل...... ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہو...... تو ہم کون ہوتے ہیں کسی بات کا فیصلہ کرنے والے۔''

49 ''زندگی میں پہلا پیار کس عمر میں ہوا؟''

''جس سے ہوا اس سے شادی ہو گئی۔''

50 ''موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟''

''جب سے پاکستان بنا ہے کوئی بھی حکومت مطمئن

نہیں کر سکی۔"

51 "ملک سے باہر جاب کی آفر آئے تو؟"

"آئی تھی آفر مگر مجھے میڈیا سے لگاؤ تھا اور اپنے ملک سے بھی اس لیے آفر قبول نہیں کی۔"

52 "غصے میں آپ کا ردعمل؟"

"غصہ بہت شدید آتا ہے۔ بہت خطرناک ہے میرا غصہ۔ مگر اتر بھی جلدی جاتا ہے۔"

53 "ٹی وی ٹاک کے بہترین شوز اینکر؟"

"بہت سے ہیں۔ مگر مجھے ابھی کسی نے بہت زیادہ متاثر نہیں کیا ہے۔ ہاں ٹی وی شوز میں مجھے فہد مصطفیٰ پسند ہے۔"

54 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"یہ کہ یار فلاں سے بات نہیں کرو وہ با کردار نہیں ہے یا دوسروں کی برائی کر کے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو میں اس چیز کے خلاف ہوں، کسی کے ساتھ بات کرنے میں نفع نقصان کیوں دیکھیں۔ ہمارے نبیؐ نے سب سے عجز و انکساری سے بات کرنے کو کہا ہے۔ ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

55 "جوائنٹ اکاؤنٹ یا سنگل؟ بہتر کیا ہے؟"

"سنگل اکاؤنٹ ہی بہتر رہتا ہے۔"

56 "ایک ڈیٹ جو آج تک یاد ہے؟"

"شادی کی۔"

57 "ایک کھانا جو ہر وقت کھا سکتے ہیں؟"

"دال چاول، پاپڑ اور ٹماٹر کی چٹنی۔"

58 "اپنی پرفارمنس میں کیا کمی نظر آتی ہے؟"

"بہت کمی نظر آتی ہے اور میرا خیال ہے کہ ابھی مجھے بہت گروم ہونا ہے۔"

59 "اپنے ڈرامے دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟"

"کہ اس سے بہتر پرفارمینس دے سکتا تھا۔"

60 "کس چینل پہ ریموٹ رک جاتا ہے؟"

"پہلے رکا کرتا تھا...... مگر اب تو نیٹ پہ سب کچھ دیکھ لیتا ہوں۔"

61 "پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟"

"شاہ رخ خان کی کوئلہ۔"

62 "کوکنگ یا کھانا کھانا...... کیا پسند ہے؟"

"میرے گھر میں سوائے میرے سب کوکنگ کرتے ہیں تو مجھے تو صرف کھانا کھانا ہی پسند ہے۔"

63 "کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟"

"جس کے اندر چیلنج ہو' پرا پر کام کر سکوں، ریسرچ کر سکوں چھ سے آٹھ مہینے اور پھر اسے پرفارم کروں۔"

64 "آپ کا ناقابل فراموش کردار؟"

"ابھی تک تو ایسا کوئی بھی نہیں ہے۔ جب ہوگا تو ضرور بتاؤں گا۔"

65 "کوئی کردار جس کو کرنے سے انکار کیا ہو؟"

"بہت سے کردار ایسے ہوتے ہیں جن میں کچھ کرنے کو نہیں ہوتا مطلب "بھرتی" کے کردار ہوتے ہیں اگرچہ کہا جاتا ہے کہ لیڈ ہے تو ایسے کردار نہیں کرتا اور انکار کر دیتا ہوں۔"

66 "کس سیاست دان کا رول کرنا چاہتے ہیں؟"

"کوئی جواب نہیں دیا۔"

67 "چاند پر پہنچ کر دنیا میں پہلا پتھر کس کو ماریں گے؟"

"پتھر ہی نہیں جائے گا کیونکہ گریویٹی ہی نہیں ہوگی تو لگے گا کس کو۔"

68 "آپ کی فیوچر پلاننگ؟"

"ہے...... بالکل ہے مگر سیکریٹ ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اپنے فیوچر کے بارے میں کسی کو نہ بتاؤ۔ اس لیے یہ سیکریٹ ہے۔"

69 "بچوں کے ہاتھ میں موبائل لمحہ فکریہ یا وقت کا تقاضا؟"

"بچوں کے ہاتھ میں بالکل بھی موبائل نہیں ہونا چاہیے وقت کا زیاں ہے، صرف اتنا ہونا چاہیے کہ ہم ان کو ایجوکیٹ کر سکیں۔"

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

فرق

بشریٰ انصاری اپنے طویل فنی سفر کی وجہ سے ملک کی شوبز انڈسٹری کا اہم حصہ مانی جاتی ہیں۔ ان کی فنی خدمات کی بنا پر انہیں تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ (ویسے یہ کچھ لوگوں کو ایویں بھی دے دیا جاتا ہے جیسے کہ...... بھئی آپ بھی اپنے ذہن پر کچھ زور دے لیا کریں، سب کے نام ہم ہی کیوں بتائیں)

بشریٰ انصاری سے جب یہ پوچھا گیا کہ ماضی اور حال کے فنکاروں کے متعلق آپ کیا کہیں گی، تو انہوں نے کہا کہ "فرق تو زمانے میں ہر چیز کا ہوتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب ڈیزائنر اچھے نہیں ہیں۔ پہلے بہت اچھے تھے (ہیں......؟)۔ ہر وقت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ماحول اور ــــ رویے وقت کے ساتھ ساتھ بدل جاتے ہیں۔ معاشی صورت حال بدلنے سے بھی بہت کچھ بدل جاتا ہے (آہم! ہم کچھ نہیں کہہ رہے کہ......) جو کہ اب ہم دیکھ رہے ہیں (ہاہاہا)۔ سو ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ پہلے اور اب کے فنکاروں میں یہ فرق ہے۔

بشریٰ انصاری نے کہا کہ ویسے تو ہم سب کا زمانہ ساتھ چل رہا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہمارے وقت میں ہمیں نظم و ضبط کی بہت عادت تھی اور ہم وقت کے بہت پابند تھے (یعنی آج......)

سوچ

محمد احمد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ بنیادی طور پر تو ایک رائٹر ہیں لیکن ان کی پہچان ڈراما ہے تقریباً ہر ڈرامے میں محمد احمد کو والد کا کردار دیا جاتا ہے۔ تین بڑے پروڈکشن اداروں نے ان کا لکھا اسکرپٹ مسترد کردیا تو انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ رام چند پاکستانی کا اسکرین پلے لکھا، علی ظفر کی "تیرے بن لادن" کے ڈائیلاگ اور مہرین جبار کی فلم "لعل بیگم" لکھنے والے محمد احمد کہتے ہیں کہ......

پاکستان ڈراما انڈسٹری خاص طور پر رائٹرز کے لیے ایک مشکل جگہ ہے۔ آج کے دور میں رائٹر بننا بہت مایوس کن ہے (ان کے لیے جو صحیح معنوں میں لکھاری ہیں) ہم جو لکھنا چاہتے ہیں، ہمیں اس کی اجازت نہیں۔ ہمیں چینلز کی ڈیمانڈ کے مطابق لکھنے کو کہا جاتا ہے۔ آج کی کہانیاں ازدواجی معاملات، طلاق اور ساس بہو کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔

محمد احمد کے مطابق پاکستان کی ڈراما انڈسٹری صرف تین افراد کے سینگوں پر کھڑی ہے اور وہ اپنے سینگ ایک ہی جگہ جمائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر انہیں ڈراما انڈسٹری کو بدلنے کا ایک موقع دیا جائے تو وہ انڈسٹری میں کام کرنے والوں کی سوچ بدل لیں گے۔ (اور عوام کی سوچ؟ وہ کون بدلے گا؟)

اعزاز

نیدرلینڈ سے تعلق رکھنے والی دی لیڈی ٹائیکسن اور

ککک باکسر کے نام سے جانی جانے والی روبی جیسیا میسیو نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل اسلام کا مطالعہ کرنے پر اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر انہوں نے نیدرلینڈ کی ایک مسجد میں گواہوں کی موجودگی میں اسلام قبول کرلیا۔

2016ء میں خوف ناک کار حادثہ میں روبی جیسیا کی گردن ٹوٹ گئی تھی، جس کے بعد ان کی کامیاب سرجری کی گئی۔ اس حادثے نے روبی جیسیا کے باکسنگ اور مارشل آرٹ کے ابھرتے کیریئر کو شدید نقصان پہنچایا۔ جس کے بعد انہیں ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہونے اور اعتماد بحال کرنے میں کئی مہینے لگے۔

اہم

اداکارہ سجل علی کو فلم اور ٹی وی کے لیے متاثر کن کارکردگی پر دبئی میں بین الاقوامی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ ڈسنگٹ انٹرنیشنل عرب فیسٹول ایوارڈ (DIAFA) کے چوتھے ایڈیشن کی تقریب دبئی میں منعقد کی گئی جس میں دنیا کی نامور شوبز شخصیات نے شرکت کی۔

تقریب میں سجل علی کو فلم اور ٹی وی میں بہترین کارکردگی پر ایوارڈ دیا گیا۔ سجل علی نے اس موقع پر کہا کہ "میرے لیے یہ ایک اعزاز کی بات ہے بالخصوص اتنے بڑے بڑے اداکاروں کے ساتھ ہونا بھی کسی اعزاز سے کم نہیں۔ تمام مداحوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھ پر اعتماد کیا۔ یہ ایوارڈ میرے لیے بہت اہم ہے، بحیثیت اداکارہ نہیں بلکہ ایک پاکستانی کے طور پر۔

خبر

معروف فوک گلوکار عطا اللہ خان عیسیٰ خیلوی نے تیسری بار اپنے انتقال سے متعلق گردش کرتی خبروں کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ میرے بارے میں ایک بار پھر غلط خبریں گردش میں ہیں۔ آپ سب کی دعاؤں سے میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ایسا پہلی بار نہیں ہوا اس سے قبل جب عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی 2019ء میں لاہور کے ایک نجی اسپتال میں

زیر علاج رہے اور پھر انہیں ڈسچارج کر دیا گیا تھا جب بھی یہ خبر پھیل گئی تھی۔ اس کے بعد جولائی 2020ء میں بھی ان کے انتقال کی خبر پھیل گئی تھی۔ عطاء اللہ خان کو 1991ء میں پرائڈ آف پرفارمنس دیا گیا تھا جبکہ 1994ء میں عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کا نام دنیا بھر میں سب سے زیادہ آڈیو گانے ریکارڈ کرانے پر گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کیا گیا تھا۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں صدر پاکستان عارف علوی نے انہیں ستارہ امتیاز سے بھی نوازا۔

کچھ ادھر اُدھر سے

2002ء چوہدری شجاعت حسین نے میر ظفر اللہ جمالی کو مسلم لیگ (ق) کی طرف سے وزارت عظمیٰ کا امیدوار بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ چھوٹی جماعتوں سے بلوچستان کے نام پر ہمدردی حاصل کی جاسکے۔ پرویز مشرف کو جمالی صاحب پسند نہ آئے کیونکہ چہرے پر داڑھی تھی اور شلوار قمیص میں ملبوس رہتے تھے۔

(حامد میر...... تیر کمان)

آپ کا باورچی خانہ

صفیہ مہر۔ خان پور

س: کھانا پکاتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: کھانا پکاتے ہوئے یہ خیال بڑا پریشان رکھتا ہے کہ پتا نہیں کھانا کیسا بنے گا؟ پوری طرح متوجہ ہو کے درود پاک پڑھتے ہوئے کھانا تیار کرتی ہوں تو کھانا لذیذ پکتا ہے۔ پھر یہ خیال تو بہت پریشان کرتا ہے کہ کچن میں بکھیڑا ساتھ ساتھ سمٹتا جائے۔ دوسرا یہ کہ میرے ابا جان شوگر کے مریض ہیں۔ انہیں وقت پر کھانا تیار چاہیے ہوتا ہے۔ نہیں تو وہ ہائپر ہو جاتے ہیں تو میں سب سے زیادہ اسی بات کا خیال رکھتی ہوں کہ ہر کھانا ٹائم پر پکا لوں۔ والدین خوش تو اللہ خوش۔

س: کھانے کا وقت ہے اور اچانک مہمان آگئے ہیں؟

ج: الحمدللہ، مہمان تو بابرکت ہوتے ہیں۔ کھانے سے پہلے آئیں یا وقت پر ٹینشن کس بات کی۔ جو سادہ اچھا بنا ہو گا آگے رکھ دیا جاتا ہے ہمارے ہاں۔ اہتمام کرتے کرتے بھوکا مارنے سے بہتر ہوتا ہے کہ جو خود کھائیں، وہ مہمانوں کے سامنے رکھ دیں۔ مہمان اگر واقعی مہمان ہوئے تو بسم اللہ سے شروع کر کے شکر پر کھانا ختم کر دیں گے۔ اگر مہمان نما شریکے ہوئے تو بہنوں! پھر چاہے پورا شہر لوٹ کے دسترخوان پر سجا دو، ان کی سلوٹیں اور منہ سوجا ہی ملے گا (ہی ہی ہی)۔ نتیجہ جو خود کھاؤ وہی اپنے مہمانوں کو کھلاؤ۔ اوقات سے بڑھ کر نہ اہتمام ہم کرتے ہیں، نہ کرنا چاہیے۔ ہمیں تو ایسی سادہ تربیت دی گئی ہے۔ نمائش سے دکھاوے سے اللہ بچائے۔

س: ناشتہ میں کیا خاص چیز بنائی جاتی ہے؟

ج: ہماری صبح کا آغاز ساڑھے پانچ بجے سب اٹھ جاتے ہیں۔ نماز پڑھ کر سب گھر والے چائے پیتے ہیں۔ نال گوسپ ہو جاتی ہے، ہنسی مذاق چلتا ہے۔ پھر تھوڑے ضروری کام نبٹاتے ہیں۔ ابا لوگ زمینوں کی طرف نکل جاتے ہیں، جیسے شہروں میں لوگ جاگنگ کرتے ہیں۔ پھر ما بدولت لگ جاتے ہیں ناشتا بنانے، مطلب روٹیاں تیار کر کے رات کا سالن گرم کرتی ہوں۔ وہ کم پڑ جائے تو خاگینہ یا آملیٹ بنا لیتی ہوں۔ اماں صاحبہ دہی کو لسی میں تبدیل کر کے برف ڈال کر بالٹی میں بھر کر چارپائی پر رکھ دیتی ہیں۔ ابا لوگ (مطلب بھائی ساتھ ہوتے ہیں) تب تک آجاتے ہیں۔ لسی پی کر ناشتا کرتے ہیں۔ میں ٹھنڈا پانی، اچار، لسی، سادہ چٹنی پودینہ والی لا کر آگے رکھتی جاتی ہوں، چونکہ ہمارا بیک گراؤنڈ دیہی ہے تو ہمارے طرز زندگی کی طرح کھانا ناشتا بھی ہیوی مگر خالص ہوتا ہے۔ حلوہ پوری، چنے چھولوں سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ زیادہ شوق ہوا بھی چھولوں کا تو گھر میں تیار کر لیتے ہیں۔

یہ تھی ہماری روزانہ کے ناشتے کی خاص، عام روٹین۔

س: کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کا کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج: آپ نے کہا عورت کی سلیقہ مندی۔ ہم تو لڑکیاں ہیں ناں ابھی، مگر ہم کہاں بچ سکتے ہیں۔ صنف تو ہماری بھی یہی ہے (ہک ہا)۔

کچن کا بکھراؤ اور گندگی سے ہم خود الرجک ہیں۔ مجھے گرد مٹی سے بھی الجھن ہوتی ہے۔ پہلے کچے چولہے ہوتے تھے تو روز جھاڑو دے کر پانی کا چھڑکاؤ کر دیتی تھی، لو ہوگئی۔ مگر جب سے سلینڈر بھر کے کمرے کو کچن کی شکل دی تب سے مت پوچھیں۔ کتنا مشکل ہے کمرے کو مطلب کچن کو صاف رکھنا۔ ڈسٹ بن روز باہر پھینکتی ہوں، میز پر دن میں تین بار گیلا کپڑا پھیرنا پڑ جاتا ہے۔ برتن

دھو کر، دھوپ میں سکھا کر کچن میں رکھتی ہوں۔ مکھیوں سے بچانے کے لیے کپڑے سے ڈھک لیتی ہوں۔ ٹوکریاں سبزی والی ہفتہ میں دو بار صاف کرتی ہوں۔

کچن کے استعمال میں جو ڈبے، جار ہوتے ہیں، گیلے کپڑے سے چمکاتی رہتی ہوں۔ مگر مکھیاں پھر بھی جیت جاتی ہیں۔ فرش پر نمک والی ٹاکی مارتی ہوں۔ کچن تو سلیقہ مندی کے آئینہ میں دمک جاتا ہے مگر ہم کافی زیادہ تھک جاتے ہیں۔ لیکن یہ تو ہر عورت کا فرض ہے۔ کام کو پرخلوص ہو کر کریں تو عبادت بن جاتا ہے، یہ بات تھکن اتار دیتی ہے۔

س: آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟

ج: مہینے میں تو نہیں، سال میں ایک دو بار۔ جب کچھ موسمی تو کچھ ایونٹ وغیرہ پر شاپنگ کرنے شہر جائیں تو بھائی کیفے، ریسٹورنٹ پر پردے والے کیبن میں لے جاتا ہے۔ بریانی، ساتھ کوک، برگر ضرور کھا کر آتے ہیں لیکن اس سال بہن جو ٹیچر ہے، اس کے اسکول میں ٹیچرز گھومنے گئیں ملتان۔ بہن زبردستی لے گئی، اجازت لے کر ملتان میں "المائدہ ہوٹل" ——— لے گئی ——— وہاں زنگر برگر اور پیزا، ساتھ میں نگٹس کھائے۔ بڑا لطف آیا۔

اوپن کلاس ہال، ساتھ تیز میوزک، ٹھنڈی یخ کوک، سب ٹیچرز جو بھی میری بھی ٹیچر رہی تھیں، ان کے ساتھ گھوم کر، کھا کر انجوائے کیا۔ تھینک یو پیاری بہن (ن) اس سب کے لیے۔

س: کھانا پکاتے وقت موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: جی ہاں۔ بارش کا موسم ہو یا بادل برس پڑیں تو اکثر دوپہر میں پکوڑے کھاتے ہیں۔ دن میں دو بار چائے پھر رات کو کھانے پر چکن بریانی لازمی بنتی ہے۔ بہت زیادہ گرمی میں روح افزا کا مشروب اور آم کا جوس، جو ہم گھر میں بناتے ہیں۔ ٹھنڈا کر کے پینا گرمی میں کمی کرتا ہے یا کولڈ ڈرنک گرمی میں اکثر منگوائی جاتی ہے۔

س: کوئی ڈش یا کچن ٹپ؟

ج: دودھ والی چائے میں ادرک کے ٹکڑے ڈال کر بنائیں۔ ذائقہ اور لطف بھی بڑھ جاتا ہے، فٹنس پر بھی اثر پڑتا ہے۔

کوئی بھی کھانا پکائیں، درود پاک کا ورد مسلسل، کھانا بننے تک جاری رکھیں۔ ثواب بھی ملے گا، کھانے میں برکت بھی بڑھ جائے گی اور کھانا پکاتے ہوئے ساتھ ساتھ کچن سمیٹتی جائیں تو بعد میں صفائی میں آسانی ہوگی۔

میرا باورچی خانہ آپ دوستوں کو کیسا لگا پڑھ کر ضرور بتایئے گا۔

عاسل

ہم آٹھ بہن بھائی ہیں میرے ابو اکلوتی اولاد ہیں۔ میرا نمبر چھٹا اور دوسری بہن کا آٹھواں ہے۔ بہنیں شادی شدہ اور دو بھائیوں کی شادی ہوگئی ہے۔ دو کنوارے ہیں۔ الحمدللہ ماں باپ حیات ہیں۔

ماشاءاللہ پوری فیملی پڑھی لکھی اور صلح جو ہے، ہر رشتے کو اس کے درجے کے مطابق مقام دینے والی۔ ننھیال میں دو خالائیں اور ایک ماموں ہیں۔ چھوٹی خالہ کی شادی غیروں میں ہوئی۔ خالہ کی سسرال سے نہ بن سکی تو ہمارے گھر کے ساتھ والے گھر میں کرایہ پر رہنے لگیں گھر برائے نام تھا۔ ٹوٹے ہوئے دو کمرے نہ پانی، نہ واش روم نہ بجلی وغیرہ۔ درمیان سے دیوار توڑ کر آنے جانے کا راستہ بنایا۔ سب کچھ ہمارا استعمال کرنے لگیں۔ لکڑیاں، تندرو اور چولہا بھی، جب ہم تندور جلاتے تو زیادہ لکڑیاں ڈال دیتے۔ وہ آٹا لے کر آجاتیں اور روٹی پکا کر چلی جاتیں اور برتن وغیرہ ہم سمیٹتے اور صفائی کرتے۔

میرے ابو کے اپنے تو بہن بھائی تھے نہیں۔ انہوں نے خالہ والوں کو ہمیشہ بہن بھائی سمجھا۔ امی ابو کی پھوپھی کی بیٹی ہیں۔ خالہ کے گھر میں پڑھائی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ خالہ کے دو بیٹے، تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی کو قرآن پاک امی نے اور لکھنا پڑھنا میں نے سکھایا اور چھوٹی بیٹی بھی امی سے پڑھی، صرف بڑے بیٹے نے میٹرک کے بعد موبائل کا کام سیکھ کر دکان لگالی اور چھوٹے بیٹے کو بھائی اپنے ساتھ ملتان مدرسے لے گئے جہاں اس نے قرآن پاک حفظ کیا۔ خالہ کی بڑی بیٹی اور بیٹے کا رشتہ بڑی خالہ جو کہ اس کی تائی بھی ہیں ان کے گھر بچپن سے طے تھا۔ مگر پھر ماموں کا بیٹا جو کہ ان کی پہلی بیوی سے تھا جسے ماموں طلاق دے چکے تھے۔ ماں کے ساتھ نانا کے گھر رہتا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد باپ کے پاس دونوں بیٹے آگئے۔ بڑا بیٹا پڑھا لکھا اور نوکری والا تھا جیسے ہی خالہ نے دیکھا، رشتے کی کوشش شروع کردی۔ شوہر کی مانی نہ کسی اور کی، بیٹی کی شادی اس سے کردی۔ بڑی خالہ کا بیٹا اس کے عشق میں نشئی بن گیا۔

پھر بیٹوں کی شادی کی باری آئی۔ شوہر نے اپنے بھائی (ہماری دوسری خالہ) کے گھر کرنی چاہی مگر خالہ نہ مانیں اور امی کی منتیں کرنے لگیں کہ مجھے دونوں بیٹیاں دو، جب امی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے انکار کردیا۔ خالہ نے رو دھو کر منتیں کیں امی نے آس کے ساتھ میری طرف دیکھا، میں ماں کی خاطر خاموش ہوگئی۔ اس طرح ایک مہینے میں ہمارا رشتہ اور شادی کی تاریخ طے ہوگئی جب بات پکی ہوگئی تو خالو نے کہا، آپ میری بیٹی لیں تو امی نے کہا ٹھیک ہے مگر ہم نکاح اب کریں گے اور شادی جب بھائی کی پڑھائی مکمل ہوجائے گی تب، میرا وہ بھائی حافظ عالم ہے اور برٹش اسکول ملتان میں پڑھاتا ہے۔

شادی پر ہمارے نام کچھ بھی نہیں کیا، صرف ایک ہزار حق مہر اور ایک ہزار منہ دکھائی۔ کپڑے، نقدی کچھ نہیں شادی میں ان کا رویہ ذلت آمیز رہا۔ بری بھی برائے نام تھی البتہ دو تولہ سونا اور دس تولہ چاندی دی۔

رخصتی کے بعد جب گھر آئے تو خالہ کے انداز دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا ہم ان کی پسند ہیں۔

بس سسر کچھ دیر آکر بیٹھے اور کہا "دودھ وغیرہ لے آؤ" تو بولیں دودھ تو ختم ہوگیا۔" پھر میری باجی امی کے گھر سے لے آئیں۔ ہمیں اور ہمارے شوہروں کو دیا۔ صبح اٹھے تو پتا چلا، دودھ گھر میں تھا، خراب ہوگیا۔ صبح ناشتہ امی کے گھر سے آیا جو کہ سب گھر والوں نے کھایا۔ اگلی صبح ساس اور نند سوگئیں۔ ہم میں سے ایک بہن نے صفائی اور دوسری نے جھاڑو لگائی۔ سسر اور دیور گھاس کاٹ کر آئے بولے۔ "کھانا آپ بنا رہی ہو آپ کی خالہ کہاں ہیں۔" اس طرح ہم نے سارے گھر کا

کام سنبھال لیا جانوروں کا بھی۔

پہلی رات ہی شوہر نے کہا تم امی کی پسند کی ہو ان کو خوش رکھو گی تو رہو گی ورنہ نہیں جہاں سے آئی ہو چلی جاؤ۔

رات کے ایک ایک بجے تک باہر رہنا اور ناراض رہنا۔ میں خاموش رہی۔ کسی کو کچھ نہ بتایا۔ پھر خالہ نے حق مہر اور منہ دکھائی واپس مانگی۔ اگر ہم سالن شوربے والا بناتے تو بولتیں، "جانتی ہوں میکے میں قورمہ کھاتی تھیں۔" اور اگر زیادہ شوربہ بناتے تو بولتیں "اتنا پانی وہاں کھاتے تھے یہاں نہیں۔" پہلے صرف ایک گائے تھی۔ ہمارے آنے کے بعد زیادہ جانور اکٹھے کر لیے کہ سارا دن یہ کیا کریں گی۔ باقی سارا دن ہم کام کرتے اگر کوئی آجاتا تو ہمیں کام سے بالکل الگ کر دیتیں۔ ہر وقت طعنے کہ کنگلوں سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ اگر بڑی کے گھر کرتی تو میرے بیٹے کاروں میں گھوم رہے ہوتے۔ جواب دیتے تو شوہر سے شکایت، ہر دو تین ہفتوں بعد ہمارے شوہروں کے سامنے ہماری عدالت لگ جاتی اور وہ باتیں سامنے آتیں جن کا ہمیں پتا بھی نہ ہوتا اور شوہر کہتے معافی مانگو۔ دونوں بیٹے خالہ کے کنٹرول میں بھی ہیں۔ بات بات پر کہتے۔ گھر میں رہنا ہے تو ماں کو خوش رکھا کرو ورنہ کاغذ لو اور جاؤ۔ ہم پہلے سے بھی زیادہ خدمت کرتیں ڈر سے۔

ہماری اتنی جرات نہیں کہ کھانا بنا لیا ہے تو لے کر خود کھالیں جب تک خالہ خود نہ دیتیں۔ جب میں پریگننٹ ہوئی تو کبھی دو روٹیاں کھالیتی تو بولتیں ڈائن ہو۔

ایک بار کسی کے گھر سے ہو کر ہم سب امی کے گھر گئے تو امی نے کہا "شام ہو رہی ہے، کھانا کھا کر جانا۔" ہم بیٹھ گئے تو خالہ برقع پہن کر فوراً باہر آگئیں اور گھر آکر ناراض ہوئیں کہ یہ ان کا کہنا مان کر بیٹھ گئیں۔ گھر کی کوئی پرواہ نہیں ہے نا اس لیے۔ کچھ عرصے بعد دوبارہ ایسے ہوا ہم فوراً بولے "نہیں ہم گھر جاتے ہیں۔" تو گھر آکر پھر ناراض ہوئیں کہ یہ میکے کی بچت کرواتی ہیں۔

جب بھی کسی کا جہیز دیکھتیں تو ہمیں طعنے شروع کہ جہیز کم تھا۔ پریگننٹ تھی تو ہر وقت بولتیں پہلا بچہ میکے کی ذمہ داری ہوتا ہے۔ آخر کار ساتویں مہینے امی لے گئیں۔ کمزوری کی وجہ سے آپریشن ہوا، سارا خرچا امی ابو نے کیا مگر سب کو کہتے کہ ہم نے کیا ہے۔

میرے شوہر گھر میں نہیں تھے اور میں تین دن سے منتیں کر رہی تھی۔ میری بیٹی کے لیے دودھ لے دیں۔ کسی نے نہ لا کر دیا۔ میں خود چلی گئی باہر، لڑکی کو بولا یہ برتن پڑوسن کے گھر لے جاؤ اور دودھ لے آؤ جیسے ہی میں گئی خالہ نے فوراً امی کو فون کر دیا۔ "تمہاری بیٹیاں ہم سے نہیں سنبھالی جاتیں۔ آکر لے جاؤ امی خاموش ہو گئیں کہ بات بڑھ نہ جائے۔ جب ہمارے شوہر آئے تو دودھ کی بات چھوڑ کر جھوٹی سچی باتیں لگائیں شوہر نے کہا امی کے پاؤں میں ناک رگڑو ورنہ کاغذ لو اور جاؤ۔ جب میں نے ناک رگڑ کر منہ اوپر کیا تو خالہ کے چہرے کی چمک اور فتح مندی آج تک مجھے نہیں بھولی۔ میں جب بھی یاد کروں تو اپنی بے بسی پر رونا آتا ہے۔

جب تک جہیز کے کپڑے ختم نہ ہوئے ہمیں عید پر بھی اور نہ لے کر دیے ہماری پہلی عید بھی روتے ہوئے گزری۔

تین سال بعد ابو نند سے بھائی کی شادی کے لیے آئے سسر بولے پہلے الگ گھر بنواؤ۔ ابو بولے یہ ملتان شوہر کے ساتھ رہے گی۔ قسطوں پر زمین لی ہوئی ہے۔ گھر ہم وہیں بنوالیں گے۔ بولے "نہیں پہلے بنواؤ۔" ابو نے مکان شروع کروایا۔ سب چلے گئے دوبارہ آئے تو مکان تیار تھا۔ جب شادی کا کہنے آئے تو سسر بولے "پہلے درمیان میں دیوار بناؤ۔" سولہ مرلے کا پلاٹ تھا اور دوسری سائیڈ سے خالی پڑا تھا جبکہ چار دیواری تھی بڑی ابو نے دیوار بنوائی پھر ابو امی آئے تو بولے۔ "جمعہ کو آجاؤ جب سب کو لے کر جمعہ کو آئے تو ساس کپڑا لے کر سو گئیں اور باہر آکر کسی سے نہ ملیں۔ سسر بولے پہلے باہر صحن میں فرش لگواؤ۔ فرش لگ گیا تو خالہ ابو کے رشتہ داروں کے گھر بول کر آئیں کہ پہلے دو تولہ سونا اور دس تولہ چاندی دیں۔" ابو نے لے دی شرط پر شرط منواتے آئے۔

گھر میں ہمیں کہتیں "میں بیٹی نہیں دیتی۔ جا کر بول دو" اور باہر سب کو کہتیں میں نے ان کی دولی ہیں اور یہ میری

ایک بیٹی بھی نہیں لیتے۔" ڈیٹ فکس ہوئی امی اور بہنوئی شادی سے پہلے آئے تو خالہ لڑنے لگیں اور بولیں۔ میں بیٹی نہیں دیتی اور ہماری برائیاں کرنے لگیں امی خاموشی سے واپس چلی گئیں پھر سنا تھا کہ میری نند کہیں اور کرنا چاہتی تھی لیکن میرے سسر نے پگڑی۔ پاؤں پر رکھی بیٹی کے کہ میری عزت کا سوال ہے خیر جیسے تیسے شادی ہوگئی شادی کی رات منہ دکھائی میں بھائی نے گولڈ کی انگوٹھی اور دو ہزار روپے تو بولی "تھوڑے ہیں اور دیں۔" پھر انہوں نے اور دیے۔ شادی کی رات بولی "میری طبیعت خراب ہے۔" سات دن بعد بولی "ہمارا نکاح نہیں ہوا۔"

ان سات دنوں میں میرے شوہر مجھے امی کے گھر چھوڑ آئے اور بولے۔ "تم وہیں رہو اگر تمہارا بھائی میری بہن کو خوش رکھے گا تو تم گھر آنا ورنہ نہیں۔" ابو نے خالو کو کہا اگر ہماری بیٹی (بہو) مطمئن نہیں ہے تو ہم دوبارہ نکاح کر لیتے ہیں مگر خالہ نے کہا "میں رشتے ختم کرتی ہوں۔" پھر بھائی نے بیوی کو کہا اب واپس میرے ساتھ چلو تو نہ مانی پھر کہا پہلے وعدہ کرو مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ گے تو پھر چلوں گی۔ بھائی نے کہا چلو گھومنے چلیں تو نہ گئی۔ ادھر بھائیوں کو فون پر کہا، میں جب جانے لگی تو پھر خود چلے گئے ہر وقت فون کر کے کہتی۔

"میں بھوکی بیٹھی ہوں" کبھی کہتی، مجھے دال کھلاتے ہیں، ہمارے شوہر ہم سے ناراض۔ کپڑے لینے کے لیے لے گئے تو بولی میں آپی کے ساتھ جا کر لے آؤں گی جوتا لینے گئے تو موٹر سائیکل سے نہ اتری۔

ملتان سے واپس آ کر ایک دو دن اپنے گھر رہتی پھر ہمارے پاس آ جاتی۔ بھائی جب آئے تو خود آ کر لے گئے۔ پھر امی لینے آئیں تو خالہ ناراض ہونے لگیں "یہ بیمار ہے دو ماہ سے ٹی بی ہے آپ نے علاج نہیں کیا میں دوائی لوں گی۔ امی نے کہا "دو ماہ تو ابھی شادی کو بھی نہیں ہوئے لیکن ہم دوائی لے لیں گے۔" بہن سے رہا نہ گیا تو بول پڑی تو ہمیں گھر سے نکال دیا۔

ابو کے ساتھ جب ہم جانے لگے تو دیور نے کہا بچوں کا کیا کرنا ہے ابو بولے بھیجنا ہے تو بھیج دو ہم چلے گئے۔ پھر میری ساس کی طبیعت خراب ہوئی تو میرے شوہر ہمیں لینے آ گئے۔ دیور سعودی عرب چلے گئے تھے واپس آ گئے۔ ہم خود بھی بچوں کے لیے بہت اداس تھے نہ دن کو چین آتا نہ رات کو نیند۔

کچھ دن رہنے کے بعد میرے شوہر نے کہا "امی اور بھائی ناراض ہیں کیوں لے آئے ہو بہن کو بولو واپس جائے۔" مگر میری بہن نہیں گئی۔ دو تین دن بعد دیور نے فون کیا اور بولا جیسے آئی ہو ویسے چلی جاؤ اور بچوں کو بھی چھوڑ جاؤ، بہن بولی میں نہیں جاتی۔

صبح کے وقت میرے شوہر نے پہلے مجھے مارا پھر بہن کو مارنے لگے بچے رونے لگے تو انہیں باہر بھیج دیا۔ میری بہن پھر بھی نہ گئی تو اگلے دن میرے شوہر نے کہا ابھی بھائی امی کی باتوں میں آیا ہوا ہے۔ جاؤ جب بھائی ٹھیک ہوگا تو میں تمہیں لے آؤں گا ورنہ وہ بولتا ہے میں طلاق دیتا ہوں۔

میرے شوہر نے بچوں کو لیا اور بہن کو چھوڑ آئے تین سال تک بہن امی کے گھر رہی دو بچے اسکول پڑھنے والے تھے۔ اکیڈمی میں پڑھتے تھے کبھی کسی نے نہ پوچھا اور نہ پیسے دیے اور نہ کوئی لینے گیا نند بھی ماں کے گھر تھی۔

ان تین سالوں میں میرے ساتھ بھی جیسے رہیں میں خاموش رہی۔ ان تین سالوں میں ابو وقفے وقفے کے بعد تقریباً دس بار بھابھی (نند) لینے آئے کبھی کسی کو تو کبھی کسی کو ساتھ لائے مگر خالہ کی ہر بار نئی شرط ہوتی۔

ہر بار نیا الزام بھائی پر۔ پھر دیور واپس آ گیا۔

کچھ مہینے بعد میں بیمار ہوئی تو میرے شوہر بولے ماں کے گھر جاؤ میں نے کہا میں نہیں جاتی تو۔ خود چھوڑ آئے۔ پھر لینے نہ آئے۔

میرے شوہر بھی تنگ آ کر سعودیہ چلے گئے، شروع سے ہمارے بچوں کی کوئی ذمہ داری نہ لی۔ اب بھی کچھ ہو تو میں ابو کے ساتھ جاتی ہوں۔

ہمارے آنے کے دو مہینے کے بعد دیور چلے گئے وہاں بھی دو مہینے تک ٹھیک رہے مگر اب ہفتہ ٹھیک سے بات کر لیں تو خالہ کو ٹینشن، اگلے پندرہ دن پھر ناراض رہیں گے۔ فون کرتے رہو تو آن نہ کریں گے یا نیٹ بند کر دیں گے۔

بہن کوشش کرتی ہے جب شوہر کا فون آئے تو ساس کو پتا نہ چلے ورنہ موڈ خراب ہو جاتا ہے ساس کا الگ، شوہر کا الگ، کمرے میں بیٹھ کر بات کر رہی تھی تو خالہ بولیں پتا نہیں کس سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ تو وہ بولے، امی کے سامنے بیٹھ کر بات کیا کرو جب بہن نے کہا آپ مجھے بچپن سے جانتے ہیں میں آپ کو ایسی لگتی ہوں تو بولے ''کوئی'' بات ہو گی تو امی نے کہا ہے۔''

اب اللہ کا شکر ہے پہلے سے میرے شوہر کافی بہتر ہو گئے ہیں۔ میرے ساتھ اس حد تک ٹھیک ہیں کہ گزارا ہو سکتا ہے لیکن اتنا یقین اب بھی نہیں ہے اگر اللہ نہ کرے خالہ نکل جانے کا کہیں گی تو میرا ساتھ دیں گے۔

اب تقریباً مہینے سے فون بہت کم کرتے ہیں اگر کریں بھی تو کوئی بات نہیں سنتے اور فون تھوڑی سی دیر کے بعد بند کر دیتے ہیں۔

ہمارے آنے کے مہینے بعد دوبارہ کزن اکٹھے ہوئے اور امی بھی آئیں۔ بھائی بھی نند کو لینے آئے تو ساری رات باتیں ہوتی رہیں کہا ملتان لے جاؤ جب وہ مان گئے تو بولے ''ابھی ہمارے گھر رہے گی جب ملتان سے آنا، لے جانا اور جب جاؤ واپس چھوڑتے جانا۔'' یہ مان گئے تو بولے ''نہیں تم نے زہر دیا ہے۔'' بہر حال ساری رات باتیں ہوتی رہیں۔ بھائی اور نند کو علیحدہ کمرے میں بھیجا کافی دیر بعد بھائی نے دیور کو بلایا کہا یہ کہتی ہے میں طلاق چاہتی ہوں تو دیور بولے پھر ٹھیک ہے مگر پھر میرے شوہر نے کہا پھر ابو بولیں گے سب کی طلاق ہو۔ چھوٹے بچے ہیں کیا کریں گے۔ ایسے ہی ساری رات گزرنے کے بعد صبح سسر نے کہا۔

''یہ نامرد ہے اس لیے میری بیٹی اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ طلاق دے دو۔'' تو بھائی نے کہا پھر یونین کونسل چل کے لے لیتے ہیں کہ دونوں کی رضامندی شامل ہے۔'' تو بولے ''بس پیپر بھجوا دینا پھر جہیز۔'' پر لڑنے لگیں۔ ابھی ایک طلاق دی تو سب ناراض ہو گئے شوہروں کا فون آنا بند۔ بعد میں بہن نے کہا کہ آپ نے خود کہا طلاق دو تو کہنے لگے وہ آپ نے حالات ہی ایسے کیے کہ بہن دوبارہ نہیں جاتی۔

ج: عزیز بہن: آپ کا 25 صفحات پر مشتمل خط پڑھا آپ کی بہت سی باتیں ناقابل فہم اور نہ سمجھ میں آنے والی ہیں۔ آپ کی خالہ کے معاشی حالات ٹھیک نہ تھے۔ اولاد کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہ دی۔ اس کے باوجود آپ کے والدین نے اپنی ایک نہیں دونوں بیٹیاں دے دیں۔ ان کے تمام مطالبات بہ سر و چشم مان لیے۔ اس میں بہت زیادہ کمزوری آپ دونوں بہنوں کی بھی تھی۔

پہلی رات ہی آپ کے شوہر نے واضح کر دیا کہ آپ ان کی نہیں ان کی والدہ کی پسند ہیں۔ ان کا رویہ بھی نفرت آمیز تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اور آپ کے گھر والوں نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ ساس پیٹ بھر کھانا نہ دیتیں۔ تب بھی وہ کچھ نہ بولے۔ پھر آپ کی نند کے رویہ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ آپ کے بھائی سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور اب بھی وہ آپ کے بھائی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ آپ اس گھر میں رہتی تھیں اور آپ کو اس بات کا شبہ تک نہ ہوا کہ آپ کی نند آپ کے بھائی سے شادی نہیں چاہتی تھی۔ اب اس سادگی کو کیا کہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ آپ کے اور آپ کی بہن کے بچے ہو چکے ہیں۔ آپ کی شادی کو بھی اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ اب علیحدگی کے بارے میں سوچنا آپ کے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کر دے گا۔ بچوں کے ساتھ بھی یہ ظلم ہو گا۔ اب ان حالات میں بہتر یہی ہے کہ جس طرح بھی ہو آپ وقت گزاریں۔ کچھ وقت گزرے گا پھر آپ کے بچے خود اپنی دادی اور باپ سے نمٹ لیں گے۔

☆

سکینہ...... لانڈھی، کراچی

س: میرے چہرے اور جسم پر بہت بال ہیں کوئی ایسا گھریلو نسخہ بتائیں جس سے بال ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔ میں پارلر نہیں جا سکتی۔

ج: بالوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا بہت مشکل ہے۔ لیزر ٹریٹمنٹ سے بھی ہمیشہ کے لیے بال ختم نہیں ہوتے۔ چھ ماہ یا ایک سال بعد عموماً بال دوبارہ آجاتے ہیں۔ آپ مندرجہ ذیل گھریلو نسخوں پر عمل کریں۔ اس سے کافی حد تک بال کم ہو جائیں گے اور متواتر عمل سے دوبارہ بال نکلنا بند ہو جائیں گے۔

اپنا چہرہ روزانہ کسی اچھے ابٹن یا موٹے پسے ہوئے بیسن سے دھوئیں، ابٹن لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ ابٹن میں تھوڑا سا پانی یا عرق گلاب ملا کر پیسٹ بنا لیں پھر اس پیسٹ کو چہرے پر لگائیں۔ جب سوکھ جائے تو رگڑ رگڑ کر اتار دیں۔۔ چہرے پر پھٹکری کی ڈلی کو گیلا کر کے اکثر ملتی رہا کریں۔

فرزانہ ریاض...... ملتان

س: میرا رنگ پہلے بہت گورا تو نہیں تھا لیکن جلد شفاف اور چمک دار تھی۔ اب کچھ عرصے سے رنگ بھی مدھم پڑ گیا ہے اور ہلکی ہلکی چھائیاں پڑ گئی ہیں اور جلد بھی بدرنگ ہو گئی ہے۔

ج: سب سے پہلے آپ اپنی صحت پر توجہ دیں۔ دودھ، پھل باقاعدگی سے استعمال کریں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ جلد کی خرابی کی سب سے بڑی وجہ عموماً قبض کی بیماری ہوتی ہے آج کل گاجر کا موسم ہے۔ روزانہ ایک سے دو کچی گاجریں کھائیں، کینوں کا جوس پئیں۔ بہت جلد نمایاں فرق محسوس کریں گی لیموں اور زیتون کا روغن آپ کے لیے مفید ہے۔

ایک لیموں کے عرق میں زیتون کا روغن ایک چمچہ ملائیں اور چہرے کو بھاپ دے کر ایک روئی کی گدی بنا کر گرم پانی میں نچوڑ لیں اور اس لیپ کو چہرے پر لگائیں۔ چہرے اور گردن کو آہستہ آہستہ تھپکی دیں۔

موسم سرما کے لیے موزوں ماسک

کھیروں کا ماسک:۔

سرد موسم میں جلد میلی اور داغ دار نظر آتی ہے اور چہرے پر یہ اثر نمایاں ہوتا ہے لہٰذا چہرے کو صاف ستھرا اور دھبوں سے پاک رکھنے کے لیے کھیرے کا ماسک لگائیں۔

تھوڑا سا کھیرا لے کر اسے پیس لیں۔ اب اس میں دہی ملائیں جتنا کھیرا ہے اتنا ہی دہی ہونا چاہیے۔ اس آمیزے کو چہرے پر پندرہ سے بیس منٹ لگائیں پھر ٹشو پیپر سے صاف کر کے نیم گرم پانی سے دھو لیں۔

فلو سے بچاؤ کے لیے

جسم کی مدافعت بڑھانے کے لیے لہسن اور پیاز کا استعمال مفید ہے۔ نیم گرم پانی میں لیموں کا رس اور شہد ملا کر پئیں۔ فلو سے بچنے کے لیے چائے پکاتے وقت اس میں ذرا سی ادرک اور دار چینی کا ٹکڑا ڈال دیں۔ صبح شام یہ چائے پئیں۔

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- فرینہ اعجاز
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ---------- موسیٰ رضا